دنیا بھر سے منتخب معیاری ادب

عمران ڈائجسٹ

فروری 2020

Pakistanipoint
Learning Point

خونی کھنڈر

6

ایم الیاس

مافوق الفطرت کردار اگرچہ انسانی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس کہانی، جس کردار میں جان ہوتی ہے وہ لوگوں کو یاد رہ جاتا ہے۔ جیسے کہ ہمیں اپنی زندگی کے کچھ خاص واقعات کی جزئیات بھی یاد ہوتی ہیں۔ اسی طرح مافوق الفطرت کردار بھی ذہن کے آنکڑے میں اٹک جاتے ہیں۔ یہ کہانیاں شر کی قوت کو مغلوب اور حق کو غالب ظاہر کرتی ہیں۔

حبس کا عالم

48

صفیہ سلطان

ہمارے معاشرے میں عورت کو اتنا بے وقعت کیوں تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھا کیوں نہیں جاتا۔ کیوں عورت محض ایک کھلونا ہے، جب اور جس وقت چاہیں کھیلیں اور چھوڑ دیں۔ ایک ستم زدہ کا قصہ، اس نے پہلی محبت اسکول کے زمانے میں کی تھی مگر اس کے ساتھ دھوکا ہوا۔ دوسرا زخم اپنے شوہر سے ملا اور پھر اسے ایک ہمدرد مل گیا۔ مگر اس کی ہمدردی میں بھی مفاد پوشیدہ تھا۔

روشنی کی چوری

59

قانون والا

اب تک آپ مرد جاسوسوں کے کارناموں سے بھرپور جرم و سزا کی کہانیاں پڑھتے رہے ہیں لیکن اس خوب صورت اور چونکا دینے والی طویل کہانی میں آپ کی ملاقات ایک حسین ترین لیکن انتہائی شاطر جاسوسہ سے ہورہی ہے جس نے مردوں کے چھکے چھڑادیے تھے۔ شہر میں جعلی نوٹوں کو پھیلانے والوں کا اصل کھیل بہت ہی تباہ کن تھا۔

ولایتی

103

خشونت سنگھ

دیسی خاندان کا پس منظر رکھنے والا جب ولایتی لباس اوڑھتا ہے تو وہ بہت کچھ فراموش کر بیٹھتا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کا خاندان اس کی روایات اور سب سے بڑھ کر اس کی زمین کی روایت و تقاضے کیا ہیں۔ ایک ایسے ہی شخص کی روداد جو خاندانی اقدار فراموش کرچکا تھا۔ اس کی ماں نے اس کے سر پر سہرا سجایا مگر وہ خالص ولایتی تھا۔ کھرا ولایتی، مزاجاً بھی اور روایتاً بھی......!!

Pakistanipoint
www.pakistanipoint.com

مرجان

116 مس صبا بہار

ایک معصوم بچی جسے اس ظالمانہ رسم کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اس کی ماں اپنی معصوم بچی کو اس ظلم سے بچانے کی کوشش کرتی ہے لیکن اسے بے دردی سے قتل کردیا جاتا ہے۔ پھر مردوں کے اس بے رحم معاشرے میں ایک کمزور، اکیلی اور تنہا عورت کی جنگ شروع ہوتی ہے جو وہ جیتتی ہے یا ہارتی ہے اس کا فیصلہ آپ کہانی پڑھ کر خود ہی کریں گے۔

بھاگتے بھوت

160 احمد صغیر صدیقی

آپ نے بھوتوں سے متعلق بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی مگر زیر نظر تحریر ان سب سے مختلف نوعیت کی ہے۔ ایک شخص نے اپنے آرام کے لیے ٹرالر خریدا مگر اس پر ایک عورت نے قبضہ جمالیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی اس ٹرالر میں بلالیا۔ وہ پانچوں بھوت کسی بھی صورت اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھے، آخر کار اسے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی اور اس نے اس پر عمل کر ڈالا۔

مستزاد

172 نسیم ملک

کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک دن اگلے روز دوبارہ وارد ہوجائے؟ آپ یقینا اسے کم عقلی سمجھیں گے مگر زیر نظر تحریر میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اتوار کے اگلے دن اتوار کا اعلان سب کے لیے باعث تعجب اور خوشگوار تھا جو لوگ اس بات پر یقین نہیں کررہے تھے بالآخر انہیں بھی یقین آگیا مگر اس سے اگلے کئی روز تک اتوار کا دن ٹھہرا رہا۔

شہری آفت

184 قانون والا

ایک چالاک مجرم جو بھیس بدلنے میں ماہر تھا۔ جو جرائم اور اخلاقی گراوٹوں میں غرق تھا۔ مجرم بڑا زندہ دل اور زوردار تھا۔ اس کا ایک کروڑ روپے کے سونے کا مطالبہ کوئی معمولی مطالبہ نہیں تھا۔ یہ کہانی ہر لحاظ سے ایک منفرد کہانی ہے جس میں پیش آنے والے واقعات کے ساتھ ساتھ تیز رفتار ایکشن اور بے پناہ سسپنس نے اسے مزید منفرد بنادیا ہے۔

آذر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام اشاعت: 37-اردو بازار، کراچی

Pakistanipoint.com

خونی کھنڈر

ایم الیاس

مافوق الفطرت کردار اگرچہ انسانی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس کہانی، جس کردار میں جان ہوتی ہے وہ لوگوں کو یاد رہ جاتا ہے۔ جیسے کہ ہمیں اپنی زندگی کے کچھ خاص واقعات کی جزئیات بھی یاد ہوتی ہیں۔ اسی طرح مافوق الفطرت کردار بھی ذہن کے آنکڑے میں اٹک جاتے ہیں۔ یہ کہانیاں شر کی قوت کو مغلوب اور حق کو غالب ظاہر کرتی ہیں۔ سنسنی خیز واقعات سے بھرپور **ایم الیاس** کی ایک منفرد کہانی یقینا قارئین کو پسند آئے گی۔

جنگل میں بھٹکنے والے ایک شکاری کی آپ بیتی

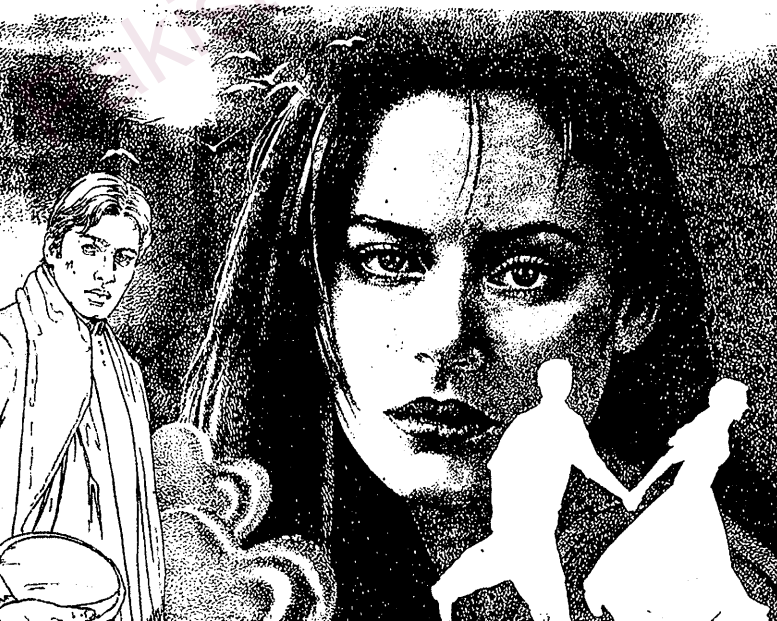

ایک شکاری کے لیے اس سے زیادہ بدقسمتی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دن بھر جنگل کی خاک چھانتا اور خوار ہوتا اور جوتے گھستا رہے اور مارا مارا پھرے جیسے ایک بھوکا پیاسا کسی چشمے کی تلاش میں بھٹکتا رہے اس نہ تو شکار کے نام پر گیدڑ کا بچہ تک نہ مارا جائے اور پینے کے لیے چلو بھر پانی تک نہ ملے۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا کہ مجھے کم و بیش آٹھ گھنٹے جنگل میں بھٹکتے گزر گئے تھے لیکن شاید میری شکاری زندگی کا یہ پہلا دن تھا جب مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا نصیب ہو رہا تھا اور وہ مجھے کسی کسی چڑیل کی طرح مسکرا کر میرا مذاق اڑا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ غالباً جنگل کے تمام جانوروں نے میرے خلاف سازش کر رکھی تھی اور وہ اپنے ایسے محفوظ ٹھکانوں میں چھپے بیٹھے تھے کہ میں ان کی گود تک پانے سے قاصر تھا۔

میں نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے پانچ بج رہے تھے اور سورج کے غروب ہونے میں بہت کم وقت باقی رہ گیا تھا۔ چنانچہ مایوس اور دل برداشتہ ہو کر واپسی کا ارادہ کیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ میں کم ہمت اور حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ میں ناکام اور خالی ہاتھ واپس گیا ہوں۔ وقت ہوتا تو جنگل میں مارا مارا پھرتا اور شکاری ملنے تک بھٹکتا رہتا۔ میں اپنی جیپ کی طرف چل پڑا جسے میں نے سڑک کے بائیں جانب گھنے درخت کے لیے نیچے کھڑا کیا ہوا تھا۔

ابھی میں جیپ سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک ٹھٹک کے رک گیا جیسے کسی نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی ہوں۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ گاڑی الٹی پڑی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا اور کسی طرح یقین نہیں آیا لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ میں فوراً ہی تیزی سے دوڑتا ہوا جیپ کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور میری چھٹی حس مجھے آگاہ کر رہی تھی کہ کچھ رونما ہونے والا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔ انہوں نے اپنی دانست میں جیپ کو الٹ کر میرے فرار کی راہیں سرد کر دی ہیں اور یہ کہ وہ کہیں قریب ہی چھپے بیٹھے ہیں۔

میں نے اپنی رائفل سیدھی کرنے میں لحظہ بھر کی دیر نہیں کی اور چوکنی نظروں سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں واقعی ڈاکوؤں کے نرغے میں پھنس گیا ہوں خواہ کچھ ہو جائے مقابلہ جم کر کرنا ہوگا۔ یہ ڈاکو بھی بڑے بے رحم اور سفاک اور درندہ صفت ہوتے ہیں۔

لیکن ایک منٹ..... دو منٹ پھر پانچ منٹ! اور پھر اس سے بھی زیادہ وقت گزر گیا مگر کوئی معمولی یا غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں نے یہ غور ادھر ادھر گھوم کر دیکھا لیکن کسی انسان کی موجودگی کے آثار دکھائی نہ دیے۔ دراصل اسی جگہ کی زمین اتنی پتلی تھی کہ اگر ایک چیونٹی بھی رینگنی شروع کر دے تو ایک لکیر بناتی چلی جائے۔ چناں چہ یہ بات وثوق کو پہنچ گئی کہ کوئی آدمی جیپ کے قریب ہرگز نہیں آیا۔ ان حالات میں بھی قیاس ہرگز نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی درندے نے جیپ کے ساتھ زور آزمائی کی ہو کیوں کہ زمین کی ساخت کی نسبت سے پیروں کے نشانات تو ضرور ہونے چاہیے تھے۔

اب غور طلب مسئلہ یہ تھا کہ جیپ خود بخود کس طرح الٹ گئی ہو۔ ہوا تقریباً بند تھی جب کہ ایک بھاری بھرکم جیپ کو الٹنے کے لیے شدید آندھی کی ضرورت ہے۔ میں پھر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت اچانک ایک جھاڑی کے نزدیک پہنچ کر میری نگاہیں تعجب کے ساتھ منجمد ہو گئیں۔

وہ بلاشبہ ایک خرگوش ہی تھا اور کان اٹھائے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں جنگل کا گھومنے والا ہوں۔ میں نے مختلف اقسام کے خرگوش دیکھے ہیں۔ جنگلی، پالتو اور چڑیا گھروں میں مقید! لیکن یہ خرگوش اپنی رنگت کے اعتبار سے بڑا عجیب نہیں بلکہ بڑا نرالا بھی تھا اس کا رنگ بالکل اس دھنک کی طرح تھا جو بارش کے بعد آسمان پر بکھری نظر آتی ہے۔ اپنے دل کش رنگ کی وجہ سے وہ اتنا خوب

صورت لگ رہا تھا کہ میری نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ اس کے جسم پر قوس قزح کی دھاریاں نہایت دل فریب دکھائی دے رہی تھیں۔

سب سے پہلے میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ وہ کوئی پالتو خرگوش ہے جو کسی طرح یہاں پہنچ گیا ہے ورنہ جنگلی خرگوش تو، انسانوں کے سائے سے بھی دور بھاگتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اتنے اطمینان سے بیٹھا رہے اور اسے یقین ہو کہ اس پر گولی نہیں چلائی جائے گی۔

قوس قزح کے رنگوں سے مزین وہ خرگوش اس قدر خوب صورت اور نظر نواز تھا کہ میرے دل میں اسے زندہ پکڑنے کی خواہش پیدا ہوئی تو چنانچہ میں نے اپنے شکاری تھیلے میں سے ایک ہلکے قسم کا جال نکالا جو اس مقصد کے لیے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

خرگوش شاید میرا اشارہ بھانپ گیا تھا۔ کیوں کہ جوں ہی میں جال پھینکنے کے لیے اس کے عقب کی جانب بڑھا۔ لیکن جب اور ذرا قریب پہنچا تو اس نے پھر وہی حرکت کی اور چھلانگیں لگاتا ہوا تقریباً پندرہ قدم کے فاصلے پر جا کر بیٹھا۔

اور جب تیسری بار بھی اس خرگوش نے وہی حربہ استعمال کیا تو مجھے اس بات کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ کسی خاص جگہ لے جانا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ یقیناً ایک پالتو جانور ہے اور اس کا مالک کسی مشکل میں گرفتار ہے۔ میں نے سوچا اگر میں ان لوگوں کی کوئی مدد کروں تو یہ ایک خوش گوار اقدام ہوگا۔

چنانچہ میں نے اسے زندہ پکڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ خرگوش دو چار چھلانگیں مار کے مجھ سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھتا۔ اور جب میں اس کے نزدیک پہنچتا تو پھر وہ آگے کی جانب بڑھ جاتا۔

میں اس عجیب و غریب خرگوش کی مصیبت میں تقریباً ڈیڑھ میل جنگل کے اندر نکل چکا تھا۔ اس وقت جس راستے سے گزر رہا تھا وہ بے حد دشوار گزار بھی تھا اور گھنے درختوں سے پٹا پڑا تھا۔ بعض جگہ تو شاخیں اس طرح زمین پر جھک آئی تھیں کہ ان پر رات کا گمان ہوتا تھا۔ دفعتاً خرگوش نے اپنے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکالی اور پھر اس نے کسی انسان کی طرح مڑ کے میری طرف دیکھا اور سامنے کی سمت دوڑا چلا گیا جہاں درخت بہت گھنے تھے۔ تاریکی میں زیادہ دور تک دکھائی نہ دیتے تھے۔

میں چند ثانیے تک رک کر اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں سوچنے لگا۔ آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ جب یہاں تک پہنچ ہی گیا ہوں تو ذرا اور آگے بڑھ جانے میں کیا حرج ہے۔ ممکن ہے اس پراسرار خرگوش کے راز سے پردہ اٹھ سکے۔ چناں چہ میں تیزی سے آگے بڑھا اور ابھی بیس پچیس قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک مجھے ٹھٹک کے رک جانا پڑا۔ اس وقت میری نظروں کے سامنے گھنے درختوں کی آغوش میں ایک قدیم کھنڈر موجود تھا۔ ہلکی تاریکی میں وہ بڑا پراسرار دکھائی دے رہا تھا اور شکستہ اور ادھڑی ہوئی دیواروں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ ہفت رنگی خرگوش اس کھنڈر میں روپوش ہوا ہے۔

میں کچھ دیر تک متحیر نگاہوں سے کھنڈر کی طرف دیکھتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کھنڈر کے اندر داخل ہوا جائے؟ یا واپس لوٹ جاؤں؟ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کھنڈر کے اندر داخل ہو کر کسی طرح صورت حال کا پتا چلانا چاہیے۔ یوں میں ایک متجسس آدمی ہوں اور جب تک حقیقت کا پتا نہ چلا لوں چین سے نہیں بیٹھتا۔ اس طرح غور کیے بغیر کہ سورج غروب ہونے والا ہے اور کچھ دیر بعد خوف ناک تاریکی پورے جنگل کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ میں کھنڈر کے اندر گھس گیا۔

کھنڈر پر ہیبت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا اور ہر شے خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لیکن میں جنگل کے سکوت کا عادی رہا ہوں۔ اس لیے کسی قسم کا خوف و خطرہ دل میں لائے بغیر درختوں کی شاخوں اور لمبی گھاس کو عبور کرتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ عمارت

کے دوسرے حصوں کے مقابلے میں صدر دروازہ کسی حد تک محفوظ تھا۔ یہ شاہ بلوط کی لکڑی کا ایک منقش اور عظیم الشان دروازہ تھا اور اس کے دونوں پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ میں چند لمحے رک کر حالات کا جائزہ لیا اور پھر رائفل کی بیرل سے دروازے کو آہستہ سے اندر کی جانب دھکیلا۔

پرہول سناٹے میں دروازے کا پٹ خوف ناک چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں برس کے بعد آج اس دروازے کو پہلی بار کھولا گیا ہو۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندر دیکھنے کی کوشش کی لیکن گھپ تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

جب مجھے کچھ نظر نہ آیا تو تب میں نے ایک خیال آتے ہی شکاری تھیلے میں سے ٹارچ نکالی اور دوسرے لمحے میں برقی لہریں اندر کا جائزہ لینے لگیں۔ اب میری نظروں کے سامنے ایک شکستہ اور گرد و غبار میں اٹی ہوئی دیوار تھی۔ ظاہر ہے کہ میں باہر کھڑا رہ کر پورے کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ چناں چہ میں نے کچھ دیر توقف لیا اور پھر بے آواز آہستگی سے اندر گھس گیا۔

ابھی میں نے دروازے سے گزر کر اندر قدم رکھا ہی تھا کہ کسی گوشے سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی اور دوسرے ہی لمحے کوئی بھاری بھرکم شے پوری قوت کے ساتھ میرے چہرے سے آن ٹکرائی۔

میں یہ بات کہنے میں کوئی ڈر، خوف اور شرمندگی محسوس نہیں کروں گا ایک نڈر شکاری ہونے کے باوجود اس اچانک افتاد پر میں بری طرح حد درجہ خائف اور سراسیمہ ہو کر بغیر سوچے سمجھے ایک فائر جھونک دیا۔ حالاں کہ مجھے اپنے اوسان قابو میں رکھنے تھے۔ دفعتاً میرے نزدیک ہی چھڑ چھڑاہٹ کی عجیب سی آواز آئی اور میں نے فوراً ہی ٹارچ روشن کر لی جو اس اچانک حملے کے دوران گھبراہٹ میں بجھ گئی تھی اور پھر ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ جاننے کی حد تک وہ ایک بہت بڑی چمگادڑ تھی اور اس کے سروں کی لمبائی ڈیڑھ، دو دو فٹ ضرور رہی ہوگی۔ وہ دوبارہ حملہ آور ہونا ہی چاہتی تھی کہ میری دوسری گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔

ابھی وہ خون آشام چمگادڑ فرش پر تڑپ رہی تھی کہ یکا یک کھلے دروازے سے چمگادڑوں کا ایک خوف ناک غول خوف ناک بلاؤں کی طرح اندر داخل ہو رہا اور ہولناک آوازوں میں چیختی ہوئی مجھ پر جھپٹ پڑیں۔ رائفل لوڈ تھی چناں چہ میں نے فوراً ہی گولی چلا دی لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوسوائے اس کے ایک اور چمگادڑ زمین پر گر کر تڑپنے لگی لیکن دوسریوں میں کچھ اور جوش جذبہ پیدا ہو گیا۔ دروازے سے چمگادڑوں کے اندر بے تحاشا گھسنے کا سلسلہ جاری تھا۔ پرے کے پرے گھستے ہی چلے آ رہے تھے۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے سوا دنیا میں کسی اور چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ سب بھیانک آوازوں میں چیخ چیخ کر مجھ پر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھیں۔ انہوں نے میرا چہرہ اور جسم کے دوسرے حصوں کو لہولہان کر دیا تھا۔ لباس ان کے نوکیلے پنجوں سے تار تار ہو چکا تھا۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ اور میں دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔

میں نے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے ذرا آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پورا کمرا چمگادڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ ایسا لگتا ان کی ایک بہت بڑی دنیا آباد ہے۔ اور پورا کمرا ان سے بھر جائے گا اور میں اس ڈھیر میں دب کر ہلاک ہو جاؤں گا۔ ورنہ یہ بات تو تھی کہ سب مل کر مجھے نوچ کھا جائیں گی اور کچھ دیر بعد یہاں انسانی پنجر یہاں پڑا ہوگا۔

یکا یک اس کمرے کی دیوار میں مجھے ایک اور دروازہ نظر آیا جو یقیناً ملحقہ کمرے ہی کا ہو سکتا تھا۔ چناں چہ میں چمگادڑوں کو ہٹاتا، دھکیلتا آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا لیکن وہ خون آشام چمگادڑیں شاید دلوں کا حال جانتی تھیں۔ ان کے

حملوں میں بے پناہ شدت پیدا ہوگئی وہ مجھ پر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔ کئی ایک تو میرے جسم سے جونک کی طرح چمٹ گئیں اور اب مجھ میں کھڑا رہنے کی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ میرے قدم ڈگمگانے لگے ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ مجھ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی لیکن اس سے پہلے کہ میں بے ہوش ہو کر گر جاؤں میں نے دیکھا یا محسوس کیا کہ ایک حسین اور نرم و نازک ہاتھ دروازے کے اندر سے نمودار ہوا اور اس نے برق رفتار سرعت سے مجھے اندر کی طرف کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس اتھاہ تاریکی کے سمندر میں غرق ہو گیا ہوں۔ وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ اس پراسرار مقام پر یہ روح فرسا تاریکی مجھے دہشت ناک محسوس ہوئی۔ چناں چہ میں تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا اور تب میں نے محسوس کیا کہ باہر کوئی ہنگامہ برپا ہے۔ عجیب عجیب آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے نزدیک ہی بے شمار طیارے پرواز کر رہے ہوں اور ساتھ ہی توپیں داغی جا رہی ہوں۔

میرے اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا اور دروازہ تلاش کرنے لگا اور پھر جلد ہی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا لیکن اس کمرے میں اب سکوت طاری تھا جہاں کچھ دیر پہلے قیامت ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ اب وہاں ایک بھی چمگادڑ کا نام و نشان اور وجود تک نہیں تھا۔ جب میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا اور خوف محسوس نہیں ہوا تو پھر اندر گھس گیا۔ بے دھڑک سا.....

اس کمرے میں شور، ہنگامے کی آوازیں بہت تیز سنائی دے رہی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے کان کے پردے پھٹ سکتے ہیں۔ میں ان آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اور جلد ہی پتا چل گیا کہ باہر پوری شدت سے بادل چنگھاڑ رہے ہیں اور بجلی غضب ناک ہو کر کڑک رہی ہے۔ ہوا بھی شاید بہت تیز چل رہی تھی لیکن ابھی بارش کے برسنے کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ دراصل مطلع صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ دن بھر حبس کی سی کیفیت طاری رہی تھی اور ایک عجیب سا سکوت چھایا رہا تھا جو یقیناً کسی آندھی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ چناں چہ موسم کا اچانک تغیر میرے لیے حیرت انگیز نہیں تھا مجھے تو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس طلسم خانے سے باہر کیسے نکالا جائے۔ میں نے سوچا اگر بارش شروع ہونے سے پہلے ہی اپنی جیپ تک پہنچ جاؤں تو اس خوف ناک گھنڈر سے نجات مل سکتی ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ جیپ تو الٹی پڑی ہوگی اور اس خوف ناک طوفان میں اسے سیدھا کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ بہرحال میں باہر کا جائزہ لینے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا لیکن دوسرے ہی لمحے کوئی چیز میرے پیر کے نیچے آ گئی اور کمرا ایک عجیب سے شور سے گونج اٹھا۔ اس وقت تو میں سراسیمہ سا ہو کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے پیر کے نیچے تیز روشنی زمین سے پھوٹ رہی ہے اور سامنے کی دیوار منور ہے۔

رات کے بھیانک سناٹے میں ایک کھنڈر کے اندر زمین سے روشنی کا پھوٹنا بڑی حیرت ناک بات تھی اور یہ واقعہ انسان کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ یہی وجہ تھی میں کسی قدر خوف زدہ ہو گیا تھا اور میری پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے اور رگوں میں سنسنی بھر گئی تھی۔

دوسرے لمحے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا اور میرے لبوں پر مسکراہٹ ابھر کے پھیل گئی۔

دراصل وہ میری ٹارچ تھی جو چمگادڑوں کے حملے کے خوف اور سراسیمگی کی کیفیت میں ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی تھی اور اس سے اس کے سوئچ پر میرا پیر پڑ گیا تھا۔ ٹارچ روشن ہو گئی تھی۔

میں نے جھک کر ٹارچ اٹھائی اور پھر ٹارچ کی تیز روشنی میں رائفل بھی فرش پر گری ہوئی دکھائی دی۔

عجیب سی آواز آئی تھی۔ وہی آواز جو میں نیچے ایک بار سن چکا تھا۔ پھر میں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور آہستگی سے دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔ میں نے اندر کی آہٹ پر کان لگا دیے لیکن وہ غیر فطری آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ میں نے روشن دان کے ذریعے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن وہ کافی اونچا تھا اور کوئی چیز نیچے رکھے بغیر اندر جھانکا نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ نزدیک ہی ملبے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ میں نے وہاں سے کئی پتھر اٹھائے اور انہیں اوپر نیچے رکھ کر روشن دان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکالی اور ابھی روشنی کرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک زبردست کڑاکا ہوا تو میرا توازن قائم نہ رہ سکا۔ میں اس کڑاکے سے ہل گیا تھا۔ میرے پیر لڑکھڑاتے ہوئے پتھروں سمیت فرش پر آ رہے۔

چند لمحوں کے بعد سنبھل کر اٹھا تو مجھے خوف تو محسوس نہ ہوا البتہ اپنی بزدلی پر ہنسی آ گئی۔

دراصل وہ بادل گرجنے کی آواز تھی اور اتنی شدید اور ہولناک تھی جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو یا کہیں نزدیک ہی ایٹم بم کا دھماکا ہوا ہو۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل تلے کھڑے تھے اور بجلی اس انداز سے کوند رہی تھی اور ہواؤں کے زور میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کالی آندھی آ گئی ہو۔

پتھروں پر چڑھ کر میں ایک بار پھر کسی نہ کسی طرح روشن دان تک پہنچ ہی گیا۔ کمرے کے اندر ہولناک تاریکی کا ایسا راج تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اور پھر جوں ہی اس کمرے کی روشنی میں اندر کا منظر دکھائی دیا میں اس طرح اچھل پڑا جیسے کسی نے میری پشت میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی اور میں ساکت و جامد ہو گیا۔

آنکھیں خوف و حیرت سے پھٹی رہ گئیں اور ٹارچ والا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ پورا کمرا انسانی ڈھانچوں سے پٹا پڑا تھا بے شمار پنجر جو بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوئے تھے۔ وہ پراسرار آواز بھی شاید کسی ڈھانچے کے گرنے کی تھی جو غالباً ڈھیر کے اوپر سے کھسک گیا تھا۔ بہرحال ایسا خوف ناک منظر میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا جس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ میں تیزی سے نیچے آیا۔ میرا دل بہت تیز تیز دھڑک رہا تھا اور میں ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ اس کھنڈر میں ان بے تحاشا انسانی ڈھانچوں کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں جو طوفانوں، سیلابوں اور بستیاں اجڑنے سے جو مر جاتے ہیں انہیں کوئی نادیدہ ہستی انہیں یہاں لا کر کسی وجہ سے ڈھیر کر دیتی ہے۔ یہ انسانی ڈھانچوں کا گودام بنا ہوا تھا۔

خوف زدہ ہو جانے کے باوجود میں ایک بار پھر ان پتھروں پر چڑھ کر اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے سرسری اندازہ لگایا۔ وہ انسانی ڈھانچے یقیناً سو سے اوپر ہی ہوں گے۔ ان میں سے کچھ بالکل تازہ تھے۔ کیوں کہ کہیں کہیں ہڈیوں سے گوشت چپکا ہوا نظر آیا تھا۔ سر کے دراز بال بھی ابھی کھوپڑی سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ چناں چہ وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ تازہ ڈھانچے یقیناً عورتوں اور لڑکیوں کے ہیں۔

ہر چند کہ میں سخت دہشت زدہ تھا اور میری رگوں میں لہو منجمد تھا لیکن اس کے باوجود میرا تجسس تھا بڑھ گیا تھا۔ اب میں جلد از جلد ان باقی کمروں کو بھی دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اس غرض سے میں نے دوسرے دروازے کے نزدیک پتھر رکھے اور اوپر چڑھ کر روشن دان کے راستے اندر کا جائزہ لینے لگا۔ اس بار میں خوف زدہ تو نہیں ہوا البتہ میری حیرت دو چند ہو گئی۔ اس کمرے میں زنانہ ملبوسات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ مختلف اقسام کے بے شمار ملبوسات تھے۔ ریشمی و سوتی ساڑھیاں، شلواریں، غرارے، بلاؤز اور چولیاں، زیر جامے اور اسی قسم کے دوسرے کپڑے..... میں بڑے تعجب سے ان بھڑکیلے کپڑوں کے انبار کو دیکھنے لگا۔ ان ڈھانچوں سے زیادہ یہ ملبوسات حیرانی کا

باعث تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ قیمتی، بھڑکیلے اور فیشن ایبل ملبوسات کس سرپھرے نے یہاں جمع کیے ہیں یا پھر ممکن ہے وہ خوف ناک ڈھانچے کسی خاص وقت میں یہ لباس استعمال کرتے ہوں گے۔ ہر چند کہ یہ ایک مضحکہ خیز قیاس تھا مگر اس پراسرار کھنڈر کے اندر موجود، حالات میں یہی کہا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی اور امر ذہن سوچنے سے قاصر تھا۔

دفعتاً اس آخری اور روشن کمرے سے درد و کرب میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

میں فوراً ہی تیزی سے نیچے اتر آیا اور سرعت سے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے وہی پتھروں والی ترکیب استعمال کی اور آسانی سے روشن دان تک پہنچ ہی گیا۔ کمرا چوں کہ پہلے سے ہی روشن تھا اس لیے مجھے ٹارچ جلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن میں نے جوں ہی اندر جھانک کر دیکھا میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ میں ایک بار پھر حیرت اور خوف کے سمندر میں غرق ہوگیا۔ یہاں ہر قدم پر ایک نیا اسرار اور ناقابل یقین واقعہ رونما ہورہا تھا اور یہ منظر جو اس وقت میری نظروں کے سامنے تھا سب سے زیادہ ہولناک تھا۔

میں واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ کمرے کے وسط میں ایک نوجوان لڑکی ستون سے بندھی ہوئی کھڑی تھی۔ وہ فطری حالت میں تھی اور اس کے نازک جسم کے بعض حصوں سے خون رس رہا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی، شاید وہ بے ہوش تھی۔ لیکن بے ہوشی کے عالم میں اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔

مجھ سے یہ روح فرسا منظر دیکھا نہ گیا۔ معلوم نہیں اس نازک اندام حسین لڑکی کو کسی شقی القلب نے ایک خون آشام بھیڑیے کی طرح تشدد کیا تھا اور اس کے زخموں سے نہ صرف لہو رس رہا تھا بلکہ غریب کراہ رہی تھی۔ اس کی کراہیں اس قدر دل سوز تھیں سخت سے سخت دل بھی پسیج جائے۔ میں نے فوراً ہی لڑکی کو اس اذیت اور عذاب سے نجات دلانے کے لیے نیچے اتر گیا۔ میں نے دروازے پر لگے قفل کا جائزہ لیا اور اسے کسی ترکیب سے کھولنے کا سوچنے لگا۔ وہ مظلوم عورت ابھی زندہ تھی۔ اس کی کراہیں اور سینے میں جو سانسوں کا تلاطم تھا وہ اس کی زندگی کا ثبوت تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ غریب سسک سسک کر دنیا سے رخصت ہوجائے۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس دقیانوسی قفل کو کھولنے کی تدبیر کرتا نیچے کسی قسم کی آہٹ سنائی دی اور پھر یوں محسوس ہوا گویا کچھ لوگ سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے ہوں۔ ان حالات میں میرا اس جگہ رہنا یا کسی قسم کی کارروائی کرنا نہ صرف فضول بلکہ لاحاصل تھا۔ اب یہی مناسب تھا کہ میں نیچے پہنچ کر صورت حال کا جائزہ لوں۔ اسی لیے میں نے قفل کھولنے کا ارادہ ملتوی کیا۔ کیوں کہ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا اور پھر آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھنے لگا۔

زنگ آلود زینہ ہوا کے تھپیڑوں سے جھولتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ آخر یہ کیوں کر اور کیسے اپنی جگہ رکا ہوا ہے۔ بہرکیف یہ وقت اس مسئلے پر غور کرنے کا نہیں تھا بلکہ دیکھنے کی یہ بات تھی کہ نیچے وہ کون لوگ ہیں اور اس خوف ناک اور پراسرار کھنڈر میں گھس کر کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

میں جس طرح دبے پاؤں اور بے آواز جس قدر احتیاط سے اوپر آیا تھا اس سے کہیں محتاط ہوکر آہستگی سے نیچے اترنے لگا۔ میں نے ٹارچ بجھا رکھی تھی اور رائفل سیدھے کندھے پر موجود تھی۔ آخری سیڑھی طے کرنے کے بعد میں نے متلاشی نظروں سے اطراف کا جائزہ لیا کہ کوئی خطرہ تو منڈلا نہیں رہا ہے؟ لیکن وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ اب سرگوشیوں کی آوازیں بھی بند ہوگئی تھیں اور دور نزدیک کوئی آہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

دائیں بائیں کا جائزہ لینے کے بعد جب میں سامنے والے کھنڈر کی طرف دیکھا تو معاً اچھل پڑا اور میرے قدم اپنی جگہ منجمد ہوگئے۔ کھنڈر کے آخری سرے والا صحیح سالم کمرا اس وقت روشن نظر آیا تھا۔ گو

دروازہ بھڑا ہوا تھا لیکن روشنی دروازے کے اوپر والے روشن دان سے باہر آرہی تھی۔ ان حالات میں یہی خیال کیا جا سکتا تھا کہ وہ لوگ جن کی گفتگو کی آوازیں اوپر سنائی دی تھیں غالباً اسی کمرے میں پناہ گزین ہیں ورنہ اس روشنی کا کوئی اور جواز نہیں تھا کیوں کہ پہلی دفعہ میں نے اسی کمرے کو دیکھا تھا تو وہ بے حد تاریک تھا۔

میں کافی دیر تک ان پیش آنے والے پراسرار اور ناقابل فہم اور تحیر انگیز حالات پر غور کرتا رہا۔

پھر میں نے بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ وہاں جا کر اس کھنڈر کا جائزہ لیا جائے۔ یہ بات تو ظاہر تھی کہ ایک عام آدمی اس پراسرار اور دہشت ناک کھنڈر میں رہائش اختیار نہیں کر سکتا۔ اندر جو کوئی بھی ہے وہ یقیناً غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور حالات بگڑنے کی صورت میں ایک نئی مشکل سے دوچار ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن میری مہم جو اور خطرات پسند طبیعت نے مجھے وہاں پہنچنے پر مجبور کر دیا۔ چناں چہ میں کمال ہوشیاری اور آہستگی سے دروازے تک پہنچ گیا۔ میں کچھ دیر خاموش اور بے حس و حرکت کھڑا رہا لیکن کمرے سے کسی قسم کی آواز اور آہٹ سنائی نہیں دیتی تھی۔ اندر گہرا سکوت طاری تھا۔

اس دروازے کا روشن دان بھی کافی بلند تھا اور نزدیک کوئی ایسی چیز بھی نظر نہیں آئی تھی کہ اس کی مدد سے روشن دان تک پہنچا جا سکے اور چوں کہ دروازہ مقفل نہیں تھا اس لیے میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دروازہ کے راستے اندر داخل ہوا جائے۔ ہر چند کہ یہ اقدام خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن اس کے سوا کوئی اور صورت بھی نہ تھی۔ چناں چہ رائفل کو کولھے کے قریب رکھ کر فائرنگ پوزیشن میں کیا۔ لبلبی پر انگلی رکھی اور رائفل کی نال سے دروازہ کھولنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔

لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کہ رائفل کی نال ابھی دور ہی تھی کہ دروازے کے دونوں پٹ کھل جا سم سم کی طرح آپ ہی آپ کھل گئے اور اندر کا منظر صاف نظر آنے لگا۔

دوسری حیرت کی بات یہ تھی کہ کمرا بالکل خالی تھا۔

کمرے کے اندر کوئی موجود نہ تھا لیکن یہ کمرا اجاڑ، سنسان اور بدبودار ہونے کے بجائے ایک پرتکلف اور آراستہ خواب گاہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ جب کہ اس غیر آباد کھنڈر میں یہ یقینی غیر فطری امر تھا کمرے کی اندرونی کیفیت سے یہ پتا چلتا گویا کوئی مستقل طور پر اقامت پذیر ہے اور شاید ابھی ابھی کہیں باہر گیا ہوا ہے۔

میں تفصیلی نظر سے کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک گوشے میں ایک پرانی طرز کی بڑی سی مسہری بچھی ہوئی تھی جس پر نرم، گداز اور آرام دہ بستر موجود تھا۔ مسہری کے نزدیک ہی قدیم وضع کی ایک میز پڑی تھی اور اس پر دل کش نقش و نگار کندہ تھے۔ دوسری جانب سنگار میز نظر آرہی تھی جس کی ساتھ قد آدم آئینہ موجود تھا اور ضروریات کا تمام سامان بڑے سلیقے اور قرینے سے سجایا ہوا تھا۔ یہ بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کمرے کے اندر سوندھی سوندھی مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ میں بہر حال ایک مرد ہوں۔ عورت کے جسم سے پھوٹتی ہوئی مہک کو پہچانتا ہوں۔

میری نگاہیں دوبارہ میز کی طرف پلٹ آئیں اور اب جو میں نے اسی طرف دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔

میز پر دودھ سے بھرا ایک گلاس اور تازہ پھل رکھے ہوئے تھے۔ جب کہ اس سے پیشتر میز بالکل خالی تھی۔ بہر کیف میں تھکن سے چور اور بھوک سے بدحال تھا اگر بھوکے کو غذا اور ماندہ کو بستر میسر آجائے تو وہ خود کو قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا۔ میں تیزی سے میز کی جانب بڑھا اور پرانی وضع کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تازہ پھلوں اور قوت بخش دودھ نے میری بھوک کو مزید چمکا دیا اور کمرے کے مکین کی ناراضی کے بغیر میں پھلوں پر ندیدوں کی طرح ٹوٹ پڑا۔ اس کیفیت میں کسی بات کا ہوش ڈر

اور خوف کہاں رہتا ہے۔

پھل کافی مقدار میں پکے ہوئے اور رسیلے تھے اور ان کی مٹھاس میں نے شاید ہی کسی اور پھلوں میں پائی تھی۔ جانے یہ کون سے پھل تھے۔ انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ انہیں بے تحاشا چوس رہا اور مزے لے لے کر اس لیے بھی کھا رہا تھا کہ بھوک پیاس سے بے حال ہو تھا۔ یوں بھی پیڑ کیا گننا..... آم کھانے سے غرض تھی۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ تکلف اور جھجک کی کیا بات تھی۔ اتنا کچھ کھانے کے باوجود پھر بھی نصف بچ گئے تھے۔ اگر گنجائش ہوتی تو ان کی لذت ایک بھی بچنے نہ دیتی۔ پھر میں نے دودھ سے بھرا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ پھر میں نے ایک نمبی سی ڈکار لی اور للچائی نظروں سے آرام دہ اور گداز بستر کی طرف دیکھنے لگا۔

دراصل جب پیٹ بھر جائے تو جسم آسودگی چاہتا ہے۔ چناں چہ میں مسہری کی طرف بڑھا اور آہستگی سے دراز ہو گیا۔ بستر واقعی نہایت ریشم جیسا نرم و گداز اور تسکین بخش تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے مہکتے پھولوں کی سیج پر لیٹا ہوا ہوں۔ اس کے علاوہ بستر سے نہایت سحر انگیز و لطیف خوشبو آ رہی تھی اور میں عجیب بے خودی سی محسوس کر رہا تھا۔ یہ مدہوش کن سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک یقیناً ایک جوان عورت کے جوان جسم کی تھی جو مجھے بے چین کیے دے رہی تھی۔

ہر چند کہ موجودہ حالات میں اس پراسرار اور خوف ناک کھنڈر میں سو جانا قطعی مناسب نہیں تھا۔ لیکن بہتر خوراک اور آرام دہ بستر کے حصول کے بعد نیند پر قابو پانا بھی بہت مشکل تھا۔ میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں اور ذہن پر غنودگی طاری تھی۔ اور ابھی میں پوری طرح نیند کی آغوش میں نہیں پہنچا تھا کہ یکا یک مجھے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ سنگار میز کے قریب ایک پرشباب گداز بدن کی ایک نوجوان عورت کھڑی تھی۔ اس نے سفید براق لباس تن زیب کر رکھا تھا۔

اس کے مرمریں، گداز اور سڈول بازو جو شفاف تھے وہ عریاں تھے۔ میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہی بازو تھے جنہیں چمگادڑوں والے کمرے میں دیکھ چکا تھا اور مجھے ان گوشت خوروں چمگادڑوں سے بچایا تھا۔ نجات دلائی تھی۔ وہ میری جانب پشت کیے کھڑی تھی۔ اس کا سراپا اور تناسب غضب ڈھا رہے تھے۔ میں اس لیے اس کا چہرہ دیکھ نہیں سکا تھا اس کی پشت میری جانب جو تھی۔

میں تیزی سے بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا کہ اس بت ناساز کا چہرہ دیکھوں جو قیامت بن کھڑی تھی اور اس کا پرشکوہ سراپا اور تناسب قیامت ڈھا رہے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کو ایک سنسناہٹ دینے والا جھٹکا سا لگا۔ کمرا اب خالی تھا اور وہ حسینہ اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ وہ اس طرح سے غائب ہو گئی تھی کہ کہیں میں اسے اپنے بازوؤں کی گرفت میں نہ لے لوں۔ میں اس کے اس طرح اور اس انداز سے غائب ہونے پر کسی قدر خوف زدہ ہو گیا۔ پھر سوچا کہ وہ میرا نظر فریب ہو۔ کیوں کہ بستر سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی خوشبو کی نسوانی مہک نے میرے ذہن میں ایک حسین شبیہہ متعین کر لی تھی اور شاید یہ اس کا ردعمل تھا۔

میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ بند کمرے میں اس جوان عورت کی موجودگی اور پھر اس کا پراسرار طور پر اس طرح سے غائب ہو جانا میرے لیے وہم نہیں بلکہ معمہ بنا ہوا تھا۔ اس کا گداز، مرمریں سڈول جسم ابھی تک میری نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ اور پھر انہی خیالات اس کے چشم تصور میں غلطاں و پیچاں میری آنکھ لگ گئی تھی۔

مجھے گہری نیند میں غرق شاید دو ڈھائی گھنٹے گزرے ہوں گے کہ یکا یک ایک دل خراش چیخ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں بستر پر ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ دفعتاً ایک اور چیخ بلند ہوئی جو پہلی سے کہیں دردناک تھی اور پھر میں سراسیمہ ہو کر بستر سے نیچے اتر پڑا۔ آدھی رات کے وقت ایک ویران کھنڈر میں

چیخوں کی پر ہیبت آوازیں دلیر سے دلیر آدمی کو خوف زدہ کرسکتی ہیں۔ یہی حال اس وقت میرا اپنا تھا۔ میں خوف زدہ ضرور ہوگیا تھا۔ لیکن میری متجسس طبیعت بار بار اکسا رہی تھی کہ باہر نکل کر صورت حال سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اندر سے کچھ معلوم نہ ہوسکے گا۔

اچانک بادل بڑے زور سے گرجا اور اس کی بازگشت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کرب ناک چیخ کی آواز پھر سنائی دی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ گویا کھنڈر کے در و دیوار لرز کر رہ گئے ہوں۔ اس بار مجھے پورا اندازہ ہوگیا تھا کہ چیخوں کی آوازیں اوپر کی منزل سے آرہی ہیں جہاں میں نے تین کمرے دیکھے تھے اور تینوں میں خوف و دہشت کی حکمرانی تھی۔ میں نے ایک جوان لڑکی کو فطری حالت میں ایک ستون سے بندھا ہوا بے ہوشی کی حالت میں دیکھا تھا اور مجھے محسوس ہوا تھا کہ اس معصوم پر کوئی درندہ صفت ظلم توڑ رہا ہے۔ اس وقت میری رگ حمیت بھڑک اٹھی تھی اور میں اس مظلوم، بے کس عورت کی مدد کرنا چاہتا تھا جس پر کس انداز سے ظلم و ستم ڈھائے جا رہے تھے۔ چناں چہ میں کمرے سے نکل کر زینے کی طرف کوندا بن کر لپکا۔ اس وقت ہوا کا زور کم ہوگیا تھا اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ بادلوں کی چنگھاڑ میں بھی کچھ کمی واقع ہوگئی تھی لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے وقفے سے پوری شدت کے ساتھ چیخ پڑتے تھے۔

چکردار زینہ جب طے کر کے جب میں اوپر پہنچا تو حسب سابق وہ تیسرا کمرا روشن تھا اور اندر سے کسی عورت کی درد میں ڈوبی ہوئی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بھی غیر مانوس آواز آرہی تھی اور یہ آواز اتنی عجیب اور ناقابل فہم تھی کہ میں کوشش کے باوجود اس کی حقیقت کو سمجھ نہ سکا۔ البتہ میں اتنا ضرور سمجھ گیا کہ اس مظلوم لڑکی کے علاوہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ دروازے کے قریب پتھر پہلے سے رکھے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں آہستگی سے اوپر چڑھا اور روشن دان کے ذریعے اندر جھانکا۔ لیکن میں نے جوں ہی میں نے کمرے کا اندرونی منظر دیکھا میری روح کانپ کر رہ گئی۔ جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ اس قدر ہولناک تھا کہ عام انسانی نظر اس کی تاب نہ لاتی۔ کمرے کے اندر ایک بڑی چمگادڑ موجود تھی وہ ستون سے بندھی ہوئی بے دست و پا لڑکی کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ وہ بار بار فطری حالت میں لڑکی پر حملہ کرتی اور ہر مرتبہ اس کے جسم کے کسی حصے سے گوشت اڑا لے جاتی۔ لڑکی میں اب چیخنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے منہ سے بس کراہیں نکل رہی تھیں۔ اس کا نازک نازک سا بدن لہولہان تھا اور خون آشام چمگادڑ نے بے رحمی سے نوچا کھسوٹا تھا کہ نظر بھر کے دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

اگر یہ دل خراش منظر نہ دیکھتا تو میں یہی سمجھتا کہ کسی درندہ صفت نے اس لڑکی کو ستون سے اس لیے باندھ دیا کہ لڑکی نے مزاحمت کر کے اس کی خواہش پوری ہونے نہیں دی اور اس کے منہ پر تھوکا اور مزاحمت کی جس پر اس شقی القلب نے طیش میں آکر اسے اس حالت میں پہنچایا..... اس سے انتقام لے رہا ہے اور اس کے جسم کو زخموں سے چور چور کر رہا ہے۔

میں زیادہ دیر تک اس ہولناک منظر کو دیکھ نہ سکا۔ اس منظر نے اندر سے میرا دل نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ رائفل گولیوں سے اس موذی چمگادڑ کو کیوں نہ بھون کر رکھ دیا جائے اور تب اچانک مجھے خیال آیا کہ رائفل اور ٹارچ تو میں عجلت میں کمرے کے اندر ہی چھوڑ آیا ہوں اور اب چمگادڑ کو ختم کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں تھا کہ قفل توڑ کر اندر گھس جاؤں۔ اور کسی نہ کسی ترکیب سے اسے ہلاک کردوں اور ابھی میں کوئی تدبیر سوچ ہی رہا تھا کہ یک لخت زینے پر کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں تیزی سے نیچے اتر آیا اور ایک گوشے میں رک گیا۔ آنے والا ایک عظیم الجثہ شخص تھا اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں کوئی شے اٹھا رکھی تھی۔ اور اس کا رخ اسی روشن کمرے کی طرف تھا۔

حا بجلی چمکی اور تیز روشنی میں اس دیو ہیکل انسان کا پورا وجود نمایاں ہو گیا۔

اس کے ہاتھوں پر ایک انسانی جسم تھا۔ غالباً کسی لڑکی کا تھا۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچا تو وزنی قفل خود بخود کھل گیا۔ وہ گرانڈیل شخص اندر گھس گیا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو کر دوبارہ مقفل ہو گیا۔

میں چند ثانیے حالات پر غور کرتا رہا۔ پھر میں بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس روشن کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہر چند کہ یہ ایک خطرناک اقدام تھا اور اس پر بہت مقام پر کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا مگر اب تک جو واقعات پیش آئے تھے مجھے اتنا متجسس اور متعجب بنا دیا تھا کہ میں اصلیت کا پتا چلانے کے لیے بے چین تھا۔ چناں چہ میں ایک بار پھر پتھروں پر کھڑا ہو کر اندر جھانکنے لگا۔

کمرے میں وہ چمگادڑ موجود نہیں تھی۔ وہ لڑکی اس طرح ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ اس کا زخمی اور خون آلود جسم بے حس و حرکت تھا۔ اس کی خوب صورت صراحی دار گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ شاید وہ مر چکی تھی یا قریب المرگ تھی۔

دیو ہیکل آدمی کمرے کے وسط میں کھڑا تھا۔ بڑے کروفر اور رعونت اور مغرورانہ انداز سے میں نے اس قدوقامت آدمی کا اس سے پہلے کبھی کہیں نہیں دیکھا تھا۔ البتہ میں جو بچپن سے جو جن بھوتوں اور بدروحوں کی کہانیاں قصے سنتا آیا تھا اس میں راکشش کا ذکر ہوتا تھا۔ وہ اس راکشش کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ بلاشبہ مجھے وہ دیو ہی نظر آیا تھا۔ اس نے قدیم راجاؤں مہاراجوں جیسا لباس پہن رکھا تھا لیکن اس کا چہرہ اس قدر مکروہ، گھناؤنا اور بدہیبت تھا کہ میرے بدن پر جھرجھری آ گئی اور دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کو ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں پر جو انسانی بوجھ اٹھایا ہوا تھا جیسے وہ کوئی نوزائیدہ ہستی ہو۔ اس نے اس انسانی جسم کو اب فرش پر لٹا دیا۔ تب میری نظر اس پر پڑی تو میں نے دیکھا وہ ایک نہایت خوبرو اور نوخیز عمر کی لڑکی تھی۔ وہ فرش پر چت پڑی ہوئی تھی اور شاید بے ہوش تھی۔

وہ بدصورت دیو قامت شخص ہوسناک نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ جھکا اور لڑکی کے قریب دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ چوں کہ میری جانب اس کی پشت تھی اس لیے میں دیکھ نہیں سکا کہ اس نے کیا حرکت کی اور کیا عمل کیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے لڑکی کو ہوش آنے لگا اور اس کے سینے میں سانسوں کا زیروبم ہچکولے کھانے لگا جیسے زندگی جنم لے رہی ہو۔ پھر دوسرے لمحے لڑکی ہوش میں آ گئی۔ اس نے آہستہ آہستہ اپنی لامبی لامبی سرمگیں پلکیں اوپر اٹھائیں۔

جوں ہی اس نے ایک خوفناک اور بدہیبت انسان کو اپنے اوپر پایا اور دیکھا کہ وہ کوئی نامناسب سی حرکت کرنے والا ہے وہ ایک ہذیانی چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بے تحاشا دروازے کی طرف دوڑی۔

دروازہ پہلے ہی سے بند تھا اور باہر نکلنے کے لیے کوئی متبادل راستہ بھی نہیں تھا۔ لڑکی بدحواس اور سراسیمہ ہو کر کمرے کے اندر چکر کاٹنے لگی۔ اس کے منہ سے فلک شگاف ہیجانی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ خوف و دہشت کے عالم میں چکر کاٹتی ہوئی فرش پر بار بار گر پڑتی اور سنبھل جاتی۔ آخر تھکن سے چور ہو کر دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ جسم اور چہرہ پسینے میں شرابور تھا اور کپڑے اس طرح چپک گئے جیسے بارش میں نہائی ہوئی ہو۔ اس کے لامبے لامبے ریشمی سیاہ بال چہرے پر بادل کی طرح چھا گئے۔ چہرہ سفید پڑتا چلا گیا اور اس کی آنکھیں پتھرا کے رہ گئی تھیں۔

وہ بدشکل اور پراسرار انسان بڑی دل چسپی اور اطمینان سے لڑکی کی حرکات اور خوف زدگی کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کے رقص سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔ جس سے چہرہ اور بڑا گھناؤنا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تو جس سے اس کے کھوکھلے پن

Pakistanipoint.com

کا اظہار ہوتا تھا۔ پھر وہ چند قدم چل کر لڑکی کے نزدیک پہنچ گیا۔ پھر اس کی کرخت اور بھونڈی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

''ڈرومت من کی رانی! ہم نے آج کی رات تمہیں اپنے لیے منتخب کرلیا ہے.....ہم جسے پسند کر لیتے وہ دنیا کی سب سے خوش قسمت ترین لڑکی بن جاتی ہے.....لیکن یہ بات بتادوں۔ کان کھول کر سن لو اچھی طرح سے.....اگر تم نے مزاحمت کی کوئی واہیات کوشش کی تو وہ بے سود ہوگا۔ اس طرح تم میرے غصے کو دعوت دو گی۔ تمہارا حشر اس لڑکی سے بھی بدتر ہوگا۔ پھر تم کسی قابل نہیں رہو گی.....یہ بات اچھی طرح سوچ لو.....''

اس نے پرخوف نظروں سے ستون سے بندھی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ اس لڑکی کا بدن جو زخموں سے چور تھا اور خون رس رہا تھا اس نے اسے بری طرح لرزا دیا اور اس کا نازک سا بدن خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور پھر ہچکی بندھ گئی۔ پھر اس نے ہچکیوں کے درمیان لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

''تم.....؟ تم کون ہو.....؟ تم انسان تو معلوم ہوتے ہی نہیں.....؟''

''ہاہاہا.....'' شیطان صفت انسان نے بھیانک قہقہہ لگایا۔.....میں عظیم قوتوں کا مالک ہوں۔ میرے ایک ادنی اشارے پر زمین کانپنے لگتی ہے۔ اور ہوائیں اپنا رخ بدلنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔''

''کیا تو تم کوئی جادوگر ہو.....؟ جو جادو کے زور پر.....'' لڑکی کی آواز حلق میں پھنس گئی تو اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

''جادوگر.....؟'' اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ ''ہونہہ.....دنیا میں کوئی بھی بڑے سے بڑا جادوگر میرا مقابلہ نہیں کرسکتا.....کالا جادو، کوئی بھی جادو منتر ہو.....آگرہ کے سامری جادوگر کی روح بھی ہو.....تم شاید نہیں جانتی ہو کہ بدروحیں بھی خطرناک جادوگر ہوتی ہیں۔ میری تمام قوتیں لامحدود ہیں.....جو جادوگر بھی میرے مقابلے پر آیا اسے منہ کی کھانی پڑی۔''

پھر اس نے توقف کر کے زمین پر ایڑی ماری اور دوسرے ہی لمحے وہاں ایک لمبا سیاہ اور خوف ناک سانپ جو کوئلے کی طرح سیاہ تھا وہ زمین سے دو تین فٹ بلند تھا اور اس کی دو شاخی زبان بار بار لپک رہی تھی۔ اچانک پراسرار آدمی نے اسے اشارہ کیا اور سانپ نے بل کھایا اور پھر اس لڑکی کی طرف رینگنا شروع کردیا۔

لڑکی کے منہ سے ہولناک چیخیں نکل رہی تھیں اور وہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگی لیکن سانپ بھی زیادہ تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی پل لڑکی کو ڈس کر رہے گا۔

اس شیطان صفت انسان کے منہ سے خوف ناک قہقہے ابل رہے تھے۔ شاید وہ اس دردانگیز منظر سے بہت لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور خوف ناک سانپ اپنی جگہ رک گیا۔ پھر وہ شاہانہ انداز سے چلتا ہوا لڑکی کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔ لڑکی سہم کر کانپنے لگی تو وہ کہنے لگا۔

''یہ ناگ میرے حکم کے بغیر تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا اور نہ ہی اپنی مرضی سے پہنچا سکے گا.....ہاں اگر تم نے میرے کسی بھی حکم سے سرتابی کی، کسی بات سے انکار اور مزاحمت کی اور نہ کوئی بات مانی تو پھر اس جیسے میرے حکم پر آ کر تمہارا نرم و نازک گوشت کھا جائیں گے۔''

لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور آنکھیں سوج کر بھاری ہوگئی تھیں۔ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن فرط غم سے زبان الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ آخر اس نے اپنی لرزتی آواز بہ مشکل کہا۔

''تم.....تم.....تم کیا چاہتے ہو؟ میری بے بسی سے فائدہ؟''

یہ بات لڑکی نے غلط نہیں کہی تھی۔ ظاہر تھا وہ اسے کسی برے ارادے سے ہی اغوا کر کے لایا اور

پر قابو پالیا تھا۔ یہ لڑکی کوئی بچی نہیں تھی جو اس کے ارادوں کو نہیں بھانپتی...... وہ جو اسے حریصانہ نظروں سے اوپر سے نیچے تک دیکھ رہا تھا۔ اس سے بھی اندازہ بھی ہوتا تھا۔

"فکر نہ کرو...... پریشان نہ ہو میری رانی......! ابھی پتا چل جائے گا...... میں تمہارا یہ لذیذ اور نازک گوشت نوچ اور مزے لے لے کر کھا جاؤں گا۔"

"نہیں...... ہرگز نہیں۔" لڑکی خوف زدہ ہونے کے باوجود غصے سے چیخ پڑی۔ "تم مجھے ہاتھ لگانا تو درکنار نوچ کر ہرگز نہیں کھا سکتے...... تم کیا آدم خور ہو......؟"

"پہلے پہل ہر لڑکی یہی کہتی اور نخرے دکھاتی ہے...... مگر مجھے عورت کو رام کرنا آتا ہے۔" وہ ہنسا۔ "میں جس لڑکی عورت کو بھی لایا ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں تھی جس نے میری خواہش پوری نہ کی ہو۔"

"بھگوان کے لیے مجھے برباد نہ کرو...... مجھ پر رحم کرو...... دیا کرو...... اگر تمہیں رقم کی ضرورت ہے تو میرے ماں باپ کافی امیر کبیر ہیں۔ تم ان سے رابطہ کرو۔ وہ تمہیں منہ مانگی رقم دے دیں گے۔"

"میں زمین پر لات ماروں تو سونے کی اشرفیاں اور ہیرے جواہرات ابل پڑیں۔" سفاک آدمی نے پرجوش لہجے میں کہا۔ "مجھے روپے پیسے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو ہمیشہ سے تم جیسی نوخیز اور حسین و جمیل لڑکیوں کا دل دادہ رہا ہوں...... تم کسی خزانے سے کم نہیں ہو۔"

اس نے لڑکی کو دبوچ کر قابو میں کر لیا۔ پھر بے بس کر دیا۔ پھر اس پر کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح ٹوٹ پڑا۔ وہ نازک اندام سے لڑکی کسمسائی، مزاحمت کرنے لگی۔ اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے کوشش اور جدوجہد کرنے لگی۔ وہ دیو قامت کے سامنے ایک بچی سی تھی۔ اپنی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ مجھ سے یہ روح فرسا اور شرمناک منظر دیکھا نہ گیا۔ اگلے لمحے نیچے اتر آیا۔ مجھے اس بات کا بڑا پچھتاوا تھا کہ میں رائفل نیچے چھوڑ آیا تھا۔ ورنہ اب تک اس خبیث کو بھون چکا ہوتا۔ بہرکیف میں تیزی سے زینے کی طرف لپکا۔ میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ رائفل سے اس موذی کا کام کر دوں گا اور اس کی لاش کسی ویرانے میں پھینک دوں گا تاکہ شکاری اسے ہڑپ کر لیں۔

بوسیدہ زینہ طے کر کے جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہاں رائفل موجود نہیں ہے۔ ٹارچ اور شکاری تھیلا جوں کا توں اپنی جگہ رکھا ہوا تھا۔ میں نے بڑی تیزی سے پورا کمرا تلپٹ کر کے رکھ دیا تھا کہ جتنا جلد ہو سکے رائفل لے کر پہنچوں اور اسے درندے کو بھون دوں۔ رائفل کا کہیں پتا نہیں تھا۔ میں خاصا فکرمند اور پریشان ہو گیا۔ یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ اس لیے بھی کہ رائفل کی گم شدگی سے میں نہتا ہو گیا تھا۔ اس کے بغیر بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ آخر رائفل کہاں چلی گئی اور اسے کون اٹھا کے لے گیا۔ کہیں شاید کوئی بدروح لے گئی ہو؟ لیکن کس لیے؟ وہ کس کام آ سکتی ہے؟ وہ تو غیر مرئی ہوتی ہے۔

رائفل کی تلاش میں ناکامی کے بعد میں نے حوصلہ نہیں ہارا۔ میں نے خالی ہاتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ہر صورت میں اس معصوم اور نازک اندام مظلوم لڑکی کی ہر قیمت پر مدد کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی جان کی نہیں بلکہ اس کی عزت کی چنتا ہو رہی تھی۔ میں نے سوچ ہی لیا تھا کہ پتھروں کی ضربات سے دروازے کے قفل کو توڑ دوں گا اور اس خبیث سے مقابلہ کروں گا۔ چاہے مجھے اپنی جان کا دان ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ گو وہ لڑکی اجنبی تھی۔ لیکن مظلوم اور بے بس تھی۔

زینہ طے کر کے جب میں اس خوف ناک کمرے کے نزدیک پہنچا تو اندر سے چپڑ چپڑ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ یہ آوازیں قطعی غیر انسانی تھیں اور یوں محسوس ہوتا تھا گویا کوئی درندہ اپنے تازہ شکار پر ہاتھ صاف کر رہا ہو۔ میں نے پتھروں پر چڑھ کر اندر جھانکا تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں سرتاپا

Pakistanipoint.com

کانپ اٹھا تھا اور میرا دم جیسے گھٹ کر رہ گیا تھا۔ اس سے کا منظر بڑا دل خراش اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔ وہ ستم رسیدہ لڑکی کمرے کے وسط میں بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے بکھرے بال اور فطری حالت بتا رہی تھی وہ بے حرمتی کا نشانہ بن چکی ہے..... اس کے جسم پر جگہ جگہ خراشیں بڑی گہری نظر آ رہی تھیں..... اور وہ سیاہ ناگ بھی اس کے قریب ہی موجود تھا اور اس کے جسم کے مرطوب حصوں کو اپنی دوشاخی زبان سے چاٹ رہا تھا۔

دوسری طرف وہ شیطان شقی القلب انسان ستون کے ساتھ بندھی ہوئی لڑکی کا گوشت اپنے دانتوں سے کاٹ کر بڑی تیزی سے چبا رہا تھا۔ اس وقت اس کی شکل ایسی بھیانک اور مکروہ نظر آئی کہ سر کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں اور دانت کافی بڑے اور خوں خوار، تیز اور نوکیلے ہو کر ہونٹوں سے باہر نکل آئے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بھی موٹی، لمبی، بھدی اور بدوضع ہو گئی تھیں۔ اب ان میں لمبے اور تیز ناخن بھی ایسے دکھائی دیتے تھے وہ کوئی تیز دھار کی چھریاں ہوں۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑکی کے جسم کا ایک چوتھائی گوشت مزے لے لے کر چٹ کر گیا۔ اس وقت اس کی کیفیت ایک خوفناک درندے سے ہرگز مختلف نہیں تھی۔ اس دوران لڑکی کئی بار ہوش میں آئی تھی اور تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے کرب ناک چیخیں نکل پڑی تھیں لیکن درد کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئی تھی اور اب تو وہ یقیناً مر چکی تھی اس بات میں کسی شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا..... خصوصاً نرم حصوں پر تو گوشت کا نام و نشان تک باقی نہ رہا تھا اور اندر سے گلابی گلابی ہڈیاں جھانک رہی تھیں۔

درندہ صفت انسان خوب سیر ہو چکا تھا۔ کیوں کہ وہ لڑکی کی لاش کے قریب سے ہٹ آیا تھا۔ وہ فاتحانہ انداز سے کھڑا ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ اس نے نہ صرف لڑکی کی آبرو لوٹی تھی بلکہ اس کا کومل بدن بھی مزے لے لے کر کھایا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایسی مکروہ تھی کہ وہ اور بھیانک چہرے کا دکھائی دینے لگا تھا۔

اس نے اپنے ہونٹوں پر کسی سانپ کی طرح زبان پھیرتے ہوئے یکا یک تین بار تالی بجائی اور چشم زدن میں سینکڑوں سانپ نہ جانے کہاں سے نکل پڑے چھوٹے بڑے اور لمبے لمبے بھی تھے۔ وہ مختلف رنگوں اور نسل کے بھی تھے۔ جتنے خوف ناک تھے اس سے زیادہ خطرناک بھی لگتے تھے۔ ان کی زبانیں تیزی سے لپک رہی تھی اور کلبلاتے ہوئے لڑکی کی تلاش کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہی لڑکی کی مسخ شدہ لاش پر ٹوٹ پڑے اور اس کے جسم کا گوشت نوچ نوچ کر کھانے لگے۔

کچھ دیر بعد وہاں فرش پر ہڈیوں کا ڈھانچا پڑا تھا۔ لڑکی کے جسم کا پورا گوشت ان آدم خور سانپوں کے معدے میں اتر چکا تھا۔

میں حیرت کا مجسمہ بنا ہوا یہ تمام منظر دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ اپنی ذات تک کو فراموش کر چکا تھا۔ مجھے اس بات کا بہت غم تھا کہ میری نظروں کے سامنے دو مظلوم لڑکیاں ان عفریتوں کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں اور میں کچھ نہ کر سکا تھا۔ رائفل میرے پاس موجود نہیں تھا۔ البتہ شکاری چاقو میری جیب میں پڑا ہوا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ دروازہ مقفل تھا اور میں کسی طور اندر نہ جا سکتا تھا۔ اب یہ تو سراسر حماقت تھی کہ میں رات کے سناٹے میں قفل توڑنے کی کوشش کروں اور ان خبیثوں کو اپنی موجودگی کی خبر کر دوں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرے جسم کا گوشت بھی چٹ کر جائیں۔

مجھے ان پر غالب آنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی ضرورت تھی۔ کیوں کہ میرا مقابلہ کسی انسان سے نہیں تھا بلکہ میں بدروحوں میں گھر گیا تھا یا پھر وہ کوئی نادیدہ مخلوق تھی جو انسان کے علم اور تجربے سے دور تھی۔

کمرے میں ایک بھیانک سناٹا کسی آسیب کی

... آ... لا تھا۔

...لے چند لمحوں کے بعد خود پر قابو پا کر اندر جھانکا لڑکی کا ڈھانچا اپنی جگہ پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی ایک سانپ بھی موجود نہیں تھا۔ وہ دوسری لڑکی ابھی تک بے ہوش تھی۔ وہ ملعون بے سدھ اس کے نزدیک پڑا ہوا تھا...... اس کا منہ کسی مگرمچھ کی طرح بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس کا پیٹ بھی بہت پھولا ہوا نظر آیا جو اس کے سانس لینے سے بڑے کراہت آمیز انداز میں اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

میرے دل میں نفرت، غصے اور حقارت کی لہر اٹھی تو دل میں آئی کہ اس پر چاقو پھینک کر مار دوں جیسا کہ شکار کھیلنے کے دوران رائفل میں گولیاں نہیں ہوتی تھیں تو پھر میں جیب سے شکار چاقو نکال کر انہیں نشانہ بناتا تھا۔ کبھی میرا نشانہ خطا نہیں ہوا تھا۔ میں کوئی پندرہ سولہ درندوں کو نشانہ بنا چکا تھا...... ایک اور واقعہ ایک گاؤں کے جنگل میں شکار پر جا رہا تھا۔ ندی کنارے جیپ روک کر اترا تا کہ انجن میں پانی بھرنے کے لیے کین بھر لوں۔ میں جیپ سے کین نکال رہا تھا کہ ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔ بچاؤ، بچاؤ میں نے مڑ کے آواز کی سمت دیکھا تو ایک سولہ برس کی خوب صورت اور پرکشش لڑکی کو دیکھا جو تیزی سے دوڑتی آ رہی تھی۔ اس کا لباس تار تار ہو چکا تھا۔ وہ بری طرح خوف و دہشت سے لرز رہی تھی۔ میں نے دو بدمعاشوں کو دیکھا جو اس کے تعاقب اندھا دوڑتے آ رہے تھے۔ ایک بدمعاش کے ہاتھ میں خوف ناک قسم کا خنجر تھا۔ دوسرے بدمعاش کے ہاتھ میں لڑکی کا پھٹا ہوا لباس تھا۔ لڑکی میرے عقب میں آ کر کھڑی ہو گئی اور ہیجانی لہجے میں بولی یہ میری آبرو کے دشمن ہیں مجھے اغوا کر کے یہاں لے آئے ہیں۔

اتنی مہلت نہیں تھی اور نہ ہی سمے تھا کہ میں جیپ سے رائفل نکالتا لڑکی کو ایک طرف ہٹا کر...... ان بدمعاشوں اور ہمارے درمیان فاصلہ پل پل کم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بدمعاش جو مسلح تھا بے حد خطرناک اور پیشہ ور قاتل دکھائی دیتا تھا۔ اس کا اندازہ اس خنجر سے ہو گیا تھا جو اس نے تھام رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر سفاکی اور درندگی آنکھوں میں سے جھانک رہی تھی۔ میں شکاری تھا۔ کبھی میرا واسطہ اور مقابلہ مجرموں اور قاتلوں سے نہیں ہوا تھا۔ میں نے فوراً شکاری چاقو جیب سے نکالا۔ پھر اس کا نشانہ لے کر اس کے سینے کو دل کی جگہ کا نشانہ بنایا۔ چاقو کسی سنسناتے ہوئے تیر کی طرح اس کی سینے میں اتر گیا۔ یہ چاقو بہت خطرناک تھا۔ اس کی دھار اتنی تیز تھی کہ شیر کی گردن بھی گاجر مولی کی طرح کاٹ سکتی تھی۔ اس چاقو سے میں نے ایک زخمی مادہ تیندوے کی گردن کاٹ دی تھی۔ وہ زمین پر گرا۔ اس کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر گرا۔ اسے تڑپنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ وہ موت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس کے ساتھی نے وہ خنجر اٹھا لیا۔ پھر اس نے فضا میں لہراتے ہوئے کہا کہ تم نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا۔ میں تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔ اس لڑکی کو ہر قیمت پر لے جاؤں گا۔ اسے اغوا کرنے کے لیے دس دن سے ہم راہ دیکھ رہے تھے۔ ایسا مال بار بار کیا خواب میں بھی نہیں ملتا ہے...... اتنا کہہ کر میری طرف حملہ آور ہونے کے لیے بڑھا۔ میں نے لڑکی کو ایک طرف ہٹایا۔ اس نے تاک کر خنجر سے میرے سینے کا نشانہ لیا اور اگر میں فوراً جھکائی نہ دیتا تو میں بھی اس خنجر کی زد میں آ جاتا۔ اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ وہ سنسناتا ہوا سر پر سے گزر گیا۔ میں مشتعل ہو گیا۔ میں نے ایک پتھر اٹھا لیا تو وہ کسی کتے کی طرح دم دبا کر بھاگا۔ میں نے خنجر اٹھا لیا اور اس کا تعاقب کرنے لگا اور اس نے بھاگتے بھاگتے جو پلٹ کر دیکھا تو خنجر اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ وہ پیٹ پکڑ کر زمین پر گرا۔ اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں تھیں۔ وہ بے ہوش ہو گیا یا مر گیا کچھ پتا نہ چل سکا۔ لڑکی ایک جگہ کھڑی خوف و دہشت سے کانپ رہی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنا شکاری چاقو اس کے سینے سے نکال کر اس پر جو خون لگ چکا تھا اس کے کپڑوں سے صاف کیا۔ لڑکی فطری حالت میں تھی۔ میری جیپ

میں میرا ایک لباس رکھا رہتا تھا۔ میں نے اسے وہ پہننے کے لیے دیا۔ پھر اس کے گھر چھوڑ گیا۔ میرا دل جانتا ہے کہ ایک لڑکی کی آبرو بچا کے مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ اگر پولیس کے کانوں میں بھنک پڑ گئی تو ہم دونوں کی شامت آجائے گی۔ وہ نہ صرف تمہاری آبرو بچا لی کرنے اور مجھ سے مال کھانے کے لیے اس واقعہ کو نیا رنگ دے دیں گے۔ لڑکی نے میری بات پر اعتماد کیا۔ اس لڑکی کی منگنی ہو چکی تھی۔ اگر یہ واقعہ منظر عام پر آتا تو اس کی شادی نہ ہو پاتی..... میں نے اس لڑکی کی شادی میں شرکت بھی کی تھی۔

میں چاقو سے نشانہ لے کر اسے اس لیے قتل نہیں کر سکتا تھا کہ روشن دان کی سلاخیں ایک دوسرے سے اتنی نزدیک تھیں کہ چاقو کا نشانہ ٹھیک نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے درمیان سے اندر ہاتھ گھس نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ضروری بھی نہیں تھا کہ چاقو اس کے جسم کے کسی حصے پر لگ بھی جاتا تو ضروری نہیں تھا کہ وہ ہلاک ہو جاتا۔ ایک تو وہ دیو قامت تھا اور اس کا جسم پتھر کی طرح سخت بھی تھا۔ چناں چہ خطرات کو دعوت دینے کی بجائے نیچے اتر آیا۔ اس سے سپیدہ سحر نمودار ہو چکا تھا۔ لیکن موسم کی طغیانی کا وہی عالم تھا جو ایک نوجوان لڑکی کا ہوتا ہے۔ بے بسی سے دروازہ پر نظر ڈالی اور پھر زینے کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے کا دروازہ میں شاید عجلت میں کھلا چھوڑ گیا تھا لیکن جب واپس پہنچا تو دونوں پٹ بھڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے ہوا کے تھپیڑوں سے دروازہ بند ہو گیا ہو۔ پھر میں دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میرے بڑھتے ہوئے قدم اچانک رک گئے۔ سنگار میز کے پاس وہی نازک اندام جواں سال عورت کھڑی تھی۔ لیکن وہ ایک لمحے کے لیے نظر آئی تھی۔ کیوں کہ بلب کی روشنی کی طرح اچانک نظروں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی تھی اور میں مبہوت کھڑا رہ گیا تھا۔ وہ جو دوبارہ پھر ایک لمحے کے لیے نظر آئی تو اس کے سراپا، نشیب و فراز کی دل کشی اور جاذبیت نے میرے دل پر بجلی گرا دی تھی۔

میں کچھ دیر تک اس کے سحر میں کھویا رہا اور ساکت و جامد کھڑا رہا۔ پھر معلوم نہیں وہ جاگتے کا سپنا تھا۔ یا وہم، یا اس کے قرب سے ایسا محسوس کیا تھا؟ اس نے میرے نزدیک آ کر میرے گلے میں اپنی مرمریں، سڈول اور گداز عریاں بانہیں میرے گلے میں حائل کر دیں۔ اس کی مستی بھری سیاہ آنکھوں کی گرفت میں میرا چہرہ تھا..... اس کے عارض پر پھول کھلے ہوئے تھے اور شیریں لبوں پر تبسم کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ اس کی مہکتی سانسیں میرے چہرے کو جھلسائے دے رہی تھیں۔ پھر وہ میری آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ میں اس کی ان آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔ پھر وہ میرے چہرے پر خود سپردگی اور والہانہ انداز سے جھک گئی۔ جانے کتنی دیر تک میرے ہونٹ ایک عجیب سی خوشبو سے بندھے رہے۔ اس کے گداز بدن سے پھوٹتی سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک میرے دماغ کو معطر اور دل کو فرحت بخشتی رہی۔ سندر سپنے کی دنیا سے نکل کر میں نے اس کی نازک لچکیلی اور گداز کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ اسے انجانے راستے سے پیار کی وادی میں لے جاؤں اور دنیا و فیہا سے ایسے بے نیاز ہو جائیں کہ کسی بات اور واپسی کا خیال اور ہوش نہ رہے لیکن وہ اس طرح سے گرفت اور نظروں سے اوجھل ہو گئی بلب کی روشنی کی طرح..... لیکن یہ نہ تو سپنا تھا۔ وہم تھا اور نہ خیال..... کیوں کہ اس کا اچھوتا، لطیف اور انوکھا لمس میں اپنے وجود میں محسوس کر رہا تھا۔ میرے ہونٹ جس مٹھاس سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کے قرب سے میرے سارے بدن میں خون رقص کر رہا تھا۔

میں کچھ دیر تک بے حس و حرکت تو کھڑا رہا لیکن میری جذباتی کیفیت برقرار تھی۔ معاً میری نظروں نے اس خیال سے کمرے کا جائزہ لیا کہ میں خود بے خود اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا اور اس نے شاید

یہ محسوس کیا ہوگا کہ میں جذبات کے اس طوفان میں حد سے تجاوز کر کے باہم پیوست نہ ہو جاؤں تو وہ غیر محسوس انداز سے الگ ہو کر کمرے میں شاید کسی جگہ کھڑی مسکرا رہی اور مجھے شوخ نظروں سے نہ دیکھ رہی ہو اسی لیے میری نظریں کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔ گو اس کا وجود نہیں تھا لیکن جوان سال بدن کی مہک بول رہی تھی کہ میں اس کمرے میں ہی موجود ہوں.....

لیکن جب میری نظریں کمرے میں اسے ڈھونڈتی اور جائزہ لیتی ہوئی مسہری تک پہنچ گئیں تو پھر ایک بار میں بڑے زور سے اچھل پڑا۔

رائفل مسہری کے نزدیک دیوار کے سہارے ٹکی ہوئی رکھی تھی۔ اور بالکل اسی جگہ اور اسی پوزیشن میں جہاں اسے میں نے چھوڑا تھا۔ او بھگوان..... میں کس جگہ پھنس گیا۔ کس آفت میں اور کس افتاد میں؟ میں حیرت، خوف اور کرب سے سوچنے لگا۔ میں نے ایک طرح سے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے یا یوں کہنا مناسب ہوگا کہ میں نے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ یہاں تو قدم قدم پر حیرتوں کے سمندر موج زن ہیں.....اس عورت کا نظر آنا.....ہم آغوش ہونا میرے چہرے اور ہونٹوں کو اپنے لب شیریں سے باندھ دینا اور پھر اچانک غائب ہو جانا، گدھے کے سر کے سینگ کی طرح، میرے لیے معجزے سے کم نہیں تھا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شاید رائفل کی گمشدگی کا تعلق بھی اس کی ذات سے ہے۔

مگر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس حرکت سے اس نے کیا مقصد حاصل کیا ہے؟ اگر واقعی اس کا کوئی وجود ہے تو کھل کر سامنے کیوں نہیں آئی.....! آخر اسے کس بات کا خوف اور اندیشہ ہے؟ لیکن یہ قاتلہ میرے ساتھ جو آنکھ مچولی کھیل رہی ہے اس سے میرے اعصاب بری طرح کشیدہ ہو رہے تھے۔

میں یہی کچھ سوچتا اور اس قیامت کو چشم تصور میں دیکھتا مسہری پر لیٹ گیا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ جسم کا ایک ایک عضو بری طرح دکھ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے ذہن کو ہر قسم کے تفکرات اور پریشانی سے آزاد کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ قیامت چشم تصور میں اپنی تمام حشر سامانیوں سے ابھر آئی اور وہ میرے چہرے پر جھکی اس کے چہرے کا طول عرض بڑھتا گیا۔ لیکن نیند کی دیوی کو گوارا نہ ہوا کہ میں بہک جاؤں۔ اس نے فوراً ہی مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

جب میں بیدار ہوا تو سہ پہر کے تین بج رہے تھے۔ میں نے ایک طویل جماہی لی اور پھر بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میری نظر میز پر پڑی جہاں اس سے پھر ایک منقش رکابی میں پھل اور دودھ سے بھرا گلاس رکھا تھا۔ میں تو بھوکا تھا ہی۔ یہ پھل بھی بڑے رسیلے اور پکے ہوئے تھے اور ان میں ایسی لذتیت تھی کہ نہ صرف میں نے دودھ پی لیا بلکہ پھل کھا بھی لیا شکم سیر ہونے کے باوجود..... دل چاہ رہا تھا کہ کاش اور پھل ہوتے۔ کیوں کہ ان پھلوں اور اس نے میرے اندر خاصی توانائی پیدا کر دی تھی۔

باہر آب بھی بادلوں کی گھن گرج کا شور برپا تھا۔ میں اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور باہر جھانک کر دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے پانی کی تیز بوچھاڑ میرے چہرے پر پڑی۔ بارش اس وقت موسلا دھار ہو رہی تھی اور ان حالات میں میرے لیے اس خوف ناک مقام کو چھوڑ دینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا اور دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔

بارش رات گئے تک اسی انداز سے ہوتی رہی تھی اور پھر شاید دس بجے تک پانی برسنا بند ہو گیا۔ میں دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور ٹارچ کی روشنی میں اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ میری ٹارچ کافی طاقت ور تھی اور پچاس گز کی دوری تک آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا اور شاید وہ پچاس گز کا فاصلہ تھا جہاں میں نے اس پراسرار ہفت رنگی خرگوش کو بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک شکستہ دیوار کے نزدیک بیٹھا ہوا تھا اور شاید میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں تو پہلے ہی اس نامعقول خرگوش سے

کی تلاش میں تھا اور اس کے تعاقب میں اس دہشت ناک مقام تک پہنچا تھا اور وہی میری تمام مشکلات کا ذمے دار تھا اور اس نے مجھے ایسے مصائب کے دلدل میں گرا دیا تھا کہ اس میں سے میں نے جتنی نکلنے کی کوشش کی اتنا ہی دھنستا چلا گیا تھا۔ میرے اندر غصے کی لہر اٹھی تو تیزی سے اس کی طرف بڑھا لیکن میرے نزدیک پہنچتے ہیں اس نے ایک جست لگائی اور کھنڈر میں پراسرار انداز میں غائب ہو گیا۔

میں بھی ٹارچ روشن کیے ہوئے اس کے پیچھے لپکا اور ایک بار پھر اس کی تلاش شروع کر دی۔ کیوں کہ میرا خیال تھا کہ وہ یقیناً کھنڈر میں ہی چھپا ہوا ہو گا۔ اسے روپوش ہونے کے لیے کتنی جگہ درکار ہو گی۔ کیوں کہ وہ ایک چھوٹا سا جانور جو ہے۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اسے ہر قیمت پر تلاش اور پکڑ کے رہوں گا۔ بھیانک سناٹے میں ویران کھنڈر پر ہیبت دکھائی دیتا تھا۔ بجلی چمکتی تو ٹوٹے پھوٹے در و دیوار اور شکستہ چھتیں ماحول کو اور دہشت ناک بنا دیتیں۔ دراصل عمارت کا یہ حصہ بری طرح متاثر ہوا تھا اور مکمل طور پر کھنڈر بن چکا تھا۔ جگہ جگہ ملبے کے بے ترتیب ڈھیر نظر آئے تھے۔ بس کہیں کہیں دیواریں اکا دکا صحیح سالم دکھائی دے رہی تھیں۔ ورنہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس مقام پر کبھی ہولناک زلزلہ آیا اور اس نے عمارت کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہو۔

میں کافی دیر تک کھنڈر کے اندر خرگوش کی تلاش میں فوراً اور پریشان ہوتا رہا۔ لیکن وہ کم بخت گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہو گیا۔ میں مایوس اور ناکام ہو کر لوٹنے والا ہی تھا کہ ایک ملبے کے ڈھیر کے نزدیک بیٹھا ہوا نظر آ گیا۔ وہ جگہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں تیز دوڑ کر بہت جلد وہاں پہنچ گیا لیکن خرگوش ایک بار پھر جل دے کر میرے ہاتھ نہ آ سکا تھا۔ کیوں کہ کہیں اس کا پتا نہیں تھا اب تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ گویا وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہے جو فضا میں تحلیل ہو جانے کی قوت رکھتا ہو۔ میں نے جوں ہی ملبے کے ڈھیر کی طرف دیکھا اور مجھے وہاں ایک خلا سا نظر آیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ خرگوش اس کی اندر گھسا ہے۔ میں نے جھک کر ٹارچ کی روشنی میں اس جگہ کا جائزہ لیا اور اچھل پڑا۔ شکستہ زینہ میری نظروں کے سامنے تھا۔ وہ غالباً کوئی تہ خانہ تھا جس کا راستہ ملبے کے ڈھیر میں دب چکا تھا لیکن اتنی جگہ باقی تھی کہ ملبہ ہٹا کر ایک آدمی آسانی سے اندر داخل ہو سکے۔ چناں چہ میں نے جلدی جلدی اس جگہ سے ملبے کو صاف کیا اور جب راستہ ذرا کشادہ ہو گیا اور اندر اترنے کا مرحلہ آیا تو مجھ پر کس قدر دہشت طاری ہو گئی۔ میں سوچنے لگا کہ اندر داخل ہوا جائے یا نہیں.....اور بھگوان جانے کس قسم کے حالات سے واسطہ پڑے۔ پھر آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ جب اس طلسم خانے کے بیشتر مراحل سے گزر چکا ہوں تو کم از کم اس تہ خانے کی حقیقت کا پتا بھی ضرور چلانا چاہیے۔ میں نے ایشور کا نام لیا اور تہ خانہ میں اتر گیا۔

سیڑھیاں کافی گہرائی تک چلی گئی تھیں۔ کہیں کہیں زینہ بہت تنگ اور شکستہ تھا اور درمیان میں کئی سیڑھیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ میں بہت سنبھل سنبھل اور محتاط ہو کر نیچے اترنے لگا اور کچھ دیر بعد آخری سیڑھی عبور کر کے ایک ایسے حال میں پہنچ گیا۔ جہاں سامنے پلاسٹر شدہ لیکن جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی دیوار تھی۔ البتہ دائیں بائیں یعنی مخالف سمتوں میں دو دروازے نظر آئے تھے۔ وہ دونوں بند تھے۔

یہ جگہ ایک طویل راہ داری کی مانند تھی۔ دونوں کمروں کا فاصلہ اس جگہ سے پچاس پچاس قدم ضرور رہا ہو گا۔ بائیں جانب تاریکی تھی لیکن سیدھے ہاتھ والے دروازے سے روشنی باہر نکل رہی تھی اور جس کا مقصد تھا کہ اندر یقیناً کوئی موجود ہے۔ میرے قدم بے اختیار روشن والے دروازے کی طرف اٹھنے لگے۔ اس تاریک اور ہولناک تہ خانے میں یہ روشنی میرے لیے شدید حیرت کا باعث تھی۔ میں جوں جوں دروازے کے نزدیک ہو رہا تھا میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ اس سمے مجھ پر بری

طرح گھبراہٹ طاری تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ دیکھیے کیا کیا افتاد مجھ پر آن پڑتی ہے؟ بہرحال میں ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ اس کے سوا چارہ نہیں تھا اور یہ ایک طرح کی بے بسی اور مجبوری بھی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ موت صرف ایک مرتبہ آتی ہے اور آدمی اس سے کہیں اور کبھی نہیں بچ سکتا ہے۔

ابھی میں دروازے کے نزدیک نہیں پہنچا تھا کہ اچانک ٹھٹک کے رک گیا۔

اندر سے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں غور سے آواز کو سننے لگا۔ وہ نسوانی آواز تھی اور بڑی غم ناک تھی اور پر درد بھی تھی جس نے میرے وجود کو جیسے دہلا دیا تھا۔ لیکن الفاظ میری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ الٹے قدموں واپس لوٹ جاؤں..... لیکن پھر خیال آیا کہ جب یہاں تک پہنچ ہی گیا ہوں تو کیوں نہ اس طلسم سے ساری حقیقت معلوم کرلوں۔ میں نے واقفیت جانے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔

پھر میں دبے پاؤں اور بے آواز آہستہ آہستہ بڑھا۔ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا لیکن ان سسکیوں کی آواز بند ہو گئی تھی۔ ہر طرف ہیجان انگیز سناٹا طاری تھا اور مجھے اپنے دل کی تیز دھڑکن نہایت واضح اور صاف سنائی دے رہی تھی۔ بہرکیف میں نے آئندہ پیش آنے والے واقعات کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا اور بہت آہستہ سے دروازے کو آگے کی جانب دھکیلا۔ میں نے اپنے جسم کی ساری طاقت بھی یک جا کر کے اور دل اور مضبوط کرلیا تھا۔

دروازہ بند نہیں تھا۔ وہ دل کو لرزا دینے والی چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ ابھی دروازے کے پٹ پوری طرح وا نہیں ہوئے تھے کہ میں ایک بار پھر حیرتوں کے طوفان میں گھر گیا۔ میری نظروں کے سامنے ایک عجیب اور تحیر آمیز منظر تھا جس نے میرے جسم اور روح کو بری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

کمرا خاصا طویل تھا لیکن کسی قید خانہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اگر عقوبت خانہ کہا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ کمرے کے وسط میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخوں کا بنا ہوا ایک بہت بڑا پنجرہ ایستادہ تھا جیسا کہ عموماً خوف ناک درندوں کے لیے چڑیا گھروں میں ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس پنجرے میں کسی درندے کے بجائے ایک نوخیز اور نہایت حسین دوشیزہ تھی جو بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسی ناری سینکڑوں میں نہیں لاکھوں میں ایک ہوتی ہے۔ پابہ زنجیر تھی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے نچا ہوا تھا جہاں سے اس کا پرشباب گداز سفید بدن جھانک رہا تھا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ دراز زلفیں اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھیں۔

مجھے وہ لڑکیاں یاد آ گئیں جنہیں اس دیوقامت شخص نے جو شیطان تھا اپنی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا وہ مر چکی تھیں۔ وہ اس لڑکی کو شکار کر کے لایا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جو وہ مرر ہی تھی شاید اسی شیطان نے اس لڑکی کی آبرو خاک میں ملا دی تھی۔ یا پھر من مانیاں اور دست درازیاں کر کے شاید کہیں گیا ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد لڑکی نے رونا بند کر دیا تھا۔ اب وہ اس کمرے میں پنجرے میں قید تھی۔ اس خون آشام بھیڑیے نے اسے اس بڑے سے پنجرے میں اس لیے قید کیا ہو گا کہ اس سے کسی کھلونے کی طرح کھیلتا رہے۔ اندر سے پنجرہ مقفل کرلے گا تاکہ لڑکی فرار نہ ہو سکے۔

میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونک پڑی۔ اس نے اپنی لانبی لانبی سرگیں پلکیں اوپر اٹھائیں تو میں نے دیکھا اس کے نین بہت خوب صورت، چمک دار اور گہرے سیاہ ہیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی زنجیروں سے رقصاں سناٹے میں جھنکار پیدا ہو گئی تھی جس کی بازگشت کافی دیر قائم رہی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی سلاخوں کے نزدیک آ گئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر نہ تو حیرت اور نہ ہی تجسس سا تھا میں نے بھی اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا سارے جہاں کا حسن سمٹ کر اس پنجرے میں

مقید ہو گیا ہو۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس سے زیادہ حسین اور پرشباب عورت سپنوں میں بھی نہیں دیکھی۔ حالاں کہ اس سنسار میں کبھی بھی حسین لڑکیوں عورتوں کی کوئی نہیں رہی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی لڑکی عورت اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے۔ اگر سنسار میں پریوں کا کوئی وجود ہے تو وہ ایک روایتی پری کے مماثل تھی اور اس کا حسین بے مثال چودھویں کے چاند کو بھی شرما دینے والا تھا لیکن اس کے چہرے سے حزن و ملال ہویدا تھا۔ اس کی آنکھیں پرنم اور سوجی ہوئی تھیں۔ پھول سے نازک گلابی رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سوچا سسکیوں کی آواز بھی یقیناً اسی لڑکی کی تھیں۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ آخر کسی شقی القلب، بدذوق اور بے رحم انسان نے اس حسن و شباب کے پیکر کو اس اجاڑ تہ خانے میں لا کر مقید کر دیا ہے۔ یہ کھنڈر تو لڑکیوں کا مرگھٹ معلوم ہو رہا تھا جہاں حسین اور نوجوان لڑکوں کو دل بستگی کے لیے لایا جاتا تھا۔

دفعتاً لڑکی کے گداز شیریں اور تراشیدہ ہونٹ ہلے۔ گہرے سکوت میں مترنم اور مدہوش کن آواز گونجی۔ لڑکی نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے مخاطب کیا اور کہہ رہی تھی۔

''آخر تم آ گئے ہو اجنبی .....! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا؟''

''میرا انتظار.....؟'' میں چونک پڑا۔ مجھے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔ ''تم مجھے کیسے جانتی ہو؟''

''جانتی ہوں.....اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ایک مایہ ناز اور بہترین اور مانے ہوئے شکاری ہو.....تمہیں کون نہیں جانتا.....اور ہاں تمہاری وجہ شہرت تمہارا نشانہ ہے۔ تمہارا نشانہ بڑا سچا ہوتا ہے۔''

''خوب .....تمہاری معلومات کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے.....لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس پنجرے میں کسی نے قید کیا ہے؟ اور تم کس مصیبت میں گرفتار ہو؟''

''آہ .....! یہ ایک الم ناک داستان ہے۔'' لڑکی کی آواز بھرا آئی۔ ''اگر تم میری مدد کا وعدہ کرو تو میں تمہیں اپنی دردانگیز داستان سناؤں جسے سن کر تمہارا کلیجہ منہ کو آ جائے گا۔''

''ضرور.....'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''میں ایک مجبور و بے کس عورت کی عزت آبرو اور زندگی بچانے کی خاطر موت سے بھی ٹکر لے سکتا ہوں .....اگر میری جان تمہارے کام آ گئی تو بڑی خوشی ہو گی۔''

لڑکی نے تشکر آمیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر کہنے لگی۔

''دنیا میں دو قومیں ہیں جو بڑی پراسرار اور نادیدہ قوتوں کی مالک ہیں۔ ایک جنات ہیں اور دوسری راکھشش ہیں۔ میں راکھشش قوم سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا نام نتانہ ہے اور میں اپنے قبیلے کا ریولو کے سردار کی بیٹی ہوں۔ ہمارے رسم و رواج کے مطابق سردار کی بیٹی سے صرف وہی شادی کر سکتا ہے جو سب سے زیادہ طاقت ور اور غیر معمولی نادیدہ قوتوں کا مالک ہو۔ کیوں کہ سردار کے دیہانت کے بعد سردار کے بیٹے کو منصب نہیں ملتا بلکہ بیٹی کے پتی کو بنا دیا جاتا ہے۔''

''اگر سردار کی کوئی بیٹی نہ ہو تو.....؟'' میں نے سوال کیا۔

''اس صورت میں قبیلے کے سب سے بہادر نوجوان کو سردار بنا دیا جاتا ہے۔'' نتانہ بتانے لگی۔ ''کیوں کہ اس طرح سرداری کسی ایک گھر کی لونڈی بن کر نہیں رہ جاتی۔ میرے قبیلے کا سب سے بہادر شخص شالوتھا۔ وہ قانون کے مطابق میرا دعوے دار تھا۔ لیکن وہ نہایت بدشکل، عیار اور بدکردار تھا راکھشش تھا۔ بدی اس کی فطرت کا خاصہ تھی۔ جہاں بھر کی برائیاں اس کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھیں اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ نادیدہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے اور ایک تناور درخت کو انگلی کے اشارے سے اکھاڑ سکتا ہے۔ وہ کئی مرتبہ اس قسم کے

مظاہرے بھی کر چکا تھا اور یہ کہ ہر کسی کے دل میں اس کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ قبیلے کے لوگ اس سے خوف زدہ اور پریشان تھے اور جہاں دیدہ افراد کا کہنا تھا کہ وہ کالے جادو کا ماہر ہے اور اس کے قبضے میں پراسرار قوتیں ہیں۔ خود میرا باپ بھی اس سے مرعوب اور حد درجہ خائف تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا اور اس کی سرداری شانو کے بل پر چل رہی تھی۔ شانو کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں تھی۔ وہ فقط سردار بننے کے لیے مجھ سے شادی کا خواہش مند تھا۔ جب کہ میرا باپ بھی اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مجھے اس کے پلے باندھ دینے کے درپے تھا۔''

''کیا تمہارے قبیلے میں کوئی ایسا نوجوان موجود نہیں تھا جو شانو کو چیلنج کرتا؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''قبیلے میں ایک سے ایک بہادر موجود تھا۔'' نتانہ کہنے لگی۔ ''لیکن شالو کی پراسرار قوتوں کا مقابلہ کرنے کی کسی میں ہمت اور تاب نہیں تھی۔ یوں تو ہماری قوم میں کون ایسا تھا جو جادو منتر کا علم نہ جانتا ہو لیکن بہت ہی عام قسم کا..... قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق کوئی راکھشش اپنی شجاعت کے بل پر اپنی امیدواری کا اعلان کرتا تو کوئی دوسرا راکھشش اسے چیلنج کر سکتا تھا۔ لیکن شالو کے مقابلے میں کسی کو دم مارنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی غیر معمولی قوتوں کے ذریعے چشم زدن میں اپنے مقابل پر برتری حاصل کر لیا کرتا تھا۔ چناں چہ قبیلے بھر میں کسی نے اسے للکارنے کی کوشش نہیں کی اور وہ نہ صرف قبیلہ کی سرداری کے لیے منتخب ہو گیا بلکہ اسے یہ حق بھی حاصل ہو گیا کہ جب چاہے مجھے اپنی پتنی بنالے اور جو چاہے سلوک کرے۔ غرض میرے باپ نے مجھ سے بیاہ کا تذکرہ کیا تو میں بھڑک اٹھی۔ میں نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں شالو جیسے خبیث سے ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ میرے باپ نے مجھے بہت سمجھایا لیکن میں اپنی ضد پر قائم رہی ادھر شالو جیسے مسلسل شادی کا تقاضا کر رہا تھا اور جب اس کا دباؤ بڑھا تو میرے باپ نے مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ شالو نے ہزار جتن کیے اور اس نے جانے کیا کیا کوششیں نہیں کیں لیکن میرے دل میں جگہ نہ بنا سکا۔ وہ میرا من جیت نہ سکا۔ مجھے اس سے شدید نفرت تھی۔ میں اس کی صورت تک دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ راکھششوں کے دیوتاؤں کا تھا انسانی لڑکیوں عورتوں ہی کو نہیں بلکہ اپنی قوم کی بھی لڑکیوں عورتوں کو داغ دار نہ کیا جائے۔ لیکن اس نے کبھی اس پر عمل نہیں کیا تھا۔ اس لیے مجھے اس کی شکل سے خوف آتا تھا۔ میں اسے قریب آنے نہیں دیتی تھی اس لیے وہ میرے مسلسل انکار، مزاحمت اور جھڑکنے پر ایک دن وہ مشتعل ہو گیا اور تشدد پر اتر آیا۔ وہ مجھ پر نت نئے ظلم ڈھاتا رہا۔ اس کے باوجود بھی اسے کامیابی حاصل نہیں ہوئی تو مجھے اس تہ خانے میں لا کر قید کر دیا۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز میرے پاس آتا ہے۔ مجھے شادی کے لیے مجبور کرتا ہے اور میرے انکار کرنے پر طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا رہتا ہے۔ اس نے میری نگرانی اور ضروریات کی تکمیل کے لیے ایک راکھشش عورت متعین کر دی۔ لیکن وہ بھی اس درندہ صفت سے شدید نفرت کرتی ہے۔ کیوں کہ شالو نے اسے سبز باغ دکھا کر اس کی آبرو پامال کر دی تھی اور پھر اسے اپنی لونڈی بنا لیا تھا۔ چناں چہ اس وقت سے اس کے دل میں شالو کے لیے نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے وہ موقع کی منتظر ہے۔ انتقام لینے کے لیے بے چین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میری مدد پر آمادہ ہو گئی ہے۔ میری ہم درد اور غم گسار بن گئی ہے۔''

''مجھے نتانہ کی کہانی سن کر حیرت ہوئی کہ راکھششوں کی دنیا انسانی دنیا اور حالات سے مختلف نہیں ہے۔ جنات کے بارے میں بھی سنا ہوا تھا کہ ان میں جنات لڑکیاں عورتیں ہوتی ہیں اور ان کی نسل پروان چڑھ رہی ہے۔ یہی امر راکھششوں میں بھی تھا۔''

نتانہ کی گفتگو ابھی جاری تھی کہ معاً میری نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ میں اک دم سے چونک پڑا۔

وہی ہفت رنگی خوب صورت اور پیارا پیارا سا خرگوش دروازے پر موجود تھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اگر وہ میرے ہاتھوں میں آجاتا تو میں اس کے سر اور جسم پر ہاتھ پھیرتا اور چومتا بھی...... پھر نتانہ کے اشارے پر وہ آہستہ آہستہ چلتا پنجرے کے نزدیک رک گیا۔ دفعتاً وہ فرش پر لوٹنے لگا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے انسانی قلب اختیار کر لیا۔

اب میری نظروں کے سامنے ایک خوب صورت عورت کھڑی تھی۔ اس کی عمر تئیس بتیس برس کی ہوگی لیکن وہ متناسب بدن اور بلند قامت کے باعث اس قدر جاذبیت اور دل کشی تھی کہ نگاہ اس کی چہرے اور سراپا سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے شناسائی کا احساس ہوا۔ پھر مجھے اک دم سے یاد آیا کہ اس عورت کو اس کمرے میں سنگار میز کے پاس دیکھ چکا ہوں۔ میں نے اس کا قرب، سوندھی سوندھی خوشبو کی مہک، شیریں ہونٹوں کا لمس تصور میں محسوس کیا تھا اور پھر نظر جیسے ہی اس کے مرمریں، سڈول و گداز اور عریاں بانہوں پر پڑی تو مجھے اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں رہا کہ یہ وہی بازو ہیں جنہوں نے مجھے خون آشام چمگادڑوں سے بچالیا تھا۔

مجھے بھوچکا اور سکتے کی سی کیفیت میں دیکھ کر نتانہ دل کش انداز سے مسکرائی اور مترنم لہجے میں کہنے لگی۔

''یہ طوبیٰ ہے...... یہ وہی عورت ہے جسے شالو نے میری نگرانی پر مقرر کیا ہے۔ یہ میری ہی ایما پر جنگل میں گئی تھی اور اس نے تمہاری جیپ کو الٹ دیا تھا۔ تم اس کے کمرے میں رہائش پذیر ہو۔ رات جب تم سونے کے لیے بستر پر دراز ہوئے تو تمہارا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ اس نے تمہیں نیند کی حالت میں بے ہوش سا کر دیا اور تمہارے ہاتھ پیروں پر بدن سے مالش کرتی رہی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو تم [illegible] گہری نیند سو نہ پاتے......اور پھر تمہیں [illegible] وغیرہ فراہم کرتی رہی ہے...... لہٰذا اب [illegible] ان حالات میں تم میری کیا مدد کر سکتے ہو......؟''

''تمہاری مدد......؟'' میں گھبرا سا گیا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''تمہیں شالو کو ہلاک کرنا ہوگا؟''

''مجھے......؟'' میں نے کس قدر خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''میں ایک حقیر انسان ہوں۔ میں ایک ایسے راکھشش سے کیسے مقابلہ کر سکتا ہوں جو پراسرار قوتوں کا مالک ہے بلکہ یہی کم ہے کہ وہ راکھشش ہے۔''

''حوصلہ مت ہارو......'' نتانہ نے ہمت بندھائی۔ ''تم بھول رہے ہو کہ انسان ناقابل تسخیر ہوتا ہے۔ جن، بھوت، بدروحیں اور راکھشش انسان کا بال بیکا نہیں کر سکتے...... کیوں کہ انہیں ایشور کی آشیر باد ہوتی ہے۔ اگر تم انسانی قوتوں کو بروئے کار لاؤ شالو کو زیر کر سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں بہترین نشانہ باز ہوں۔ اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔''

''نہیں......'' نتانہ نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ''پستول، بندوق اور اس قسم کے دوسرے مہلک ہتھیار اس پر کارگر نہ ہوں گے۔ اسے ہلاک کرنے کے تمہیں کوئی اور طریقہ سوچنا ہوگا۔''

''جب وہ اتنا بڑا، ظالم اور بے رحم اور سفاک ہے تو تمہارا دیوتا اسے سزا کیوں نہیں دیتا؟'' میں نے تعجب سے کہا۔ ''کیا اسے اس کے کرتوتوں کی خبر نہیں اور نہ کوئی اس کے خلاف فریاد کرتا ہے؟''

''دیوتا کہتا ہے کہ تم لوگ خود اس سے نمٹو...... کیا تم میں سے ایسا کوئی نہیں جو اسے موت کی بھینٹ چڑھا دے۔''

''کون سا ایسا طریقہ ہے جس سے اسے ختم کیا جا سکتا ہے؟''

''یہ مجھے معلوم نہیں......'' نتانہ نے پرخیال انداز میں کہا۔ ''لیکن ہاں ایک طریقہ ہے۔ تم سلیمانی تلوار سے اسے ختم کر سکتے ہو۔ اگر اس مقدس تلوار

سے تم اس کے دل پر گھاؤ لگانے میں کامیاب ہو جاؤ تو شالو کی زندگی کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔''

''سلیمانی تلوار .....؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''میرے پاس تو ایسی کوئی تلوار موجود نہیں ہے۔''

''ہاں .....وہ میرے باپ کے پاس؟'' اس نے کہا۔

''تمہارے باپ کے پاس؟'' میری حیرت دو چند ہو گئی۔

''حضرت سلیمان کے ایک جن کو حضرت سلیمان نے کسی بات پر خوش ہو کر یہ تلوار بخشی تھی۔ اس جن نے صدیوں پہلے کسی بات پر خوش ہو کر میرے قبیلے کے سردار کو تحفے میں دی تھی۔'' نتانہ بتانے لگی۔ ''پھر تب سے یہ روایت بن گئی تھی کہ جو قبیلے کا سردار ہوتا تھا اسے یہ تلوار سونپی چلی آ رہی ہے۔ لیکن اس کا حصول مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا ہے۔ اس لیے اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

''آپ کسی بات کی چنتا نہ کریں اور نہ ہی پریشان ہوں۔ میں ہر قیمت پر اس مقدس تلوار کو حاصل کر لوں گی۔'' طوسی نے پہلی بار زبان کھولی۔ اس کی آواز اتنی دل کش ہو گی کہ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

''تم .....تم طوسی .....!'' نتانہ نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ ''تم وہ تلوار حاصل کر سکتی ہو؟''

''میں اس کے حصول کی ہر ممکن سعی کروں گی۔'' طوسی کے چہرے سے عزم و حوصلہ چھلک رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ان گنت چراغ روشن ہو گئے تھے۔ ''میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ میری نظروں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم تلوار حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ میں بھی اپنے طور پر اس سے نمٹنے کا طریقہ سوچوں گا۔ لیکن شالو کو مجھے کہاں تلاش کرنا ہو گا۔ جب کہ میں اسے جانتا تک نہیں ہوں۔''

''تمہیں اس کی تلاش میں کہیں دور جانا نہیں پڑے گا۔'' نتانہ نے جواب دیا۔ ''وہ اس کھنڈر میں موجود ہے اور تم اسے دیکھ چکے ہو۔''

''میں اسے دیکھ چکا ہوں؟''

''ہاں۔'' نتانہ کہنے لگی۔ ''گزشتہ شب تم نے اسے دو معصوم لڑکیوں پر ظلم ڈھاتے دیکھا ہو گا۔ وہ ایک جنسی دیوانہ ہے۔ اس کی نفسانی خواہشات جنون کی حد تک بڑھی ہوئی ہیں۔ وہ اب تک سینکڑوں لڑکیوں کی آبرو تاراج کر کے ان کا گوشت کھا چکا ہے۔ پہلے وہ کسی لڑکی کو پامال کرتا ہے۔ پھر وہ اس کے خون اور گوشت سے اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہے۔ وہ ہوس پرست ہونے کے ساتھ ساتھ آدم خور بھی ہے اور انسان کا لہو اور گوشت اس کی مرغوب غذا ہے۔ اپنے قبیلے کی لڑکیوں پر اس کا خاطر خواہ بس نہیں چلتا لیکن اپنی ناپاک خواہشات کی تکمیل کے لیے انسانوں کی لڑکیاں عورتیں اٹھا لاتا ہے۔ تم نے ایک کمرے میں بے شمار ڈھانچے دیکھے ہوں گے وہ انہی بدنصیب لڑکیوں کے ہیں جو اس نابکار کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ تم نے، تم نے ایک کمرے میں مختلف ملبوسات کا ڈھیر بھی دیکھا ہو گا۔ وہ لباس بھی ان ستم رسیدہ لڑکیوں کے ہیں۔ اگر تم اس سفاک اور شیطان صفت ہستی کو ختم کر دیا تو نہ صرف میں آزاد ہو جاؤں گی بلکہ یہ تمہارا اپنی قوم پر بھی احسان ہو گا۔ دنیا کو ایک بھیانک عفریت سے نجات مل جائے گی اور بے شمار معصوم لڑکیاں ایک بھیانک انجام سے بچی رہیں گی..... اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ پھر کوئی راکھشش اس دنیا میں آمد و رفت نہیں رکھ سکے گا۔''

میں حیران اور سراسیمہ نتانہ کی گفتگو سن رہا تھا۔

اب جو حقیقت سامنے آئی تو ذہن صاف ہو گیا اور چھائی ہوئی تاریکی چھٹ گئی۔ موجودہ حالات میں یہ ضروری ہو گیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو شالو کو ختم کر دیا جائے۔ خواہ مجھے اپنی جان سے ہاتھ دھونا نہ پڑیں۔

''میرے خیال میں شالو کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔'' طوسی نے اچانک گھبرا کے کہا۔ ''میرا خیال ہے

کہ اب آدم زاد کو یہاں سے جتنا جلد ہو سکے رخصت ہو جانا چاہیے۔''

''ہاں۔'' فتانہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ پھر اس نے حسرت ناک نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ''نوجوان.....! مجھے امید ہے کہ تم مجھ الم رسیدہ کو فراموش نہیں کرو گے.....اور پھر تم یہ کہ ایک بہادر مرد ہو۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔''

''میں ایک مرد ہوں اور اپنی زبان کا پاس رکھوں گا اور اپنا وعدہ ہر قیمت پر نبھاؤں گا.....'' میں نے پراعتماد لہجے میں اسے یقین دلایا۔ پھر ان دونوں پر ایک الوداعی نگاہ ڈالتے ہوئے باہر آ گیا۔

کمرے میں پہنچا تو حالات معمول کے مطابق تھے۔ میں بہت تھکن محسوس کر رہا تھا۔ لہٰذا میں جوتے سمیت ہی بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں لیکن فتانہ کا حسین سراپا ذہن کے پردے پر منقش ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ راکھشش لڑکی اتنی نظر نواز تھی کہ میں اس کے شیریں تصور میں گم ہو کر رہ گیا۔ میں اس کے لیے ایک لطیف سی خلش محسوس کر رہا تھا اور بار بار یہی خواہش ابھرتی تھی کہ دوبارہ تہ خانے میں چلا جاؤں اور اس حسن و شباب کے تراشیدہ پیکر کو دیکھتا رہوں تاکہ دل کو فرحت سی محسوس ہوتی رہے۔

شالو کا خیال آتے ہی میں فکرمند اور پریشان ہو گیا۔ فتانہ سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق مجھے راکھشش سے مقابلہ کرنا تھا۔ خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ راکھشش سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ راکھشش اور جنات قوم کے بارے میں بچپن ہی سے طرح طرح کی بھیانک اور خوف ناک قصہ کہانیاں سنتا آیا تھا۔ میں توہم پرست نہ تھا میرا خیال تو راکھشش اور بدروحوں کے بارے میں من گھڑت قصے کہانیاں زدعام ہے۔ لیکن اس راکھشش کو دیکھ کر یقین کرنا پڑا کہ اس کا وجود ہے۔ جنات قوم بھی ہوتی ہو گی۔ میں سوچنے لگا کہ اسے کس طرح شکست دی جا سکتی ہے بلکہ اس کے کہنے کے مطابق گولیوں وغیرہ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ گونتانہ نے ایک مقدس تلوار کا ذکر کیا تھا لیکن اس کا حصول خاصا مشکل تھا۔ جبکہ میرا مقابلہ ایک خون آشام راکھشش سے تھا اور اسے زیر کرنا آسان بات نہ تھی۔ جیسا کہ بتایا گیا تھا ہر راکھشش پر اسرار قوتوں کا مالک نہیں ہوتا ہے۔ سینکڑوں اور ہزاروں میں سے ایک ہوتا ہے لیکن شالو تو پراسرار اور نادیدہ قوتوں کا مالک تھا۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔ میں ابھی کچھ زیادہ دیر سویا نہیں ہوں گا ایک زوردار دھماکے کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ میں اچھل کر دروازے پر بیٹھ گیا اور حیران نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور دہشت کی ایک لہر میرے وجود کو چھری کی طرح کاٹتی ہوئی اترتی چلی گئی۔

کریہہ المنظر شالو اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ دروازے میں کسی چٹان کی مانند کھڑا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ تکیے انداز میں کولہوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ بہت بھیانک اور غضب ناک ہو رہا تھا اور اس کی خوں خوار درندوں جیسی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''کون ہو تم.....؟'' اس کی غیض و غضب میں ڈوبی ہوئی آواز کمرے میں گونجی جو بڑی گرج دار تھی۔ شالو کی اچانک اور غیر متوقع آمد سے مجھ پر سخت گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ میں اس کا کوئی معقول جواب ڈھونڈ رہا تھا یکایک وہ پھر گرجا۔

''بتاتے کیوں نہیں ہو کہ تم کون ہو؟''

''کون .....میں؟ میں ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔ بارش اور طوفان سے گھبرا کے میں یہاں پناہ لینے چلا آیا۔''

''پناہ.....؟ آہاہاہا۔'' اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ ''کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ ہمارا مسکن ہے اور یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ آپ کی اقامت گاہ

ہے تو میں بھی ادھر کا رخ نہیں کرتا؟'' میں نے انجان بن کر جواب دیا۔

''خیر اب تم آ ہی گئے ہو تو میں خوش آمدید کہتا ہوں۔'' شالو نے مکارانہ انداز میں کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ اوپر چلو..... میں ایک اچھا میزبان ثابت ہوں گا۔''

''میں اس خلوص پر تہ دل سے شکر گزار ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا۔''

''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہاں آنے والا ہر انسان میرے لیے خوشی اور طمانیت کا باعث ہوتا ہے۔'' اس کا لہجہ بڑا معنی خیز بھی تھا۔

''شکریہ..... یہ آپ کی اعلا ظرفی ہے۔ میں یہیں رہنا اور آرام کرنا پسند کروں گا۔''

''نہیں.....'' شالو کی خوف ناک آواز بجلی کی طرح کڑکی۔ ''تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

میں نے اس کے لہجے کی کرختگی میں اپنی موت کا پیغام پڑھ لیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ آدم خور راکھشش مجھے اس مقفل میں لے جا کر میرے خون اور گوشت کی ضیافت اڑانا چاہتا ہے۔ اس وقت مجھے پوری شدت سے اپنے تحفظ کا خیال پیدا ہوا اور بغیر سوچے سمجھے رائفل اٹھالی اور یکے بعد دیگرے تین گولیاں اس کے پہاڑ جیسے جسم پر جھونک دیں۔

اس ننھے کمرے میں ایک بھیانک قہقہہ گونجا اور یہ قہقہہ یقیناً شالو کا ہی تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس سے ٹکرا کے فرش پر گر گئی تھیں اور وہ اسی انداز میں کولہوں پر ہاتھ دھرے کھڑا تھا۔ اس کے لبوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں سفاکانہ چمک اور دراصل عجلت میں مجھے اس بات کا احساس ہی نہ رہا تھا کہ سیسے کی ہلاکت خیز گولیاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی۔

دفعتاً وہ میری جانب بڑھا اور اس نے میری گردن دبوچ لی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب رہا تھا اور میں چند لمحوں میں بے ہوش ہو کر گر گیا۔

ہوش آیا تو خود کو اسی کمرے میں موجود پایا جہاں گزشتہ دو نوجوان لڑکیوں کو شالو کی درندگی کا نشانہ بنتے دیکھا تھا۔ خود میری حالت بھی ان سے مختلف نہیں تھی۔ میں اس ستون کے ساتھ رسیوں سے بندھا ہوا تھا اور مجھ میں جنبش کرنے کی سکت تک نہیں تھی۔ شالو میرے نزدیک ہی موجود تھا اور خون خوار نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور پھر کہنے لگا۔

''آدم زاد.....! مجھے یقین ہے کہ تمہارا خون نہایت لذیذ اور تمہارے جسم کا گوشت بہت مزے دار ہوگا۔ نازک اندام لڑکیوں کے مقابلے میں تم خاصے صحت مند ہو اور تمہارے جسم سے خون بھی کافی برآمد ہوگا لیکن اس سے پہلے مجھے حسن و شباب کی ضرورت ہوگی۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ خیر! تم میرا انتظار کرو..... تمہاری زندگی میں کچھ دیر کا اضافہ ہوا ہے۔ میں بہت جلد ایک دوشیزہ کو جو آدم زادی ہے لے کر آتا ہوں۔''

اس راکھشش کی گفتگو سن کر میری جان ہی نکل گئی۔ میں نے چشم تصور میں شالو کو اپنا جسم جھنجوڑ دیکھا۔ پھر یوں لگا جیسے ہزاروں سانپ اپنے پھن لپکاتے میرے جسم سے لپٹ گئے ہوں اور کچھ دیر بعد میرا پنجر زمین پر پڑا رہ گیا ہو۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ میں عجیب مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ کہاں تو میں نے شالو کو ہلاک کرنے کا وعدہ کیا تھا اور کہاں خود میں اس کا شکار ہو گیا تھا۔

آنکھیں کھولیں تو شالو کمرے سے جا چکا تھا۔ دروازہ بند تھا اور یقیناً باہر سے مقفل تھا اور اگر مقفل نہ ہوتا تب بھی میں اپنی آزادی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نہایت سختی کے ساتھ ستون سے بندھا ہوا تھا اور میرے آزاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اچانک دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں بری طرح چونک

گیا۔ میری پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے اور نظروں کے سامنے موت ناچنے لگی۔ ظاہر ہے شالو واپس آ چکا تھا۔ اب زندگی اور موت کے درمیان وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

یکا یک دروازہ کھلا اور میں دہشت زدہ نظروں سے اس جانب دیکھنے لگا لیکن دوسرے ہی لمحے مایوسیوں کے دبیز اندھیرے میں مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ میرے بدن میں گویا جان پڑ گئی اور میں اپنی زندگی سے خاصا پرامید ہو گیا۔

آنے والا شالو نہیں تھا۔ وہ طوسی تھی .....وہی طوسی جسے میں نے خرگوش کے روپ میں دیکھا تھا اور جس نے شالو کو ختم کرنے کے لیے سلیمانی تلوار لانے کا وعدہ کیا تھا لیکن اسے خالی ہاتھ دیکھ کر مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ کیوں کہ ایسا لگتا تھا وہ تلوار حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔

طوسی بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میری طرف بڑھی اور تیزی سے میری بندشیں کھولنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے خوب صورت مرمریں اور گلابی ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی دکھائی دیتی تھی اور جب اس نے مجھے آزاد کر دیا تو میں نے اس کا جذباتی انداز سے اس کا شکریہ ادا کیا اور چند لمحوں کے بعد پوچھا۔

''کیا تم سلیمانی تلوار نہیں لائی ہو؟''

''نہیں.....'' اس نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے ابھی اس سلسلے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی ہے لیکن تم فوراً اس جگہ سے نکل جاؤ۔ شالو کو تمہاری موجودگی کا پتا چل گیا تو اب وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں جس وقت مقدس تلوار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمہیں ڈھونڈ نکالوں گی۔ بس اب تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہاری جیپ تمہیں ٹھیک حالت میں ملے گی۔''

''لیکن .....لیکن میں فنانہ کو اس عالم میں کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں۔ میں نے اس شالو کو ختم کرنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ میرا اس طرح اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔''

''مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔'' طوسی نے جواب دیا۔ ''تم اس طرح شالو کو ہلاک نہیں کر سکتے۔ وہ بہت زیرک اور مکار ہے۔ اسے ختم کرنے کی بجائے تم خود اس کی خوراک بن جاؤ گے۔''

یہ کہہ کر طوسی نے بڑے محبت اور جذباتی انداز سے میرا ہاتھ تھام لیا اور مجھے کھینچتی ہوئی دروازے کے باہر لے گئی۔ میں نے آخری بار فنانہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جس کے لیے طوسی نے پرخلوص انداز میں انکار کر دیا۔ وہ میرے فوراً چلے جانے پر مصر تھی۔ اسے اپنی جان کا بھی خطرہ تھا۔ شالو کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔

پھر طوسی جذباتی انداز سے رخصت ہوئی تو میں اپنے کمرے میں گیا۔ میں نے رائفل اور شکاری تھیلا اٹھایا اور مضمحل قدموں سے چلتا ہوا کھنڈر کے باہر آ گیا اور اپنی جیپ کی طرف چل دیا۔ طوسی نے مجھے پہلے ہی سمتوں وغیرہ کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا اس لیے جیپ تک پہنچنے میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ اس کے کہنے کے مطابق جیپ اسے سیدھی نظر آئی تھی۔ چناں چہ میں نے رائفل وغیرہ پچھلی سیٹ پر پھینکی اور اسٹیرنگ پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جیپ تیز رفتاری سے شہر کی جانب جا رہی تھی۔

☆☆☆

ہر چند کہ میں اس طلسم خانے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور مجھے ایک نئی زندگی مل گئی تھی مگر فنانہ کا حسین اور مغموم چہرہ ہر وقت ذہن پر چھایا رہتا۔ وہ مجھے زنجیروں میں جکڑی ہوئی دکھائی دیتی۔ اس کی آنکھوں سے اشک بہتے ہوئے محسوس ہوئے اور یوں لگتا جیسے مجھے بے وفائی، بزدلی اور عہد شکنی کا طعنہ دے رہی تھی۔ میں وعدہ خلافی کرتے ہوئے وہاں سے جان بچا کر بھاگ آیا تھا اور اب نادم و شرمسار تھا۔

میں جوں جوں اس مسئلے پر سوچتا گیا اضطراب

اور بے چینی بڑھتی گئی۔ میں نے مصمم وعدہ کرلیا کہ بتانہ سے کیا ہوا وعدہ ہر قیمت پر ایفا کروں گا خواہ مجھے قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ لیکن مشکل یہ درپیش تھی کہ شالو کو زیر کرنے کی کوئی تدبیر میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔ مجھے اس وقت کسی کے تعاون، رہنمائی اور مشورے کی اشد ضرورت تھی۔ جب کہ میں نے ابھی تک اس پر تحیر اور ناقابل یقین پراسرار واقعات کسی سے دانستہ ذکر نہیں کیا تھا کہ کسی کو ہم راز بناؤں۔ اس لیے کہ اتنا جانتا تھا کہ آج کے سائنسی دور میں میری داستان پر کسی کو کوئی یقین نہیں آئے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ کسی کو اعتماد میں لوں اور تمام واقعات سے آگاہ کروں تاکہ باہمی صلاح مشورے سے کوئی قدم اٹھاؤں۔

اس ضمن میں میری نظر بچپن کے ایک گہرے دوست نرنجن پر پڑی۔ چناں چہ میں اتوار کی شام میں اس کے گھر پہنچ گیا اور اسے رازداری کے انداز میں اسے تمام واقعات سنائے۔

حسب توقع نرنجن میری داستان سن کر بھوچکا رہ گیا۔ وہ کافی دیر تک حیرانی سے میری شکل تکتا رہا اور بولا۔

''کیا واقعی یہ سچ ہے دوست؟''

''ایک ایک لفظ سچ ہے۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

نرنجن نہ صرف بے حد سنجیدہ بلکہ معاملہ فہم نوجوان بھی تھا۔ اس نے میری بات کا یقین کرلیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

''میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں کسی مہاگرو سنیاسی یا سادھو سے مدد حاصل کی جائے۔ کیوں کہ اس مسئلے کا حل کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ میری نظر میں سنیاسی اور سادھو بھی ہیں۔''

نرنجن کی یہ بات میرے دل کو لگی۔ مجھے ابھی تک اس کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ پہنچے ہوئے سادھو آج کل ملتے کہاں ہیں۔ جسے دیکھو مکر و فریب کا لبادہ اوڑھے بیٹھا ہے۔ نرنجن سے اس خیال کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

تم کسی بات کا چنتا نہ کرو اور پریشان نہ ہو۔ میرے نانا کے ایک سادھو مہاراج دوست کو جانتا ہوں۔ جن کی عمر ایک دس برس کی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہی ہوگی۔ وہ اس ضمن میں یکتائے روزگار ہیں۔ وہ تمام پراسرار علوم پر عبور رکھتے ہیں۔ ان کے قبضے میں کئی موکل اور راکھشش بھی ہیں اور ان کے قبضے میں پراسرار قوتیں بھی ہیں لیکن۔''

''لیکن کیا.....؟'' میں نے فوراً ہی کہا۔ ''اگر وہ فیس لیتے ہیں تو میں منہ مانگی فیس دینے تیار ہوں۔''

''یہ بات نہیں ہے۔'' نرنجن نے کہا۔ ''انہیں کبھی بھی روپے پیسے سے کوئی دل چسپی نہیں رہی ہے۔ انہوں نے دنیا کو تیاگ دیا ہے۔ گوشہ نشینی اختیار کررکھی ہے اور لوگوں سے میل جول بھی نہیں رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مکان میں تنہا رہتے ہیں اور عرصہ دراز سے انہیں باہر نکلتے نہیں دیکھا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ آخر وہ اپنی ضروریات کیسے پوری کرتے ہیں؟''

''پھر.....؟'' میں نے متردد لہجے میں کہا۔

''دیکھو میں کوشش کرتا ہوں۔ شاید وہ ملاقات کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں کل شام تک تمہیں صورت حال سے آگاہ کروں گا..... پتا جی شاید سفارش کردیں۔''

پھر اس نے دوسرے روز شام پانچ بجے مجھے خوش خبری سنائی کہ سادھو مہاراج نے ملنے کی اجازت دے دی ہے۔ اس نے مزید کہا کہ ایک گھنٹے کے بعد کا وقت دیا ہوا ہے۔ پھر ہم دونوں ان کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ سادھو مہاراج کا مکان بھی ان کی شخصیت کی طرح پراسرار لگ رہا تھا۔ طول و عرض صحن میں تناور درخت کھڑے تھے اور ہر طرف ایک عجیب سی وحشت اور ویرانی برس رہی تھی۔ ہمیں ان کی رہائش گاہ کے دروازے پر دستک دینے کی نوبت نہیں آئی تھی وہ آپ ہی آپ کھل گئے۔ ایک گرج دار آواز نے اندر کے لیے کہا تھا تو ہم اندر چلے گئے تھے۔ اس آواز کو سن کر ہم دونوں سہم بھی گئے تھے۔ سادھو مہاراج فرش پر بچھے

ہوئے ایک سفید گدے پر نیم دراز تھے اور ان کی پشت سے گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے سفید براق لباس تن زیب کر رکھا تھا۔ داڑھی اور سر کے بالوں کے علاوہ بھنویں تک سفید تھیں۔ اس عمر میں بھی وہ کافی صحت مند نظر آئے تھے اور ان کے چہرے سے بڑھاپے کی تھکن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے اپنی بند آنکھیں کھولیں اور پھر انہوں نے خواب ناک سی آواز میں کہا۔

''بالکو.....! آرام سے بیٹھ جاؤ۔''

ہم فوراً ہی ان کے قریب بیٹھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں سرخ روشن اور دل میں اتر جانے والی تھیں اور ان کی آواز میں ٹھہراؤ، دبدبہ اور خود اعتمادی، کچھ دیر بعد چہرہ اوپر اٹھائے خلا میں گھورتے رہے اور پھر اسی کیفیت میں بولے۔

''میں مختصراً تمہارے حالات سے واقف ہو گیا ہوں لیکن تم ذرا تفصیل سے سارے واقعات بتاؤ۔ مگر اس بات کا خیال رہے کہ مبالغہ آمیزی قطعی نہ ہو۔''

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ شروع سے آخر تک تمام داستان من وعن بیان کر دی۔

سادھو مہاراج آنکھیں بند کیے خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھے میری کہانی سنتے رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور جب میں نے اپنی کہانی ختم کی تو اس کے بعد وہ کئی منٹ تک عالم استغراق میں بیٹھے رہے۔ پھر اچانک وہ اٹھے، پھر ایک گوشے سے ایک چھوٹی سی انگیٹھی اٹھا لائے جس میں کوئلے موجود تھے۔ انہوں نے انگیٹھی اپنے سامنے رکھ لی اور پھر وہ زیر لب کچھ پڑھ کر اس پر پھونک دیا۔ پھر کوئلے آپ ہی آپ دہک اٹھے۔ ان کی تپش اتنی تیز تھی کہ کمرا خاصا تیز ہو گیا۔ سادھو مہاراج کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہل ہل کر بہت تیزی سے کچھ پڑھتے جا رہے تھے۔ اب کوئلے خوب دہک گئے تھے اور ان سے آنچ نکل رہی تھی۔

یکایک سادھو مہاراج نے کچھ کہا اور کمرا گرج دار آواز سے گونج اٹھا۔ پھر انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ اس لمحے کمرے میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا اور انگیٹھی سے سنہری دھواں اٹھنے لگا لیکن غبار کا حجم لحہ بہ لحہ بڑھتا جا رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں زمین سے کئی فٹ بلند ہو چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس سنہری دھوئیں یا چمکیلے غبار نے ایک انسانی ہیولے کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ غبار چھٹتا گیا اور جسمانی خدوخال اور اعضا واضح ہونے لگے۔ پھر چہرے کے نقوش دکھائی دینے لگے اور ذرا سی دیر میں ایک عجیب پر ہیبت اور شکل و صورت کا آدمی دونوں ہاتھ باندھے مودبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ اس نے محض ایک لنگوٹ باندھ رکھی تھی اور باقی کا جسم کپڑوں سے آزاد تھا۔ اس نے اپنے بدن پر بہت سا تیل مل رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کی جلد چمک رہی تھی۔ ایک قد آور، توانا گٹھیلے جسم کا بے حد طاقت ور آدمی تھا لیکن سادھو مہاراج کے سامنے گردن جھکائے کسی زر خرید غلام کے انداز میں کھڑا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''مالک! کیا حکم ہے؟ غلام حاضر ہے۔''

''تم شالو کو جانتے ہو؟'' سادھو مہاراج نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ ''اس کا تعلق تیری قوم سے ہے۔''

سادھو مہاراج کا موکل خاموش کھڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ اس کا جسم معدوم ہونے لگا اور وہ دوبارہ سنہری دھویں میں تبدیل ہو گیا اور کچھ دیر بعد وہاں چمکیلے غبار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر نہ رہی۔ چمکیلے دھویں میں پھر جہاں خدوخال اور اعضا نمایاں ہونے لگے اور چند ثانیے بعد وہ عجیب و غریب شخصیت دوبارہ کمرے میں موجود تھی۔ وہ ہاتھ باندھے ادب سے سر جھکائے سادھو مہاراج کے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔

''آقا! شالو ایک سرکش راکھشش ہے۔ قبیلہ ماروت سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ بڑا جابر و ظالم ہے۔''

''تم کیا شالو کو ختم نہیں کر سکتے ہو؟'' سادھو مہاراج نے پوچھا۔

''نہیں میرے مالک! وہ بہت ہی طاقت ور ہے۔''

''پھر اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟''

''صرف سلیمانی تلوار سے.....''

''سلیمانی تلوار.....؟'' سادھو مہاراج نے پرخیال انداز سے کہا۔ ''ہاں، میں اس کا ذکر سن چکا ہوں۔ کیا تم وہ تلوار حاصل کر سکتے ہو؟''

''اس کا حصول مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا ہے مالک!''

''وہ کس لیے؟'' سادھو مہاراج نے کہا۔

''اس لیے کہ یہ تلوار نہ صرف ایسی عزت، وقار اور عظمت کا باعث جو قبیلے کی ناک ہے.....اس وجہ سے اس کی زبردست حفاظت صدیوں سے کی جارہی ہے.....لیکن اس کے حصول کے لیے مجھ سے جو بن سکے گا وہ کروں گا مالک! لیکن.....''

''کہو .....کہو۔'' سادھو مہاراج نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''آپ جوں کہ عظیم قوتوں کے مالک ہیں۔ شالو کو آسانی سے قابو میں کر سکتے ہیں۔''

''ہاں .....میں جانتا ہوں۔'' سادھو مہاراج نے جواب دیا۔

پھر سادھو مہاراج نے اپنا بایاں ہاتھ فضا میں بلند کیا اور اس لمحے موکل چمکیلے دھویں میں تحلیل ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ دھواں بھی اچانک ہی غائب ہو گیا اور دہکتی ہوئی انگیٹھی بھی اب سرد پڑ گئی تھی۔ اس کے بعد سادھو مہاراج نے میری طرف رخ کیا اور کہنے لگے۔

''جیسا کہ میرے موکل کی زبانی تم سن چکے ہو کہ شالو ایک سرکش، شریر اور طاقت ور راکھشش ہے۔ اس کی ہلاکت سلیمانی تلوار ہی سے ممکن ہے جب کہ اس کا حصول دشوار اور ناممکن سا ہے۔ ان حالات میں یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جاپ اور پرارتنا سے ہی کیا جائے۔ لیکن یہ طریقہ نہایت کٹھن اور خطرناک ہے۔ کیوں کہ جاپ میں ذرا سی بھول چوک ہو جانے سے جان جانے کا اندیشہ ہے۔''

سادھو مہاراج نے سانس لینے کے لیے توقف کیا اور پھر کہنے لگے۔

''میں تمہاری مدد ضرور کرتا لیکن میں بہت بوڑھا ہو گیا اور اس قسم کے امور سے دل چسپی نہیں رہی۔ حافظہ بھی کم زور ہو گیا۔ یادداشت بھی متاثر ہو گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود تم چاہو تو میں تمہیں شالو کو زیر کرنے کا عمل بتا سکتا ہوں۔''

''میں تیار ہوں سادھو مہاراج!'' میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ''میں ہر صورت میں اس مظلوم لڑکی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارا جذبہ اور جذبات قابل قدر ہیں۔'' سادھو مہاراج نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ بڑا مشکل اور صبر آزما اور جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس کھنڈر میں بیٹھ کر تمہیں سات دن تک جاپ کرنا ہوگا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی صاف حصے میں انسانی خون سے پانچ فٹ قطر کا ایک گول دائرہ کھینچ کر اور اس دوران میں ایک مخصوص جاپ کرتے جاؤ گے۔ دائرہ مکمل ہونے کے بعد اس کے گرد ایک مکمل چکر لگاؤ گے۔ اس دوران بھی وہ جاپ مسلسل زبان پر رہے گا۔ آخری چکر مکمل کرنے کے بعد تم دائرے کے اندر داخل ہو جاؤ گے۔ زمین پر آلتی پالتی مار کے بیٹھو گے بھی تو تمہارا جاپ کا یہ عمل جاری رہے گا۔ تم سات دن تک اس دائرے کے اندر بیٹھے ہوئے عمل پڑھتے رہو گے جو ہر روز کے لیے ایک علیحدہ عمل ہوتا ہے۔''

''انسانی خون کا دائرہ؟'' میں نے سہمی آواز میں سرگوشی میں آہستگی سے پوچھا۔

''ہاں.....'' سادھو مہاراج نے جواب دیا۔ ''ہر راکھشش، بدروح اور آتما کو تابع کرنے کے لیے انسانی خون کی ضرورت تو نہیں پڑتی لیکن چوں کہ شالو مہا قوتوں کا مالک اور ایک خبیث پلید اور خطرناک راکھشش ہے چناں چہ اس پر قابو پانے کے لیے اس نوعیت کے عمل کی ضرورت ہے۔ بہرحال انسانی خون کا حصول تمہارا اپنا مسئلہ ہے۔ یہ کام تمہیں ہر صورت میں انجام دینا ہے۔ اب تم دوسری ہدایات سنو۔ شالو اس دوران تمہیں سخت ہراساں و دہشت زدہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ جوں جوں دن گزرتے جائیں گے اس کی طرف سے خوف و دہشت میں

اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ وہ ہزار طریقوں سے تمہیں دھمکائے گا اور جاپ کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا اور اس کی تمام تر جدوجہد تمہیں دائرے سے باہر نکالنے کے لیے ہوگی تاکہ تمہارا کام تمام کر دے۔ وہ اس کے گرگے یا اس کی طرف سے بھیجی ہوئی آفات اس دائرے کے اندر ہرگز گھس نہ سکیں گے۔ جو بھی اس کے اندر قدم رکھے گا جل کر خاک ہو جائے گا۔ اس دوران میں تمہیں ہمت واستدلال سے کام لینا ہوگا۔ کسی بھی مرحلے پر تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی طرف سے جو ظاہر ہوں گے ان کی کوئی اصل حقیقت نہیں ہو گی۔ وہ سب فریب نظر ہوگا۔ بہت سے سادھو، سنیاسی اور پنڈت انہی آفات سے ڈر کر دائرے سے نکل بھاگتے ہیں اور پھر ان کا انجام موت ہوتا ہے یا پھر وہ پاگل یا معذور ہو جاتے ہیں۔ میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ تم دہشت زدہ ہو کر دائرے سے باہر نہ نکلنا اور اگر تم نے ایسا کیا تو پھر تمہیں شالو کے قہر و غضب سے کوئی بچا نہ سکے گا۔''

''میں ہر ممکن احتیاط برتنے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا۔ ''اس سلسلے میں آپ نے جو کچھ مجھ سے کہا ہے میں نے اسے ذہن نشین کر لیا ہے۔ بہرحال جو کچھ مجھے جاپ کرنا ہے بتا دیں۔''

''ہاں میں تمہیں تمام جاپ سکھائے دیتا ہوں۔'' سادھو مہاراج نے کہا۔ ''لیکن وہ اتنی آسان اور مختصر نہیں ہے کہ تم انہیں فوراً ہی یاد کر لو۔ تمہارے لیے یہ غیر مانوس اور ایک اجنبی زبان ہوگی اور شروع شروع میں اس کی ادائیگی میں کافی دقت پیش آئے گی۔ بہرحال میں جاپ کرتا ہوں اور تم غور سے سنو۔ اس کے بعد میں کاغذ پر لکھ دوں گا تاکہ تم اچھی طرح سے رٹ لو تاکہ وقت نہ بھول جاؤ۔''

پھر انہوں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر آہستہ آہستہ ان کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ عجیب الفاظ تھے جن کا مفہوم میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ غرض سادھو مہاراج کافی دیر تک پڑھتے رہے۔ پھر انہوں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ سمجھ گئے۔ میں نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ تب انہوں نے کاغذ اور قلم اٹھایا اور لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ ادھر نرجن قریب اور خاموش بیٹھا تھا۔ وہ اس لیے زیادہ متاثر نہیں آیا تھا کہ اس کے نانا نے بتایا ہوا تھا کہ وہ کیسے پہنچے ہوئے ہیں سادھو مہاراج نے قلم رکھ کر کاغذ میری طرف بڑھایا۔

میں نے کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بلند آواز سے پڑھنے لگے تھے۔ عجیب بے معنی الفاظ تھے اور زبان پر چڑھتے ہی نہ تھے۔ آخر بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر میں اس طرح پڑھنے لگا جیسے پہلی کتاب کسی چھوٹے بچے کو پڑھائی جاتی ہو۔ پہلی مرتبہ تو ذرا دقت ہوئی تھی لیکن تین چار مرتبہ پڑھنے کے بعد زبان اجنبی الفاظ سے کسی قدر آشنا ہو گئی۔ اس کے بعد سادھو مہاراج نے جانے کی اجازت دے دی اور چلتے چلتے تاکید کی اس جاپ کو اچھی طرح رٹ لوں اور ہر قدم پر ہوشیاری سے کام لوں۔ نیز یہ جاپ رات کے بارہ بجے بعد تک یاد کرتا رہوں۔

سادھو مہاراج کے مکان سے باہر آنے کے بعد میں نے نرجن کا شکریہ ادا کیا اور اس سے رخصت ہو کر جلد از جلد اپنے گھر پہنچ گیا۔ پھر وہ جاپ تمام رات رٹتا رہا۔ اب روزانہ رات تک میں یہ جاپ رٹتا رہا جس سے مزید پختگی پیدا ہو گئی تھی لیکن اب یہ مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا کہ انسانی خون کہاں سے فراہم کیا جائے۔ جیسا گول دائرہ کھینچنے کے سلسلے میں سادھو مہاراج نے ہدایت کی تھی۔ ظاہر ہے خون کے حصول کے لیے کسی کو قتل کرنا ضروری تھا اور میں اس خیال سے کانپ گیا تھا۔ قتل جیسا بھیانک جرم میں ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنے جسم سے خون نکالا جائے۔ لیکن خون زیادہ مقدار میں درکار تھا۔ جب کہ اتنا خون جسم سے نکل جانے کا مقصد یہ تھا کہ یا تو میں سنسار سے رخصت ہو جاؤں یا پھر نقاہت کے سبب بستر سے اٹھنے کے قابل ہی نہ رہوں۔ مجھے سات دن تک ایک مختصر دائرے کے اندر بیٹھ کر مسلسل جاپ کر

تھی۔ اور اس کے لیے مناسب صحت اور توانائی کی ضرورت تھی۔

دفعتاً بجلی کی سی تیزی کے ساتھ میرے ذہن میں ایک خیال کوندا بن کر لپکا تو میں اچھل پڑا۔

مجھے تعجب ہوا کہ اگر یہ بات پہلے میرے ذہن میں آجاتی تو میں ذہنی کش مکش میں نہ مبتلا رہتا اور نہ پریشان ہوتا۔ میں نے فوراً ایک ڈاکٹر کو فون کیا۔ پھر اس کے ذریعے سے میں نے بلڈ بینک سے چار بوتل خون حاصل کرلیا۔

اتوار تک روانگی سے متعلق میں نے ایسی تمام تیاریاں مکمل کرلیں۔ لیکن جوں جوں روانگی کا وقت قریب آرہا تھا میرے دل کی دھڑکن تیز ہوئی جارہی تھی اور اعصاب میں تناؤ پیدا ہوگیا تھا۔ بہرکیف میں نے خود کو معمول پر لانے کی کوشش کی اور پھر ٹھیک رات گیارہ بجے کھنڈر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے پٹرول کی ٹنکی فل کرالی تھی۔ اس کے علاوہ کئی گیلن پٹرول جیپ میں رکھ لیا تھا۔ جانے کب اس کی کیا ضرورت پڑ جائے۔

میں کھنڈر کے قریب پہنچا تو رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ میں نے جیپ کچھ فاصلے پر ہی چھوڑ دی اور پھر ضروری سامان لے کر دبے قدموں کھنڈر کی جانب بڑھنے لگا۔ ٹارچ میرے ہاتھ میں تھی لیکن میں اس کے غیر ضروری استعمال سے پرہیز کررہا تھا۔ کہ مہاراج شالو کو میری موجودگی کا علم نہ ہوجائے اور تمام کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔ کچھ دیر بعد میں کھنڈر کی حدود میں داخل ہوگیا اور اپنی مناسب جگہ کی تلاش شروع کردی جہاں خونی دائرہ کھینچ کر جاپ کیا جاسکے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس مرتبہ کیوں نہ نتانہ سے مل لیا جائے۔ اس وقت وہ مجھے بڑی شدت سے یاد آرہی تھی لیکن شالو کا خیال آتے ہی اس خواہش کو دل سے نکال دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس ذلیل، کمینے سے مڈبھیڑ ہو۔ مجھے اپنی زندگی بہرحال عزیز تھی۔

کچھ دیر بعد میں کھنڈر کے مشرقی حصے میں ایک معقول جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

میں نے ریڈیم ڈائل گھڑی پر نظر ڈالی۔ تین بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔ اس وقت ہوا بالکل بند تھی۔ چہار جانب موت کا سناٹا مسلط تھا اور کھنڈر کے ایک ایک چپے سے بلا کی وحشت ٹپک رہی تھی۔ میں نے جلدی سے خون کی بوتلیں نکالیں اور انہیں کھول کر پوری طرح چوکس ہوگیا اور پھر گھڑی نے جوں ہی تین بجائے میں نے اپنا کام شروع کردیا۔ میں خون کی پتلی دھار زمین پر گرا کر دائرہ بنانے لگا۔ میرے ہونٹ بھی بڑے تیزی سے ہل رہے تھے۔ میں سادھو مہاراج کی ہدایت کے مطابق جاپ کرنے لگا تھا۔

دائرہ مکمل کرنے کے بعد میں نے اس کے گرد چکر لگانا شروع کردیے جن کی تعداد سادھو مہاراج نے ایک سو ایک بتائی تھی۔ جوں جوں چکروں کی تعداد میں اضافہ ہورہا تھا ہوا شدت اختیار کرتی جارہی تھی اور آخری سمے میں تو ہوائیں غضب ناک طوفان کی شکل اختیار کرگئیں اور جب ایک سو ایک واں چکر لگا تو ایک زبردست تھپیڑا آیا اور اتنا طاقت ور تھا کہ مجھے گزوں دور اٹھا کر پھینک سکتا تھا مگر میں فوراً ہی دائرے میں داخل ہوگیا اور اس وقت مجھے سخت تعجب ہوا جب دائرے کے اندر داخل ہوا کی ذرا سی بھی رمق محسوس نہیں ہوئی البتہ دائرے کے باہر اب بھی زوروشور سے ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور درخت اس طرح جھول رہے تھے شاخیں زمین کو چومتی دکھائی دیتی تھیں۔ غرض رت بھر ہوا کا غضب ناک طوفان جاری رہا اور صبح سورج کی پہلی کرن نمودار ہوتے ہی ہوائیں یک لخت تھم گئیں اور ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا۔

☆☆☆

دن بخیر وخوبی گزر گیا جس کی توقع نہیں تھی اور ہر سمے ایک دھڑکا سا لگا رہا تھا کہ جیسے اب کوئی افتاد نازل ہونے والی ہے اور پھر رات کے بارہ بجے تک کوئی خاص واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ میں پورے انہماک سے جاپ کرنے میں مصروف رہا۔ شاید ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ جب ایک بھاری چیخ نے ماحول کو رزا کر رکھ دیا۔ مجھے یوں معلوم ہوا کہ جیسے کوئی میرے پاس ہی چیخا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول کر اطراف کا جائزہ لیا۔ ابھی میں کسی

نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ دفعتاً وہی ہولناک آواز پھر سنائی دی جیسے کسی نے میرے کان میں چیخ ماری ہو اور اس کے بعد دل خراش اور لرزہ خیز، چیخوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا آج کی شب تمام شیطان ارواح کو آزاد کردیا گیا ہو اور سب نے مل کر مجھ پر یلغار کردی ہو۔ ان کی چیخ پکار کھوکھلی اور غیر انسانی تھیں اور ایسی بھیانک اور ہیبت ناک تھیں کہ میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ ذہن ماؤف ہوا جاتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہزاروں بلائیں میرے گرد بیٹھے ہوئے گریہ وزاری کر رہی ہوں۔ جب کہ دکھائی کچھ نہ دیتا تھا۔ دور یا نزدیک کوئی موجود نہیں تھا۔

پھر وقت جیسے تیسے کر کے کٹ گیا۔ دن کا اجالا پھیلنا شروع ہوا اور طلوع آفتاب کی ساتھ ہی بھیانک چیخیں بند ہوگئیں۔ مجھے ایک روح فرسا عذاب سے نجات مل گئی تھی اور رات بھر کی ہنگامہ آرائی کے بعد اس سکوت سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت کی رفتار رک گئی ہو اور دنیا میں کسی جان دار کا وجود ہی نہ رہا ہو۔

تیسری رات خلاف توقع پرسکون ثابت ہوئی۔ رات کے دو بجے تک کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا۔ میں بڑے دھیان اور پوری تندہی سے جاپ پڑھتا رہا اور گزشتہ راتوں کے مقابلے میں زیادہ ہی پراعتماد رہا تھا کہ .....اچانک اپنے بالکل قریب شیر کی زبردست دہاڑ سنائی دی تو میں اس طرح اچھل پڑا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ آنکھیں کھول کر اور دوسرے ہی لمحے خون کی سرد لہر سارے جسم میں برق رو کی طرح دوڑ گئی۔ ایک جسیم اور خوں خوار شیر دائرے کے باہر موجود تھا اور اس کا پورا منہ کھلا ہوا تھا اور تیز نوکیلے دانت بڑے خوف ناک دکھائی دے رہے تھے۔

میں ایک شکاری ہوں۔ میں نے جنگلوں اور چڑیا گھروں میں بے شمار ہمہ اقسام کے شیر دیکھے ہیں لیکن یہ شیر اپنی جسامت اور ہیبت کے اعتبار سے عجیب تھا۔ اس کا قد گھوڑے کی مانند تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی محسوس ہو رہی تھیں اور اس کے انداز سے یوں لگ رہا تھا گویا مجھ پر چھلانگ لگانا ہی چاہتا ہے۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا کہ اٹھ کر بھاگ جاؤں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ میں دائرے کے اندر محفوظ ہوں۔ باہر قدم رکھتے ہی خوں خوار میرا تیا پانچا کر ڈالے گا۔ چناں چہ میں آنکھیں بند کر کے بے خوف سا ہو کر جاپ کرنے میں مصروف رہا۔ شیر صبح تک دائرے کے باہر غراتا اور دہاڑتا رہا۔ اس کی گرج دار آواز غیض وغضب میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کے دہاڑنے سے زمین ہلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی اور وہ والہانہ نظروں سے گھورتا ہوا اور دیوانگی کے عالم میں دائرے کے گرد چکر کاٹتا رہا۔

چار گھنٹے اس کرب انگیز حالت میں گزر گئے اور پھر صبح کا اجالا نمودار ہونے لگا اور اس کے ساتھ وہ خون خوار درندہ ہی نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔

☆☆☆

چوتھی رات کے اوائل شب سے ہی مصائب نازل ہونے لگے۔ شاید رات کے ساڑھے نو بجے تھے جب مجھے اپنے سر پر عجیب وغریب آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں کچھ مانوس سی معلوم ہوئیں۔ چناں چہ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو بدن کا خون خشک ہو کر رہ گیا۔ یہ وہی خون آشام چمگادڑیں تھیں جن کے اجسام کم وبیش انسان کے برابر تھے۔ ان کے منہ سے خوف ناک آوازیں اور رات کے سناٹے میں ان کے پروں کے پھڑ پھڑاہٹ بڑی کریہہ اور بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ بلاشبہ وہ تعداد میں ہزاروں بلکہ لاکھوں تک تھیں اور غول کے غول ان میں آ کر شامل ہو رہے تھے۔ وہ بار بار مجھ پر جھپٹ رہی تھیں لیکن نزدیک پہنچتے ہی اس کے پیشتر ہی چیختی چلاتیں اور اوپر کی جانب پرواز کر جاتی تھیں۔ میں چمگادڑوں کی اس فوج کو دیکھ کر خوف زدہ ضرور ہوگیا لیکن میں مطمئن تھا کہ وہ میرا بال تک بیکا نہیں کرسکتیں۔

نصف شب تک وہ آدم خور چمگادڑیں میرے سر پر منڈلاتی رہیں اور پھر نہ جانے اک دم سے غائب ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی گہرا سکوت طاری ہوگیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی لیکن میرے لیے یہ سکوت خوش

گوار ثابت نہیں ہوا۔ کیوں کہ کسی سمے میں نے پھر غیر مانوس آوازیں سنیں تو میں نے پہلے کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب آوازیں قریب محسوس ہونے لگیں تو میں نے سر اٹھا کے دیکھا اور اک دم سے کانپ کر رہ گیا۔ مجھ سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر سیلاب کا غضب ناک پانی تھا جو ٹھاٹھیں مارتا تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی سطح بلاشبہ بیس فٹ بلند تھی اور بڑھتا ہوا پانی ایک بلند اور متحرک دیوار کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ سیلاب کا بہاؤ بہت ہی تیز تھا اور پانی کے غیظ و غضب کا ٹھکانا نہیں تھا۔ اس نوعیت کا سیلاب میں نے سنا اور نہ کبھی دیکھا۔ بس پانی کی ایک مٹیالی چٹان تھی جو پرزور آواز کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میری زندگی کے آخری لمحات آ پہنچے ہیں جو خوف ناک سیلاب مجھے تنکے کی طرح بہالے جائے گا۔

میں اس وقت سخت بدحواس اور سراسیمہ تھا۔ سیلاب کا پانی برابر میری طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دائرے کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور پھر بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ سیلاب دائرے کو چھوڑتا ہوا دائیں بائیں سے گزر گیا۔ میرے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں دوبارہ بیٹھ گیا مجھے سادھو مہاراج کے الفاظ یاد آئے۔ شالو کی جانب سے نازل کی جانے والی تمام آفات محض تصوراتی اور غیر یقینی ہوں گی۔ پھر میں اطمینان سے جاپ کرنے لگا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میں بیس فٹ گہرے کنویں میں بیٹھا تھا اور اس کے گرد پانی کی گول دیواریں متحرک تھی۔ دراصل دائرے کے چاروں طرف سیلاب کا پانی رواں تھا اور دائرے کی حیثیت ایک بیس فٹ گہرے کنوئیں کی تہ کی ہو گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر یہ زبردست سیلاب اس طرح رواں دواں رہا تو میرا کیا حشر ہو گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور دن نکلتے ہی پانی اچانک غائب ہو گیا۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہر طرف زمین خشک پڑی تھی۔

اب پانچویں رات کا ماجرا سنیے۔ میں نہایت انہماک اور توجہ کے ساتھ جاپ میں مصروف تھا کہ یکا یک ایک پراسرار سی آہٹ کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور دہشت سے میری جان نکل گئی۔ چاروں طرف سینکڑوں گز لمبے اور خوف ناک اژدہے میری جانب بڑھے چلے آ رہے تھے اور ان کی لمبی لمبی زبانیں باریک تھیں اور بار بار لپک رہی تھیں۔ ان سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ ان کی چمک دار آنکھوں میں ایسا سحر تھا ذہن خوابیدہ ہوا جاتا تھا کہ وہ بھیانک آوازوں میں چیختے چلاتے میری طرف بڑھ رہے تھے اور ان کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔ میں اس سے گھبراہٹ میں دائرے کے تحفظ کو بھی فراموش کر بیٹھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہولناک اژدھے مجھے نگل لیں گے اور چند لمحوں کے بعد کسی کے منہ میں میری ٹانگیں ہوں گی اور کسی نے کھوپڑی دبا رکھی ہو گی۔ کوئی کمر میں دانت گاڑ رہا ہو گا اور کوئی بازو چبا تا ہو گا۔ تصور بڑا اذیت ناک تھا۔ میں کانپ کر رہ گیا۔

لیکن حسب سابق کوئی اژدھا دائرے کے اندر داخل نہیں ہوا۔ وہ سب دائرے کے باہر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ان کے منہ سے بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں اور زبانوں سے بدستور شعلے لپک رہے تھے۔ میں نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں اور تیزی سے جاپ کرنے لگا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ دیر بعد اژدھے خوف ناک پھنکاریں مارتے ہوئے ادھر ادھر گئے اور میدان صاف ہو گیا۔ ابھی میں اطمینان کی سانس لینے نہیں پایا تھا کہ دفعتاً ہاتھی کی چنگھاڑ سنائی دی اور یہ معلوم ہوا گویا وہ میرے سر پر کھڑا ہو۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس بار ہرگز آنکھیں نہیں کھولوں گا لیکن یکا یک میرے اردگرد زبردست دھماکے ہونے لگے اور یوں محسوس ہوا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ پھر میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور یہ سمجھتے ہوئے کہ اس دائرے کے اندر مجھے گزند نہیں پہنچے گی۔ ایک بار پھر خوف سے میرا رواں رواں کانپ اٹھا..... ہزاروں کی تعداد میں جنگلی ہاتھی چیختے چنگھاڑتے میری جانب بڑھے چلے آ رہے تھے اور وہ دھمک ان کے پیروں کی تھی جس سے زلزلے کا احساس

ہوتا تھا۔ غرض کچھ دیر بعد ہی بے شمار مست ہاتھی دائرے کے قریب پہنچ گئے اور غضب ناک آواز میں چنگھاڑنے لگے۔ وہ بار بار اپنی لمبی سونڈیں میری جانب بڑھائے لیکن دائرے کے نزدیک پہنچتے ہی واپس کھینچ لیتے تھے۔ پھر وہ جنون کے عالم میں دائرے کے گرد چکر کاٹنے لگے اور صبح تک لرزہ خیز آوازوں میں چنگھاڑتے اور اچھلتے کودتے رہے۔

صبح ہوئی تو جان میں جان آئی۔ رات بڑی اذیت کے عالم میں گزری تھی۔ بہر کیف میں کس قدر مطمئن اور پرسکون سا تھا کہ پانچ راتیں بخیریت وعافیت گزر گئی تھیں۔ بس دو راتیں اور باقی ہیں جس کے بعد شالوذلیل کمینہ میری مٹھی میں ہوگا اور میں نتانہ کو آزاد کرالوں گا۔

لیکن چھٹی رات سب سے زیادہ قیامت خیز ثابت ہوئی۔ نصف شب تو سکون سے گزر گئی لیکن جب رات کے دو بجے تو لگا ڈھول کی تھاپ کی پرزور آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس خوف ناک مقام پر رات کے پرہول سناٹے میں ڈھولک کی گونج بڑی پراسرار اور روح میں سرایت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈھول پیٹنے کی آوازیں لحہ بہ لحہ نزدیک ہوتی جا رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی عجیب بے ہنگم اور مکروہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ڈھولک کی آوازیں مجھے بالکل اپنے قریب محسوس ہونے لگیں تب میں نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر سامنے کی سمت دیکھا اور جیسے میری روح فنا ہو گئی۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر بے شمار انسانی ڈھانچے اپنی کریہہ آوازوں میں چیختے چلاتے میری طرف بڑھ رہے تھے۔ ان سب کے گلوں میں ایک ڈھول لٹک رہا تھا اور وہ استخوانی ہاتھوں سے پوری شدت کے ساتھ تھاپ لگا رہے تھے۔ ان بھیانک پنجروں کے شرکت کرنے سے بڑی عجیب آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ اپنی کریہہ آواز میں بڑبڑا رہے تھے۔

”بھاگ جاؤ...... نکل جاؤ...... جان بچاؤ...... نکل جاؤ...... نکل جاؤ......“

ڈھولک کی تھاپ پر ان خوف ناک ڈھانچوں کی آواز میں اتنی پراثر اور دل اتر جانے والی تھیں کہ دفعتاً مجھے خیال آیا اگر خوف و دہشت کی اس پراسرار دنیا سے نکل بھاگوں؟ پھر عقل نے ساتھ دیا اور میں اپنی جگہ بڑی مضبوطی سے جما رہا۔ وہ ڈھانچے بہت دیر تک ڈھولک بجا بجا کر مجھے بھاگ جانے پر مجبور اور پریشان کرتے رہے۔ لیکن میں تو چٹان بن کر اٹل رہا اور جاپ کرتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ ان کی آوازیں معدوم ہوتی گئیں اور کچھ دیر بعد سناٹا چھا گیا لیکن یہ سکوت زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوا کیوں کہ کچھ دیر بعد میری بند آنکھوں نے تیز روشنی محسوس کی اور تب میں نے آنکھیں کھول کر تو پھر ایک مرتبہ خوف و دہشت نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بلاشبہ وہ آگ کا سمندر ہی تھا جو موج در موج میری طرف بڑھ رہا تھا۔ آگ کے شعلے پندرہ بیس فٹ بلند تھے اور ان شعلوں کی لپکتی زبانیں دیکھ کر دل ہول رہا تھا۔ آگ کا سمندر آہستہ آہستہ میری جانب رواں تھا اور اس کے راستے میں حائل ہر چیز خاکستر ہوتی جا رہی تھی۔

میں آگ کے اس لامحدود سمندر کو دیکھ کر حواس کھو بیٹھا اور اس بات کو پھر بھول گیا کہ دائرہ کے اندر محفوظ ہوں...... چناں چہ آگ کی دہشت نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ جسم پسینے میں شرابور ہو گیا اور ہاتھ پیروں میں لرزش پیدا ہو گئی...... اور جب آگ کے شعلے دائرے کے نزدیک پہنچ گئے تو میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور دائرے سے نکل کر بھاگنا چاہتا تھا کہ یکا یک میرا پیر پھسلا اور میں دھڑام سے دائرے کے اندر ہی گر گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

آنکھ کھلی تو میں کافی بلندی پر آچکا تھا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور رات کے واقعات پر غور کرنے لگا۔ پھر مجھے آگ کا خوف ناک سمندر یاد آیا اور اس کے بعد یہ بات بھی یاد آ گئی کہ میں خوف زدہ ہو کر بھاگ پڑا تھا لیکن قدم اٹھاتے ہی میں زمین پر گر گیا تھا۔ جب غور کیا تو گرنے کا سبب بھی معلوم ہو گیا تھا۔ دراصل میرا پیر خون کی اس خالی بوتل پر پڑ گیا تھا جو

Pakistanipoint.com

دائرے کے اندر پڑی رہ گئی تھی۔ بہرکیف یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں گر گیا تھا اور دائرے کے اندر ہی گرا تھا ورنہ دوسری صورت میں میری موت یقینی تھی۔

''پچھلی رات سخت گزری تھی۔ پانچ دن اور پانچ راتیں ایک مختصر دائرے کے اندر بیٹھے بیٹھے بدن شل ہو گیا تھا اور اب میری طبیعت میں جھن جھنجلاہٹ، اضطراب اور بیزاری پیدا ہو گئی تھی اور میں سوچنے لگا کہ کس مصیبت میں بیٹھے بیٹھے گرفتار ہو گیا ہوں۔ نرک میں جائے شالو..... بہتر ہے کہ دن کی روشنی میں گھر کی راہ لوں اور اس عذاب سے نجات حاصل کر لوں۔ نہ معلوم آئندہ کس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ایک رات تو رہ گئی ہے۔ اگر میں چلا گیا تو تمام محنت اکارت جائے گی..... رہا شالو وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ کیوں کہ اس کے تمام حربے بری طرح ناکام ہو چکے ہیں اور دائرے سے باہر نکالنے کی کوشش رائگاں گئی ہے۔ پھر مجھے متانہ سے کیا ہوا عہد یاد آیا میں نے اسے شالو کی قید سے آزاد کرانا تھا اور یہ اسی وقت ممکن تھا کہ میں ثابت قدمی سے اپنے اس فیصلے پر جما رہوں۔ آخری وقت میں حوصلہ ہار بیٹھنا اچھا معلوم نہیں ہوا۔''

وہ ساتویں اور آخری رات تھی۔ فیصلہ کن رات..... مجھے یقین تھا کہ آج کی شب شالو اپنی تمام تر قوتوں کو بروئے کار لائے گا اور مجھ پر غلبہ حاصل کرنے کی ہر ممکن سعی کرے گا۔ چناں چہ میں نے سورج غروب ہونے سے پہلے ہی چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے دل کو مضبوط کر لیا اور آئندہ پیش آنے والے واقعات سے نمٹنے کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ اس رات شالو سر شام ہی حملے شروع کر دے گا لیکن وہ رات حیرت انگیز طور پر سب سے زیادہ پرسکون ثابت ہوئی۔ صبح تین بجے تک مکمل خاموشی رہی اور کسی قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں سکون کے ساتھ آخری اور ساتویں رات کا جاپ کرتا رہا۔ غالباً ساڑھے تین کا عمل ہو گا جب اچانک مجھے ایک نسوانی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ میرے ہونٹ بدستور ہلتے رہے لیکن میں نے اپنے کان آواز کی سمت لگا دیے۔ تب دوبارہ وہی آواز نسبتاً قریب قریب محسوس ہوئی۔ ہلکی ہنسی کی آواز نہایت دل کش اور سریلی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا گویا فضا میں گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور مبہوت رہ گیا۔

وہ سترہ اٹھارہ برس کی ایک حسین و جمیل سروقد دوشیزہ تھی۔ اس کے اعضا سڈول اور بہت دل فریب تھے۔ اس کے جسم سے دودھیا کرنیں خارج ہو رہی تھیں اور انگ انگ سے شباب پھوٹا پڑتا تھا۔ میں نے متانہ کے بعد یہ دوسری حسین لڑکی دیکھی تھی جس کا روئے زمین پر شاید کوئی جواب نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ حسن و شباب کی ملکہ اس پر ہیبت مقام پر کہاں سے وارد ہوئی ہے..... کیا یہ شالو کا آلہ کار یا پھر اس کا کوئی نیا شکار ہے۔ بہرکیف وہ کوئی بھی ہو بے حد حسین اور نازک اندام تھی لیکن اس نے ایک قیمتی بھڑکیلا لیکن باریک لباس تن زیب کیا ہوا تھا جس سے اس کا نقرئی اور مسحور جسم اور نمایاں ہو گیا تھا۔ میں فطرتاً عورت کے معاملے میں بڑا کم زور واقع ہوا ہوں۔ چناں چہ اس پری وش کو اشتیاق اور دل چسپی سے دیکھنے لگا۔

یکا یک پھر وہی کھنکتی ہوئی نقرئی ہنسی سنائی دی اور مجھے یوں لگا جیسے فضا میں موتی سے بکھر گئے ہوں۔ ایسی درد بھری اور جادو بھری اور جادو اثر آواز اس سے پہلے میں نے کبھی بھی نہیں سنی تھی۔ دفعتاً مجھے جاپ پڑھنے کا دھیان آیا اور میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں لیکن اب یہ مشکل آن پڑی کہ عمل کے الفاظ میرے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی سوچنا شروع کر دیا اور کچھ دیر بعد جاپ یاد کرنے میں کامیاب ہو گیا اور تیزی سے پڑھنے لگا۔ پھر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہ قیامت خیز انگڑائیاں لے رہی تھی اور اس کیفیت سے اس کے فراز کا حصہ نیم عریاں ہو گیا تھا۔ میں نے پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں اور جاپ کرنا شروع کر دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس کا سحر دنیا و مافیہا

سے ایسا بے نیاز کر دیتا کہ خود کو تو کیا جاپ بھی بھول جاتا۔ غلاظت کی پستی میں ایسا گرتا کہ اس سے باہر نکلنا ناممکن سا ہو جاتا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ شالو کی آلہ کار اور مجھے پھانسنے کے لیے آئی ہے۔ کیوں کہ عورت کے حسن و شباب کا جادو ہر جادو کو پل بھر میں ماند کر دیتا ہے۔ بروقت میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

مجھے جاپ کرتے ہوئے چند لمحے گزرے ہوں گے کہ دفعتاً فضا میں ہیجان انگیز سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ یہ ایسی جذبات انگیز آواز تھی کہ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور بس دیکھتا رہ گیا۔

اس حسن و شباب کے پیکر نے اپنا لباس بدل لیا تھا۔ وہ جس لباس میں ملبوس تھی اس میں وہ بے لباسی کی حالت میں دکھائی دی۔ پھبت ایسی قیامت خیز تھی کہ نظریں تھیں کہ چندھیانے لگیں۔ سحر زدہ نظروں سے اس قالہ کے باریک سے باریک خدوخال کو جو لباس میں بے حجاب ہو رہے تھے دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں بے مثال اور پرشکوہ سراپا کے نشیب و فراز سے نگاہیں ہٹنے کا نام نہ لے رہی تھیں۔ وہ کسی ضدی اور سرکش بھیڑیے کی طرح گھورے جا رہی تھیں۔ میں اس کے خواب آفریں تناسب اور دل کشی کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ میں شکاری تھا۔ شاعر نہیں..... وہ عورت نہیں تھی قیامت تھی۔ اس کے چہرے اور سراپے سے نظریں ہٹا لینا مرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے پھر بھی اپنے جذبات پر قابو رکھا۔ میری جگہ کوئی مرد ہوتا تو وہ بہک جاتا اور اس کا پیر پھسل جانا یقینی تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے جذبات اس کے فراز اور نشیب کو دیکھ کر بے قابو ہو رہے ہیں تو میں نے آنکھیں بند کر کے جاپ شروع کر دیا۔

لیکن اس مرتبہ جاپ بالکل ہی بھول چکا تھا۔ میں نے ہزار کوشش اور جتن کیے مگر الفاظ ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے تھے اور ان کی جگہ حسینہ کا سراپا ذہن کے پردے پر رقصاں تھا۔ میں عمل یاد کرنے کی کوشش کرنے ہی لگا تھا کہ اچانک وہی جذبات آ گئیں اور ہیجان انگیز سرگوشیاں پھر میرے کانوں میں گونجنے لگیں۔ میں بے چین اور بے اختیار پھر اس شعلہ مجسم کی طرف دیکھا۔ مگر اب جو نظر اٹھائی تو بس جم کر رہ گئی۔ وہ قاتلہ فطری حالت میں آ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں بہک کر پستی میں گرتا فضا میں ایک ہولناک قہقہہ گونجا۔ اس مرتبہ وہ حسینہ نہیں بلکہ شالو میرے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

شالو کو سامنے دیکھ کر میری روح تک کانپ گئی۔ شباب کا نشہ سر سے اتر چکا تھا اور دردناک موت سامنے کھڑی نظر آئی۔ ادھر شالو قہقہے پر قہقہے لگا رہا تھا۔ وہ اپنی اس کامیابی پر آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ چناں چہ میں نے موقع غنیمت جانا دائرے کی طرف دوڑا۔ میں نے اس شعلہ مجسم کو دبوچنے کے لیے دائرے سے باہر آ کر حماقت کی تھی۔ میں کرتا بھی کیا..... اس قالہ عالم نے ایسا جادو چلایا تھا میں اس کی زد میں آ گیا تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری گردن شکنجے میں کس دی گئی ہو۔ شالو کے ہاتھ کی آہنی گرفت بہت سخت تھی۔ اس کی انگلیاں گوشت میں پیوست ہوتی معلوم دے رہی تھیں۔ اس نے ایک اور قہقہہ لگایا اور پھر کہنے لگا۔

''اب تو ہرگز مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ دیکھ تیرا علم میری عظیم قوتوں کے سامنے کس طرح بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔ مجھے معلوم کہ تو نتانہ کو آزاد کرانا چاہتا ہے لیکن یہ تیری حسرت کبھی بھی پوری نہ ہو گی۔''

اس نے ایک اور فلک شگاف قہقہہ لگایا اور میری گردن دبوچے ہوئے اس مخصوص کمرے میں لے کر پہنچ گیا۔ اس نے مجھے ستون سے باندھ دیا اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''آج میں تجھے فرار ہونے کا موقع نہیں دوں گا آدم زاد.....! آج میں تیرے گوشت سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانے میں دیر نہیں کروں گا..... تو سمجھتا تھا کہ شالو کو تابع کر لے گا لیکن شالو نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ میں نے آخری اور کارگر تیر اپنے ترکش میں

رکھ چھوڑا تھا.....عورت .....آہاہاں.....عورت.....پرشباب اور حسین عورت مجھے احساس ہو گیا تھا کہ تو خوف و دہشت سے مرعوب ہونے والا نہیں .....تیرے لیے حسن و شباب کے چارے کی ضرورت تھی .....عورت میں بڑی قوت ہے، بے پناہ دل کشی کی کشش رکھتی ہے.....اس کے جسمانی نشیب و فراز کے جادو کو تو نے دیکھا نا.....؟ اس نے تجھے کیسا پاگل کر دیا۔ بے وقوف بنایا۔ تو جان گیا حسین عورت کیا ہوتی ہے۔''

شالو کا مکروہ اور گھناؤنا قہقہہ میرے کانوں میں گرم گرم سیسہ انڈیلتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہیت تبدیل ہونے لگی۔ اس کا چہرہ اور بھیانک اور سفاک ہوتا گیا۔ دانت بڑے ہو کر ہونٹوں سے باہر نکل آئے اور منہ کا دہانہ پھیل گیا اور خون کی طرح سرخ ہو گئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ پھر وہ تیزی سے میری جانب بڑھا اور اپنا طاقت ور ہاتھ بڑھا کر ایک جھٹکے سے میری قمیض پکڑ لی۔

میں کمر تک برہنہ ہو گیا تھا۔ شالو نے خوں خوار نظروں سے میرے برہنہ جسم کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ دفعتاً وہ میری طرف جھپٹا اور میرے بازو میں اپنے نوکیلے دانت گاڑ دیے۔ پھر اس نے ایک جھٹکا دیا اور میرے جسم سے ایک بوٹی اڑا لے گیا۔

میں درد کی شدت سے چیخ اور تڑپ کے رہ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ لیکن ہمت کر کے اپنے ہوش و حواس بحال رکھے اور اس آدم خور راکھشش کے دوسرے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ جو میرے گوشت کو بڑی رغبت سے اپنے دانتوں سے چبا رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی باچھوں سے خون بہہ رہا تھا اور اس سے وہ ایک مکمل درندہ دکھائی دیتا تھا۔

شالو میرا گوشت حلق سے اتارنے میں مصروف تھا کہ کمرے میں یکا یک روشنی کا جھماکا سا ہوا اور میں ششدر رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ مگر یہ ایک سو فیصد حقیقت تھی کہ سادھو مہاراج کا وہی موکل میرے قریب نمودار ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موتیوں سے مرصع دستے کی ایک تلوار تھی۔ وہ بہت عجلت میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اسی تلوار سے میری رسیاں کاٹیں اور تلوار فوراً ہی میرے ہاتھ میں تھما دی۔

یہ سب کچھ چند لمحوں میں عمل پذیر ہو گیا اور جب شالو ہوشیار ہوا تو میرے ہاتھ میں تلوار آ چکی تھی۔

اس نے غضب ناک ہو کر اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور دوسرے ہی لمحے ایک وزنی گرز اس کے ہاتھ میں تھا جس کے اگلے حصے سے شعلے نکل رہے تھے اور اس سے پہلے کہ سادھو مہاراج کا موکل تلوار میرے حوالے کر کے کمرے سے غائب ہو جاتا شالو نے پوری قوت سی گزر کر ضرب اس کے سر پر لگائی اور کمرا ایک دل خراش چیخ سے گونج اٹھا۔

اس لمحے موکل کے جسم سے شعلے نکلنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ شعلے چمکیلے غبار میں تبدیل ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد کمرے میں میرے اور شالو کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ موکل شاید ختم ہو چکا تھا۔ یہ سمجھ ایسا نہیں تھا کہ میں دیکھ سکوں کہ وہ زندہ ہے مر چکا ہے۔ کیوں شالو اس لمحہ فرشتہ اجل بنا کھڑا تھا۔

شالو نے میری طرف بڑے غصے اور حقارت سے دیکھا اور تڑخ تے لہجے میں بولا۔

''تم سلیمانی تلوار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہو؟''

''ہاں.....'' میں نے فضا میں تلوار لہرائی۔ اس میں ایسی چمک تھی اور اس کی دھار اس قدر تیز تھی کہ وہ کسی بھی گینڈے، تیندوے، شیر ہاتھی اور اژدھے کی گردن پر رکھنے کی دیر تھی کہ وہ آپ ہی آپ کٹ جاتی۔ یہ تم دیکھ رہے ہو نا یہ کس قدر خطرناک ہے۔ تمہاری گردن لال گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دے گی۔''

''یہ تمہاری بھول ہے کہ تم اس تلوار سے میری

گردن کاٹ دوں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

"یہ میری نہیں تمہاری بھول ہے..... یہ سلیمانی تلوار ہے۔ لکڑی کی تلوار نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم مجھے اس کے چلانے سے باز نہیں رکھ سکتے۔"

"لیکن میں تمہیں اس کے استعمال کا موقع ہی نہیں دوں گا..... تم کیا جانو کہ تلوار کیسے چلائی جاتی ہے۔ یہ رائفل نہیں ہے جو فائر کر دو..... میں تمہارا کام کر دوں گا۔ تمہارے چیتھڑے اڑا دوں گا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اور اس پر حملہ آور ہوتا شالو شعلے برساتا گرز سنبھال کر مجھ پر اک دم سے ٹوٹ پڑا۔

اگر میں چوکنا اور مستعد نہ ہوتا اور اک دم سے برقی سرعت سے ایک جانب نہ ہٹ گیا ہوتا تو میرا خاتمہ یقینی تھا۔ اس نے مجھ پر بھرپور حملہ کیا اور میں چالاکی سے جھکائی دے گیا۔ اس کا وار خالی گیا تھا۔

وہ پھر اور مشتعل ہو گیا۔ کیوں کہ اسے توقع نہیں تھی کہ اس کا وار خالی جائے گا۔ پھر وہ گرز لے کر میری طرف لپکا۔ میں اس سے چند قدم فاصلہ پر تھا۔ وہ تابڑ توڑ حملے کرنے لگا۔ وہ مجھے حملہ کرنے کی مہلت دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ مجھے تلوار استعمال کرنے کا موقع نہیں دے گا۔

اس کے حملے اس قدر شدید اور تیز تھے کہ میرے لیے اپنا بچاؤ کرنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ اس پر حملہ کیا کرتا میں اگر واقعی تلوار استعمال کرنا جانتا ہوتا تو شاید اب تک اس کی گردن اڑا چکا ہوتا۔ میری سب سے بڑی کام یابی یہ تھی اس کا ہر وار خالی جانے دے رہا تھا اور وہ یہ دیکھ کر پاگل ہو گیا۔ وہ لحہ بہ لحہ جنونی ہونے لگا تھا۔ اس کے حملوں میں مزید شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ اگر اس کا ایک وار بھی کام یاب ہو جاتا تو میرا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

پھر میں نے بھی دفاعی جنگ کے ساتھ ساتھ اکا دکا حملے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ مجھے آج بھی یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوتی ہے اس امر پر شالو کے..... طوفانی حملوں سے بچنے کی قوت اور پھرتی مجھ میں کہاں سے آ گئی تھی۔ بہر حال مقابلہ طول پکڑتا گیا۔ شالو کے جوش و غضب میں اب اور اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا تھا اور ابھی تک تازہ دم دکھائی دیتا تھا۔ جب کہ میں نڈھال ہو چکا تھا۔ میرا جسم پسینے سے تر تھا۔ ہاتھ شل ہو گئے تھے۔ قدم ڈگمگانے لگے اور اب شالو سے مقابلے کی سکت تک باقی نہیں رہی تھی۔

شالو میری اس کیفیت کو بھانپ گیا تھا۔ چناں چہ اس نے پوری قوت جمع کی اور مجھ پر ایک زبردست حملہ کیا۔ اور میں نے اس سے اپنی بہترین حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور اس جگہ کھڑے کھڑے۔ غیر محسوس انداز سے آہستہ آہستہ سے ایک جانب کھسک گیا۔

شالو اپنے ہی زور میں گرز سمیت زمین پر آ رہا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا تھا۔ وہ سیدھا ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں برق کی مانند آگے بڑھا اور سلیمانی تلوار کی نوک سینے میں دل کی جگہ پر اتار دی۔

کمرے میں یکا یک ایک بھیانک چیخ گونجی.....

اور شالو کے جسم سے آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ پھر وہ شعلے دھیز، سیاہ اور بدبودار دھوئیں میں گھل گئے۔ رفتہ رفتہ کمرا دھوئیں سے بھر گیا۔ اس حالت میں وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ دم گھٹنے لگا۔ میں کھڑے رہ کر کرتا بھی کیا۔ فوراً ہی باہر نکل آیا تھا۔

اس سے بھاگتے قدموں کی آوازیں مجھے اپنی جانب آتی سنائی دیں۔

میں نے سامنے دیکھا۔ وہ نتاشہ تھی۔ وہ جوش و مسرت سے چیختی ہوئی میری جانب بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ شاید شالو کے مرتے ہی اس کا طلسم ٹوٹ چکا تھا اور وہ آزاد ہو گئی تھی۔

وہ میرے نزدیک پہنچتے ہی سرشاری اور والہانہ انداز سے لپٹ گئی۔ پھر ہم دونوں جذباتی ہو کر بہت دیر تک دنیا و مافیہا سے بے نیاز رہے۔ جب میں نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر سے اٹھایا تو دیکھا کہ فرط جذبات سے اس کی آنکھیں اشک برسا رہی تھیں۔ پھر اس نے میرے سینے پر اپنا سر رکھ کے کہا تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میرے محسن.....! میں کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں، تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھ پر جو احسان کیا اسے عمر بھر تک نہیں بھول سکتی۔ تم

میرے نجات دہندہ ہو۔ تم عظیم ہو..... عظیم ہو.....''

جذبات سے بھرے بھرے لہجے میں نہ جانے وہ کیا کیا کہتی رہی۔ بہرکیف میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا۔

''مجھے شرمندہ نہ کرو نتانہ! یہ میرا فرض تھا جو میں نے ادا کیا ہے۔ بس مجھے اتنا فخر ہے کہ میں ایک راکھشش کے پنجے سے ایک مظلوم عورت کو نجات دلائی ہے اور دوسری تمام لڑکیوں کو تباہی سے بچایا ہے۔''

''واقعی تم قابل فخر ہو.....'' نتانہ نے پہلی بار مسکرا کے میری جانب دیکھا۔ پھر جذباتی سی ہوگئی۔ پھر اس نے الگ ہو کر میری آنکھوں میں جھانکا۔

''تمہاری پرستش کرنی چاہیے۔ تم دیوتا ہو۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں انسان ہوں انسان ہی رہنے دو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ طوسی کہاں ہے؟''

''طوسی.....!'' نتانہ نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ ''اسے شالونے ختم کر دیا ہے۔ کیوں کہ اس کے علم میں آ گیا تھا کہ اس نے تمہیں اپنے کمرے میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ جب تمہیں آدم خور چمگادڑوں نے لہولہان کر دیا اور گوشت کھانا چاہتی تھیں تو اس نے بچایا تھا۔ تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ پھر اس نے تمہارے جسم اور زخموں پر وہ مرہم مل دیا تیر بہ ہدف تھا جس سے فوراً ہی تمام زخم مندمل ہو گئے اور پھر اس کے خلاف سازش میں مصروف تھی۔''

مجھے طوسی کی موت کا سن کر رنج ہوا۔ میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

''نتانہ.....! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ تم انکار تو نہ کرو گی؟''

''کیا بات ہے؟'' اس نے پراشتیاق لہجے میں دریافت کیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم اپنی قوم کو خیرباد کہہ دو اور انسانوں کی دنیا میں چلی چلو..... ہماری دنیا بڑی رنگین اور دل کش ہے۔ قدم قدم پر ایسی حسین دنیا بکھری ہوئی ہے کہ تم تصور تک نہیں کر سکتی ہو..... کیا تم میرا ساتھ دو گی؟''

نتانہ کی آنکھیں اک دم سے پھر پرنم ہو گئیں۔ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

''ایسا ممکن نہیں ہے میرے محسن! تم نے میری جان بچائی ہے۔ تم میرے نجات دہندہ ہو۔ مجھے تم سے بڑھ کر اس سنسار میں کوئی عزیز نہیں ہے۔ اگر کسی کا مجھ پر کوئی حق پہنچتا ہے تو وہ تم اور صرف تم ہو۔ میرا جسم، میری روح اور میری ایک ایک چیز تم پر سے نچھاور ہے مگر..... یہ ایک ایسا الم ناک واقعہ ہے کہ راکھشش ہوں اور تم انسان ہو۔ میں آتشی ہوں اور تم خاکی ہو۔ ہمارا ملاپ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہر چند کہ میں تمہیں چاہتی ہوں اور پہلی نظر میں تمہاری محبت کا شکار ہو گئی تھی اور اگر میں چاہتی تو تم پر حقیقت منکشف کیے بغیر اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتی تھی اور میرے لیے اس میں کوئی ضرر رساں بات نہیں تھی۔ لیکن کچھ عرصے بعد تمہارا ختم ہو جانا یقینی تھا جبکہ مجھے تمہاری موت کسی قیمت پر منظور نہیں ہے۔ تم میرے محسن ہو..... میرے نجات دہندہ ہو۔''

اتنا کہہ کر وہ زاروقطار رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔ تب وہ رندھی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

''میں تمہارے احسانات کا بدلہ چکا نہیں سکتی۔ پھر بھی ایک حقیر نذرانہ پیش کرنا چاہتی ہوں۔ تمہاری جیپ میں جو شکاری تھیلا ہے اسے حفاظت سے گھر لے جانا۔''

میری آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ پھر میں نے جذباتی ہو کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ چند لمحوں کے بعد رخصت ہو کر آ گیا۔ جیپ کے نزدیک پہنچا تو وہ اسی حالت میں موجود تھی۔ میں نے شکاری تھیلا اٹھا کر دیکھا۔ وہ سونے کے بڑے بڑے ڈلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کا وزن ایک من سے زیادہ ہی ہوگا۔ میں نے تھیلے کو اسی جگہ رکھ دیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہر چند کہ جیپ چلاتے ہوئے میری نظریں سڑک پر مرکوز تھیں لیکن میری نگاہوں کے سامنے نتانہ کا چہرہ رقصاں تھا اور میں ایک کسک اور خلش محسوس کر رہا تھا۔

☆☆

حبس کا عالم

صفیہ سلطانہ

ہمارے معاشرے میں عورت کو اتنا بے وقعت کیوں تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھا کیوں نہیں جاتا۔ کیوں عورت محض ایک کھلونا ہے، جب اور جس وقت چاہیں کھیلیں اور چھوڑدیں۔ ایک ستم زدہ کا قصہ، اس نے پہلی محبت اسکول کے زمانے میں کی تھی مگر اس کے ساتھ دھوکا ہوا۔ دوسرا زخم اپنے شوہر سے ملا اور پھر اسے ایک ہمدرد مل گیا۔ مگر اس کی ہمدردی میں بھی مفاد پوشیدہ تھا۔

محبت کدہ میں مقید ایک شکستہ دل عورت کی بپتا.....!!

اس روز ردا اور میں اسکول سے آرہے تھے۔ ردا میری چھوٹی بہن ہے اور میں اس اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ پہلی بار ''سچی داستانیں'' پڑھا تو دل ہمک ہمک کے سر اٹھانے لگا کہ افسانے بہت لکھے ہیں۔ اب حقیقتیں لکھو تو تمہاری تحریر کا بھرم کھلے لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس کی کہانی لکھوں؟ دنیا کی بیشتر عورتیں ظلم وستم کی چکی میں پس رہی ہیں۔ کس کے سینے پر سے سل اٹھاؤں؟ ہمہ وقت یہی سوچ تھی لہٰذا اسکول سے واپسی پر بھی ذہن انہی سوچوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ اس وقت بھی میرا ذہن کہانی کے تانے بانے بن رہا تھا کہ ردا کی آواز آئی اور میں ایک سمت ہوگئی۔

ابھی ہم کچھ دور ہی گئے تھے کہ ردا نے کہا۔

''آپی! بہت پیاس لگ رہی ہے۔''

''پیاس تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔'' میں نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''مگر اس سنسان سڑک پر تمہیں پانی کہاں سے ملے گا؟ سڑک کے کسی طرف بھی کوئی گھر نہیں ہے۔''

''مگر مجھ سے نہیں چلا جارہا۔'' ردا نے احتجاج کیا۔

''اچھا! کچھ دیر ستا لیتے ہیں۔'' میں نے اپنی اکلوتی سینڈل پر جھکتے ہوئے کہا جس کا ٹوٹا بکل مجھے بار بار چلنے میں تکلیف دے رہا تھا۔ پرس میں سے آفس کا رکھا ہوا پیپر ویٹ نکالا اور کیل اندر دبا دیا پھر بولی۔ ''چلو ردا! دیر ہوجائے گی۔''

''مگر آپی! پانی.....''

''اچھا! آگے چلو دیکھتے ہیں۔''

''ارے آپی! وہ دیکھیے ادھر ایک گھر نظر آرہا ہے۔ آیئے چلتے ہیں۔''

''آہستہ چلو! میری سینڈل.....''

''اف آپی! ایک تو آپ بور کرتی ہیں۔ نئی سینڈل نہیں خرید سکتیں؟'' اس نے اپنی دانست میں گویا مشورہ دیا۔

''اچھا! اب کے تنخواہ پر خرید لوں گی۔'' میں نے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکتے ہوئے کہا۔

وہ نیلے رنگ کا گیٹ تھا۔ بالکل میرے وجود کی طرح جگہ جگہ سے چٹخا ہوا۔ کال بیل بجائی مگر کوئی نمودار نہ ہوا۔

''آپی! کیا اس گھر میں سارے بہرے رہتے ہیں؟''

''چپ رہو، بری بات ہے۔''

ردا نے دوبارہ کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ''کمال ہے اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ''حضرت عیسیٰ بھی ''قم!'' کہہ دیتے تھے تو مردہ جاگ جاتا تھا مگر یہاں کا تو۔''

اس سے پہلے کہ اس کا جملہ مکمل ہوتا، کسی خاتون نے گیٹ کھولا۔ خاتون گیٹ سے زیادہ شکستہ اور بدحال نظر آتی تھیں۔

''معاف کیجئے گا زحمت دی۔ یہ گھر آپ ہی کا ہے ناں۔''

''جی ہاں! اور تصحیح کر لیجیے کہ یہ مکان ہے، گھر نہیں آیئے! اندر آیئے۔''

وہ ہمیں اپنی ہمراہی میں ڈرائنگ روم میں لے گئیں۔ نفاست سے سجا ہوا گھر ان کے اعلا ذوق کی نشان دہی کر رہا تھا۔ ''فرمایئے! کیسے زحمت کی؟''

''میں ششم کلاس میں پڑھتی ہوں۔ یہ میری آپی ہیں۔ اسی اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ آج رکشا لینے کے لیے نہیں آیا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ آج 25 مئی ہے اور تنخواہ ملنے میں پورے چھے دن باقی ہیں لہٰذا میں نے آپی سے کہا کہ چلیں، آج لیفٹ، رائٹ کر کے چلتے ہیں۔ پیسے بھی بچ جائیں گے۔ پورے چار روپے۔'' ردا کسی ریکارڈ کی طرح بجنے لگی تھی۔ میں نے آہستہ سے ردا کو ٹہوکا دیا۔

''تو کیا ہوا آپی!'' اس کا ٹیپ پھر چل پڑا۔ ''آپ کو پتا ہے نا، کتنی گرمی ہے۔ مجھے پیاس بہت لگ رہی ہے۔ مجبوراً آپ کو زحمت دی۔ اگر تیز چلتے تو گھر پہنچ جاتے مگر آپی کا سینڈل.....''

میں نے پھر اسے کہنی ماری۔

''ارے کیا ہوا آپی! ہاں تو پلیز پانی پلا دیں۔''

''بہتر!'' وہ کسی کو پانی لانے کے لیے کہنے گئیں اور چند لمحوں بعد واپس آ گئیں۔ ان کے چہرے پر

عجیب پراسراریت تھی۔

''معاف کیجیے گا۔ ردا کو بولنے کی بہت عادت ہے۔ ہر ایک سے بہت جلد فری ہو جاتی ہے۔'' میں نے خجل ہوتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں، بہت پیاری بچی ہے۔ ادھر آؤ بیٹا!'' انہوں نے شفقت سے ردا کو اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک باوردی ملازم مشروب کی ٹرے لے کر آیا۔ ٹرے میں میزبان نے مہمانوں کے مزاج کا خیال رکھا تھا۔ اس میں اسکوائش اور روح افزا دونوں تھے۔

''لیجیے، نوش فرمایئے۔''

''بہت تکلیف کی، سادہ پانی ہی چل جاتا۔''

''تو کیا ہوا آپی؟ قسم سے مزا آجائے گا۔ کبھی کبھار ہی تو پینے کو.....''

''ردا! حد میں رہو۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''سوری آپی!''

نہ جانے وہ کیوں اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتی تھی۔

''یہ دکھایئے ردا!'' اسکوائش کا گلاس مجھے تھماتے ہوئے اس کی نظر میرے بوسیدہ پرس میں رکھے ہوئے رسالے پر پڑی۔

''یہ تو نیا ڈائجسٹ ہے۔ غالباً اس بار ہا کردے کر نہیں گیا اب تک۔''

''جی ہاں! اس ماہ کا ہے۔'' میں نے سپ لیتے ہوئے کہا۔

''آنٹی لیتا ہے۔'' ردا پھر بول پڑی۔ ''آپی بھی افسانے وغیرہ لکھتی ہیں۔ اس میں بھی ان کی ایک کہانی ہے۔ آپ رکھ لیں۔ پڑھ کر دے دیجیے گا۔''

''آپ کہانی و افسانے بھی لکھتی ہیں!'' وہ خاصی متعجب ہوئیں۔

''جی ہاں! بس کبھی کبھار اپنے جیسے کم مایہ افسانے لکھ لیتی ہوں۔''

''اسم گرامی کیا ہے آپ کا؟'' وہ رسالے کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولیں۔

''صفیہ سلطانہ.....''

''صفیہ سلطانہ! یہ نام تو سنا ہوا لگ رہا ہے۔''

''نہیں جناب! پڑھا ہوا لگ رہا ہوگا۔'' ردا عادت سے مجبور تھی۔

''ہاں! ہاں بیٹا! بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ گو کہ بہت رسمی سا جملہ ہے مگر یقین کہ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ آپ اتنی کم عمر ہوں گی۔ افسانے تو دل کی گہرائیوں سے ڈوب کر لکھے جاتے ہیں۔ گر مناسب سمجھیں تو کل یہ لے جایئے گا۔''

''بہتر! اب اجازت دیں۔'' میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''کل ضرور آیئے گا۔'' انہوں نے خلوص سے کہا۔

''کیا میں اپنی میزبان کا نام پوچھ سکتی ہوں؟''

''مریم..... ٹھہریے میں ڈرائیور سے کہتی ہوں وہ آپ کو.....''

''نہیں باجی! زحمت نہ کریں۔ ہمارا گھر بس زیادہ دور نہیں ہے یہاں سے۔ ہم چلے جائیں گے۔ خدا حافظ!''

''خدا حافظ۔''

دو تین روز بعد ردا نے پھر رٹ لگائی۔ ''آپی! چلیے نا مریم آنٹی کے گھر۔ رسالہ بھی واپس لینا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ہاتھ.....''

''ردا! اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''بس آپی! آج چلیں۔'' اس نے پھر اصرار کیا۔

میرا آخری ایک پیریڈ فری تھا لہٰذا صدر مدرسہ کو کہہ کر میں آ گئی۔ مریم باجی مجھے خود بھی بہت اچھی لگی تھیں۔ باوقار، خوبرو، مہذب خاتون! جن کے نام میں بھی تقدس کا بے پناہ احساس پوشیدہ تھا۔ آج ردا کو کال بیل بجانے کی زحمت نہیں ہوئی۔ گیٹ کھلا تھا۔ وہ لان میں چیئر ڈالے بیٹھی تھیں۔ ان کی گود میں ایک رسالہ تھا۔ میں اور ردا اندر چلے گئے۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ ردا نے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے تو وہ چونک پڑیں اور اسے لپٹا لیا۔ ''بہت دنوں بعد آئیں۔''

''ارے! بہت کہاں، دو دن کے بعد آئیں۔

آپی تو آ ہی نہیں رہی تھیں۔''

وہ مسکرا دیں۔ ''آؤ صفیہ! بیٹھو بلکہ اندر چلے ہیں یہاں ہلکی ہلکی پش کا احساس ہو رہا ہے۔''

تیز دھوپ میں چل کر آئے تھے لہٰذا ان کے ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں بے حد طمانیت کا احساس ہونے لگا۔

''مطالعہ فرمالیا آپ نے.....؟''

''جی ہاں! مگر تمہاری تحریر پسند نہیں آئی۔''

مجھے اپنی کاوشیں بے کار معلوم ہونے لگیں۔

''سب جھوٹ ہے۔ جھوٹ لکھا ہے تم نے۔''

ان کے چہرے پر نفرتوں کے سائے لہرائے۔

''مگر اس رسالے میں تو تمام کہانیاں سچی ہوتی ہیں۔'' میں نے اپنی پیشانی پر ٹشو پیپر پھیرتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری تحریر کی بات کر رہی ہوں۔ اس سے پہلے تمہاری تحریر کردہ کہانی پڑھی تھی۔ سچ لکھنا سیکھو۔''

''جی بہتر! میں کسی سچے واقعے کی تلاش میں ہوں۔''

''اگر میں ایک کہانی سناؤں تو لکھ لوگی؟'' ان کے لہجے میں ہلکا سا تمسخر تھا۔

''جی ہاں.....! آپ بتایئے۔''

''مگر تمہیں اپنے الفاظ میں لکھنا ہوگی۔ اچھا ادیب وہی ہوتا ہے جو کہانی کو اس طرح بیان کرے گویا اس پر بیتی ہے۔ تمہارا انداز تو بہت اچھا ہے لیکن تم مرد کی تعریف میں حد سے آگے بڑھ جاتی ہو۔ اسے دھرتی سے اٹھا کر آکاش پر بٹھا دیتی ہو۔ میری کہانی میں تم ایسا نہیں کروگی۔ یہ تمہارا افسانہ نہیں، میرا سچ ہوگا۔'' ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''جی ہاں! سچ ہوگا بتایئے۔'' میں ہمہ تن گوش ہو گئی۔ ان کی نظریں دور کہیں جا کر خلاؤں میں اٹک گئیں۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میرا دل کڑھنے لگا۔

''پلیز باجی! روئیں مت۔''

''بہنے دو ان آنسوؤں کو۔ بے وفائی کے آنسو ہیں۔ اندر رہے تو طوفان اٹھا دیں گے۔'' وہ اپنے ماضی کے تمام دروازے کھول کر ان میں جھانکتی ہوئی بولیں۔

''پہلی سچی بات تو یہ ہے کہ تم جس عورت کی کہانی سننے جا رہی ہو، اس کے ساتھ کسی ایک مرد نے نہیں بلکہ تین مردوں نے بے وفائی کی ہے۔ اس کے گلے میں بے وفائی کے تین ہار حمائل کر دیے ہیں۔ میرا تعلق شریف گھرانے سے تھا۔ ہم تین بہن بھائی تھے۔ ایک بھائی مجھ سے بڑے تھے۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن حمیرا تھی۔ اپنے نام کی طرح خوب صورت اور پیاری سی۔ بھیا بڑے تھے۔ میرا تمام پیار حمیرا کے لیے تھا۔ امی ابو کی آنکھوں کا تارا تھی۔ ہمارا گھرانا زیادہ ایڈوانس نہیں تھا لیکن ابو تعلیم کو عورت کا زیور کہا کرتے تھے لہٰذا امی کے لاکھ منع کرنے کے باوجود انہوں نے مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول ہمارے گھر سے ذرا فاصلے پر تھا۔ میں جواد بھائی کے ساتھ اسکول جایا کرتی تھی۔ جواد بھائی کا اسکول ہمارے اسکول کے قریب تھا۔ پہلے میرے اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بجتی تھی۔ جن لڑکیوں کے بھائی دوسرے اسکول میں پڑھتے تھے، وہ وہیں بیٹھ کر ان کا انتظار کرتی تھیں۔ جب جواد بھائی کے اسکول کی چھٹی ہو جاتی تو ہم سب ٹولیوں کی شکل میں گھر لوٹتے۔ بہت سہانے تھے وہ دن۔ وقت کا قافلہ یونہی رواں دواں رہا۔ ہم تعلیمی منازل طے کرتے نویں جماعت میں آ گئے۔

ان دنوں ہماری کلاس میں ایک نئی لڑکی فریحہ داخل ہوئی۔ بہت کومل اور پیاری سی۔ میری اس سے دوستی ہوگئی۔ اس نے مجھے بتایا۔ ''ہم نواب شاہ سے آئے ہیں۔ میرے بھائی نے بھی یہاں داخلہ لے لیا ہے۔'' اس نے جواد بھائی کے اسکول کا نام بتایا۔

اس نے یہ بھی بتایا کہ بس ہم دو بہن بھائی ہیں۔ حال ہی میں ابا جان کا تبادلہ یہاں ہوا ہے۔

اب واپسی پر میں اور جواد بھائی ہی نہیں بلکہ احسن اور فریحہ بھی ہوتے تھے۔ احسن جواد کا دوست بن چکا تھا۔ اسی طرح میری اور فریحہ کی دوستی بہت پائیدار ہو چکی تھی۔ ہم ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے تھے۔ ایک بار فریحہ کو بخار ہو گیا۔ ملیریا کا اثر تھا میں نے سوچا کہ اسکول سے ناغہ کر دوں مگر ابو نے کہا کہ اسکول کا حرج ہو

گا۔تم کو میں چھوڑ آتا ہوں۔ان دنوں جواد بھائی اپنے اسکول کی فٹ بال ٹیم کے ساتھ دوسرے شہر گئے تھے۔

ابو جی! مجھے اسکول چھوڑ گئے اور جاتے وقت کہہ گئے کہ واپسی پر انتظار کرنا، میں لینے آؤں گا۔چھٹی کی گھنٹی بجی تو تمام لڑکیاں گیٹ سے باہر آ گئیں۔کچھ بھائیوں کا انتظار کرنے لگیں اور کچھ تانگوں، رکشوں میں بیٹھ کر گھر چلی گئیں۔

مجھے ابو کا شدت سے انتظار تھا مگر نہ جانے وہ کیوں اب تک نہیں آئے تھے۔اتنے میں احسن کے اسکول کی چھٹی ہوگئی اور کچھ دیر بعد وہ دوستوں کے ساتھ گیٹ سے باہر نکلا۔مجھ پر نظر پڑی تو چونک گیا۔''ارے مریم! تم اب تک یہاں ہو؟ چلو گھر چلیں؟''

''نہیں احسن! ابو نے کہا تھا کہ میں چھٹی کے وقت لینے آؤں گا۔تم انتظار کرنا۔''

''مگر یہ دیکھو تو.....'' اس نے کلائی آگے کی۔''ڈھائی بجنے والے ہیں۔اگر میں بھی چلا گیا اور تمہارے ابو نہ آئے تو کس کے ساتھ جاؤ گی؟ آؤ چلو۔''

''نہیں احسن! ابو.....''

''چلو بھئی! ضد نہیں کرتے گھر جا کر بتا دینا۔''احسن جبراً لے آیا تھا۔''آؤ۔''

میں اس کے ساتھ چل دی۔ہم دونوں تعلیمی موضوعات پر ادھر ادھر کی باتیں کرتے گھر آ گئے۔اس کے ساتھ میری یہ پہلی تفصیلی گفتگو تھی۔

فریحہ ابھی تک بیمار تھی اور جواد بھیا بھی نہیں لوٹے تھے لہٰذا میں اور احسن اسکول اکٹھے آتے جاتے رہے۔ابو جس فیکٹری میں ملازم تھے، وہاں کا باس انہیں روزانہ ایک گھنٹے کی چھٹی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ فیکٹری کا کام بڑھ گیا تھا۔یوں بھی دونوں گھرانوں میں اتنا آنا جانا تھا کہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ فریحہ اور احسن الگ الگ ہیں۔

ایک بار میں اسکول کے گیٹ سے باہر نکلی تو احسن بائیک لیے کھڑا تھا۔

''کس کی اڑا لائے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنی ہی سمجھو۔کل ہی ابا نے لا کر دی ہے۔''

''مگر صبح تو یہ تمہارے پاس نہیں تھی۔''

''ارے بابا! بحث کیوں کر رہی ہو؟ دوست سے مانگی ہے۔تم بھی عیش کرو۔''

''مگر میں پیدل جاؤں گی۔''

''اچھا! تم پیدل پیدل آنا۔''اس نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔''بائے!''

''ٹھہرو احسن! مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کمال ہے! دیکھو پیچھے کیریئر بھی ہے۔چلو آؤ ورنہ.....''اور میں ڈرتے ڈرتے بائیک پر بیٹھ گئی مگر بقول احسن کے، اس روز میں اس کی بائیک پر ہی نہیں بلکہ دل کے سنگھاسن پر بھی بیٹھ گئی تھی۔(یہ بات اس نے بعد میں کہی تھی۔)

میں نے اب پیچھے سے کیریئر کو مضبوطی سے تھام لیا۔

''احسن پلیز! آہستہ چلاؤ۔'' میں بائیک پر پہلی بار بیٹھی تھی لیکن بائیک کی رفتار بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔بائیک ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔

''چلو اترو۔''

میں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو ششدر رہ گئی۔سامنے نہ میرا گھر تھا، نہ احسن کا۔بائیک پارک کے سامنے کھڑی تھی۔

''احسن! کہاں لے آئے ہو مجھے؟'' غصے سے میرا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''ٹیک اٹ ایزی! ٹھہرو بتاتا ہوں۔ہم اسکول سے پیدل گھر جاتے ہیں تو کتنی دیر لگتی ہے؟''

''تقریباً 45 منٹ۔''

''آج اگر ہم دس منٹ میں گھر پہنچ جاتے تو جانتی ہو گھر والے کیا نتیجہ اخذ کرتے؟ شاید اسکول سے بھاگ آئے ہیں۔''

''نہیں احسن! میں امی کو بتا دیتی۔''

''پگلی! ہر بات امی کو نہیں بتائی جاتی۔آؤ اندر چلتے ہیں۔''

ہم گیٹ عبور کر کے اندر آئے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔یہاں وطن کے اور بھی نونہال موجود تھے جو گھر سے اسکول پڑھنے آئے تھے۔وہاں میری کلاس

فیلوز بھی تھیں۔ نائلہ، ریاض کے ساتھ، ربیعہ، احمر کے ساتھ، فوزیہ، منان کے ساتھ۔ جونہی ان کی نظر احسن اور مجھ پر پڑی، وہ عجیب انداز سے مسکرانے لگے۔ احسن اور میں ایک خالی بینچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے وقت گزاری کے لیے بایولوجی کی کتاب کھولی تھی۔

''عجیب بور لڑکی ہو! بھئی! یہاں کتابیں نہیں پڑھی جاتیں۔ سامنے دیکھو۔

میں نے سامنے دیکھا۔ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ''احسن! چلو یہاں سے۔ میرا دم گھٹ رہا ہے، میرا دل واقعی الجھ رہا تھا اس لیے میں احسن سے الجھ پڑی۔

''محسن نقوی کا ایک شعر سنو گی؟'' اب کے احسن کا لہجہ بدلا سا تھا۔

''نہیں! بس گھر چلو۔''

''سن لو! بڑی مشکل سے یاد کیا ہے۔ عرض کیا ہے۔''

چل میرے ساتھ کبھی تو کسی جنگل میں
میں تجھے شہر کے ماحول سے ہٹ کر دیکھوں

بہت خوب صورت لہجے میں اس نے شعر پڑھا۔ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''شعر سناؤں گا۔''

''احسن! پلیز گھر چلو۔''

''آؤ!'' اس نے بے زاری سے کہا۔

اب بائیک ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے ایک ہاتھ سے کیریئر اور دوسرے ہاتھ سے اسے تھام لیا۔ نہ جانے کیوں میں بے حد خوف زدہ اور افسردہ سی تھی کیونکہ مجھے دوسری لڑکیوں کی طرح لڑکوں سے شیر و شکر ہونا پسند نہیں تھا۔ نہ ہی ہمارے گھر کا ماحول اس بات کی اجازت دیتا تھا۔ احسن سارے راستے خاموش رہا تو میں نے جی کڑا کر کے پوچھا۔ ''ناراض ہو؟''

''نہ .....! نہیں تو تم نے میری بات کا غلط مطلب اخذ کیا۔ میرا مقصد یہی تھا کہ گھر پورا وقت کور کر کے پہنچیں۔ مجھے افسوس ہے۔ بہر حال آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔'' اس نے بائیک گھر کے سامنے روکتے ہوئے کہا۔

''آؤ! تمہیں چھوڑ آؤں۔''

''نہیں! بس میں چلی جاؤں گی شکریہ!''

☆☆☆

گھر آ کر میں دیر تک احسن کے اقدام کے بارے میں سوچتی رہی۔ آج اس کا لہجہ، اس کا انداز سب بدلا بدلا سا تھا اور وہ شعر..... میں اندر سے لرز سی گئی۔

فریحہ کا بخار طول پکڑ گیا۔ جواد کے دورے مزید کچھ دن بڑھ گئے۔ میں اور احسن تنہا اسکول جاتے رہے۔ اس کے پاس دوبارہ وہ بائیک نظر نہیں آئی۔ ہم دونوں کے درمیان خاموشی کا سلسلہ طویل تر ہوتا جا رہا تھا جسے خود اسی نے توڑا۔ ایک روز اسکول سے واپسی کے وقت پرسوچ انداز میں اس نے کہا۔

''مریم! خفا ہو اب تک؟'' پہلے میں نے اس سے پوچھا تھا اب وہ پوچھ رہا تھا۔

''نہیں تو۔''

''پھر بات کیوں نہیں کرتی ہو؟ تمام موضوع ختم ہو گئے ہیں؟''

''مجھے باتیں کرنا نہیں آتا۔'' میں نے قدموں پر نظریں جما کر کہا۔

''بہت دنوں سے جی چاہ رہا ہے کہ ایک بات کہوں تم سے مگر خود میں ہمت نہیں پاتا کہ شاید تم سن کر اور ناراض ہو جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں! میں ناراض نہیں ہوں گی۔''

''یہ بات، جو تم سے کہنے جا رہا ہوں گو کہ قبل از وقت ہے مگر جب جذبے جواں ہوں تو ان کا اظہار کر دینا چاہیے۔ بعد میں کیا فائدہ؟ مریم! میں شاعر نہیں ہوں کہ خوب صورت غزل کے پیرائے میں اظہار کروں۔ افسانہ نگار بھی نہیں ہوں کہ خوب صورت الفاظ پرو کر دل کی بات کہہ سکوں۔ میں تو بس ایک عام سا لڑکا ہوں! اعتراف کرتا ہوں کہ تم بہت اچھی لگنے لگی ہو۔'' احسن نے یہ جملے اس طرح کہے جیسے بڑی ریاضت کے بعد رٹے ہوں۔ ''تم خفا تو نہیں ہو گئیں؟'' وہ رک کر میرے چہرے پر اپنے جملوں کا ردعمل تلاش کرنے لگا۔

میں نے جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر اس کی سمت

دیکھا۔ وہ مجھے میٹرک کا طالب علم نہیں لگ رہا تھا بلکہ مدبر اور باوقار سا سلجھا ہوا مرد لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر دنیا سے ٹکرا جانے کا عزم تھا۔ میں نے دوبارہ نظریں جھکالیں تو وہ مسکرا دیا۔

''تھینکس مریم! بہت شکریہ! تم نے میری لاج رکھ لی۔ تمہاری خاموشی نے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ آؤ! آج سے ان راہوں پر قدم رکھتے ہیں جن پر پھول ہی پھول ہوں گے۔''

میں اس کی بات سن کر گنگنا رہوئی جا رہی تھی۔ فریحہ اب روبہ صحت تھی۔ جواد بھائی بھی اپنی ٹیم کے ساتھ دورے سے واپس آ گئے تھے۔ احسن اور میرے مابین پھر تکلف کی ایک دیوار حائل ہو گئی تھی۔ اس کی گہری گہری نظریں مجھ پر پڑتیں تو میں اندر ہی اندر پگھلنے لگتی۔ اس دن کے بعد گو کہ احسن سے دوبارہ ایسی گفتگو نہیں ہوئی تھی مگر نظروں کا تصادم ہزاروں داستانیں کہہ دیتا۔

☆☆☆

جواد بھائی اور احسن نے میٹرک کر لیا۔ جواد بھائی نے آرمی جوائن کر لی اور احسن مزید تعلیم کے لیے دوسرے شہر چلا گیا مگر جاتے جاتے آنکھوں سے مجھے انتظار کرنے کو کہہ گیا۔

وہ جواد بھائی کو خط لکھتا تو ڈھکے چھپے لفظوں میں میرے بارے میں بھی کچھ جملے ہوتے جنہیں پڑھ کر میں مسرور ہو جاتی۔

میں اور فریحہ میٹرک کر کے گھر بیٹھ گئی تھیں۔ اب ہمارا کام صرف امور خانہ داری کی ذمہ داریاں تھیں۔ امی نے مجھے کچن میں پہنچا دیا تھا کہ مرد کے دل میں اترنے کا راستہ معدے میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ دن بیتے ہوئے خوب صورت لمحوں کی یاد میں گزر رہے تھے۔

میٹرک کے امتحان کو ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے رشتے آنے شروع ہو گئے۔ امی، فریحہ کے کان میں بات ڈال دیتیں اور فریحہ مجھ سے عندیہ طلب کرتی۔ میں آنے والے رشتے میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتی۔ آخر ایک روز فریحہ نے مجھے گھیر لیا۔ ''تمہیں کس شہزادے کا انتظار ہے جو مسلسل چار برسوں سے انتظار کی آگ میں جل رہی ہو۔ ہے کوئی شہزادہ؟''

میرے لبوں پر مسکان بکھر گئی۔

''بتاؤ ناں! تم کس کی آس میں انکار کر رہی ہو؟ اگر تمہیں کسی کا انتظار ہے تو اسے بھول جاؤ۔ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔''

''نہیں فریحہ! ایسا مت کہو۔'' میں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''وہ ضرور آئے گا۔ مجھے یقین ہے۔''

''اچھا! بھلا نام تو بتاؤ اس کا؟''

''وقت آنے پر میں پتا چل جائے گا۔''

''مجھے ابھی بتاؤ ورنہ ہمیشہ کے لیے دوستی ختم۔'' فریحہ بولی۔

''تمہیں بتاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے۔ فریحہ میرے دل کی سلطنت تسخیر کرنے والا کوئی اور نہیں، تمہارا بھائی ہے۔''

''کون احسن؟ نہیں، تم مذاق کر رہی ہو۔'' وہ نہ صرف حیران بلکہ پریشان بھی ہو گئی تھی۔ ''گویا تمہیں احسن بھائی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ تم بھی کتنی بھولی بھالی ہو کہ ان کی باتوں میں آ گئیں۔ کاش! تم مجھے پہلے بتا دیتیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شروع میں امی جان کا ارادہ بھی تھا اور خود میری سوچ بھی اس رخ پر تھی مگر ایک سال قبل احسن بھائی کے خط نے سارے خواب خاک کر دیے۔''

میرے آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ احسن کی کہی ہوئی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ وہ میرا پہلا پیار تھا۔ معصوم اور سچا پیار! میں نے کہا۔

''فریحہ! بتاؤ، اس خط میں کیا لکھا تھا؟''

''نہیں مریم! مجھ سے ایسا نہیں ہو گا۔ مجھے افسوس ہے کہ احسن بھائی کی سوچ اتنی ناپختہ ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا فریحہ! کہہ دو سب جھوٹ ہے یا مجھے وہ خط دکھا دو۔ یقین کرو، وہ خط پڑھنے کے بعد میں نے اپنی بصارت زائل کر دوں گی۔ پلیز! مجھے۔'' میں رو ہانسی ہو گئی۔

''نہیں! تم ایسا ہرگز نہیں کرو گی۔ عورت کو مرد نے ہمیشہ کھلونا بنایا ہے۔ اب تم اسے مضبوط تر عورت بن کر دکھاؤ۔ کمزور اور بے بس لڑکیوں کی طرح آنسو مت بہاؤ۔ احسن بھائی اپنی امیر و کبیر مغرور کزن سے شادی

کرنا چاہتے ہیں تو تم بھی کسی اور سے کرلو۔ انہیں بتا دو، ان پر ثابت کردو کہ دنیا کی ہر لڑکی یادوں کی بیساکھی تھام کر تمام زندگی نہیں چل سکتی۔ اسے چلنا بھی نہیں چاہیے۔ اٹھو میری بہن! آنسو پونچھو اور نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو اور آئندہ کسی احسن پر بھروسا نہ کرنا۔'' مریم مجھے تسلی دیتے ہوئے خود بھی رو پڑی۔

پھر میری شادی ملک کے مشہور صنعت کار سیٹھ حیدر سے ہوگئی۔ شادی کی رات گھونگٹ اٹھانے کے بعد اس نے کہا۔ ''مریم! جانتی ہو، میں کیسا آدمی ہوں؟ سنو! میں سیلف میڈ آدمی ہوں۔ میری اندر ماضی کی آگ جل رہی ہے۔ بعض مردوں کے اندر یہ آگ بجھ جاتی ہے مگر بعض مرد ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔ ایسے میں جو عورت ان کے قریب آتی ہے، وہ جل کر بھسم ہو جاتی ہے لہٰذا تم بھی مجھ سے دور دور رہنے کی کوشش کرنا۔ میرا مطلب ہے کہ میرے کسی کام میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرنا، کوئی روڑا نہ اٹکانا ورنہ میں تمہیں بھی جلا دوں گا۔ جھلسا دوں گا۔''

میرا دل دھڑک اٹھا۔ سہاگ رات ہی اتنی خوف ناک باتیں سننے کو ملیں اور حیدر صاحب نے صرف کہا ہی نہیں تھا بلکہ کر بھی دکھایا۔ وہ میرے حسن اور جوانی کو ٹکسال بنانا چاہتے تھے۔ میں بجھی ہوئی عورت تھی اور وہ سلگتا ہوا مرد جس کی اندر کیریئر کی آگ جل رہی تھی۔ ان کے پاس سب کچھ تھا پھر بھی نہ جانے انہیں کس چیز کی طلب تھی؟ میرے اندر کی حسرتیں بھی ختم ہوگئیں۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کر مہینوں صورت نہ دکھاتے۔ ایسے میں گھر کے کام کاج اور دیگر تمام امور ان کا منیجر فہد سنبھالا کرتا۔ وہ اکثر امور میں مجھ سے ہی گفتگو کرتا۔ بات چیت کرنے میں اسے ملکہ حاصل تھا۔ خوب صورت آواز، دھیما لہجہ، اس کی شخصیت میں بڑا نکھار تھا۔ ہمارے درمیان تکلف کے تمام پردے گر گئے تھے۔ وہ ہر موضوع پر بے تکان بولتا تھا۔ اس کی گفتگو میں بڑی شائستگی تھی۔ اس کے باوجود میں نے ہمیشہ اسے اپنا ماتحت سمجھا۔ وہ میرا احترام کرتا تھا۔ مجھے ہمیشہ ''خاتون'' یا ''مادام'' کہتا تھا۔ ایک روز میں یونہی اداس بیٹھی تھی کہ فہد آ گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگا۔

''مادام! اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟''

''ہاں! ہاں! کہیں۔'' میں ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''مادام! زمین کی مجال کہاں کہ وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر بات کرے اس لیے ڈرتا ہوں کہ آپ برا نہ مان جائیں۔''

''نہیں! آپ بلا تکلف کہہ دیں۔''

''مادام! مجھے لگتا ہے کہ آپ اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں ہیں۔''

''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مسٹر فہد!''

''مان لیا کہ میں نے جھوٹ بولا ہے مگر آپ کس کس کو منع کریں گی کہ وہ یہ جھوٹ نہ بولے۔''

''اور کون کہتا ہے؟ مجھے بتایئے ذرا!''

''آپ کی آنکھیں۔'' وہ ایک دم میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرایا۔ ''منع کردیجیے ان آنکھوں کو جو ہر دم چغلی کھا کے سب کو بتاتی ہیں کہ آپ کا سر کا تاج سنہرا نہیں بلکہ کبھی بھی نہیں تھا۔ اپنے لبوں کو روک دیجیے جن پر شکوہ آ کر دم توڑ دیتا ہے۔ مسکراہٹ پر پہرے بٹھا دیجیے جس میں دل کا درد کھلا ہوتا ہے۔ اگر کوئی یہ سب زبانیں جانتا ہو تو بھلا چپ کیسے رہے گا؟ اگر میں آپ کا ملازم اور حیدر صاحب کا نمک خوار نہ ہوتا تو۔''

''تو آپ کیا کرتے؟''

''تو کب کا آپ کو آزاد کر چکا ہوتا۔ پنجرہ کھول دیتا۔ آپ کو یا کسی اور کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بھیگی چڑیا کو پنجرے میں بند رکھے۔''

وہ بول رہا تھا اور میں سن رہی تھی۔ میں نے دانستہ اسے منع نہیں کیا۔ برسوں بعد ایک ایسا غم خوار ملا تھا جس نے گہرائیوں میں اتر کر تمام راز پا لیے تھے جو میرے دکھ جانتا تھا، مجھے پہچان گیا تھا کہ بظاہر قہقہے لگانے والی یہ عورت اندر سے کتنی کھوکھلی ہے، بالکل ناریل کی طرح۔

''مادام! میں یہ جسارت تو نہیں کر سکتا جس کا اظہار نادانستگی میں کر گیا ہوں مگر آپ سے مخلص ہونے کے ناتے ایک بات ضرور کہوں گا کہ پنجرہ مت توڑیے مگر قفس کی تیلیاں ہٹا کر باہر کا نظارہ تو کریں پھر شاید

آپ کو حبس محسوس نہ ہو۔ ذرا باہر کی دنیا کا جائزہ لیجئے۔ پلیز! اپنے اندر کی عورت کا گلا مت گھونٹیں۔ اسے زندہ رہنے دیں۔ آج سے عہد کیجیے کہ آپ اداس نہیں رہیں گی۔ نہ مجھے اداس ہونے دیں گی۔''

میں نے نظریں اٹھا کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ میری جانب ہی محویت سے تک رہا تھا۔ بیک وقت دو زبانیں بول رہا تھا۔ اس نے میری ذات کے تمام بخیے ادھیڑ دیے تھے۔ اتنا صحیح تجزیہ کیا تھا کہ میرا اپنا وجود لرز کر رہ گیا تھا۔ جن سچائیوں کا میں تنہائیوں میں بھی اعتراف نہیں کر سکی تھی، فہد ایک لمحے میں تسلیم کرا گیا۔ کس قدر گہرا مشاہدہ رکھتا تھا میرے بارے میں۔

''اچھا مادام! مجھے اب اجازت دیجیے۔ معذرت طلب بھی ہوں کہ اپنی حیثیت اور مرتبے سے زیادہ کہہ گیا مگر میرے منہ سے نکلنے والا ایک لفظ بھی آپ کی ذات پر منطبق نہ ہوتا ہو تو مجھے یہاں آنے سے روک دیجئے گا۔ مجھے محبوس اور مقید پرندے پسند نہیں۔ آپ بھی پنجرہ توڑ دیجیے۔''

وہ چلا گیا۔ ساتھ ہی میرا رہا سہا سکون آرام، سب لے گیا۔ کیا خبر تھی کہ شادی کے بعد بھی ایسا سانحہ ہوگا کہ مجھ کو چین نہیں آئے گا۔ حیدر سے شادی کی تو یہی سوچا تھا کہ احسن کی بے وفائیاں بھلا دوں گی مگر حیدر تو احسن سے زیادہ مطلب پرست اور خود غرض نکلے اور فہد؟ میرے اندر پھر زلزلہ اٹھنے لگا۔ کیا اب تیسرے مرد پر بھی اعتبار کر لوں؟ دل میں طوفان مچلتے رہے۔ کوئی دھیمے دھیمے سرگوشیاں کر رہا تھا۔ ''پنجرہ توڑ دیجیے۔ پنجرہ توڑ دیجیے۔'' اور میں ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہاں! مجھے کیا غرض کسی سے؟ کسی حسن کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنی جھوٹی محبت کی زنجیروں میں کسی کمزور لڑکی کو جکڑے رکھے۔ کسی حیدر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مجازی خدا ہوتے ہوئے بھی اپنی بیوی کو اپنے تحفظ کے سائے میں نہ لے۔ چار دیواری میں قید کر کے رکھے اور اپنے فلسفے کا فارمولا مجھ پر آزمائے اور فہد.....! کیا میں اسے یہ حق دے دوں کہ وہ میرا پنجرہ توڑ دے اور مجھے آزاد کر دے؟ ہاں! مجھے آزادی چاہیے۔ مکمل اور خود مختارانہ آزادی۔ میں اس قفس میں کب تک رہوں؟ میں خود توڑ دوں گی پنجرہ اور آزاد ہو جاؤں گی۔

اور اس شام فہد نے میرا پنجرہ توڑ دیا۔ مجھے آزاد کر دیا۔ اس دن ہم دونوں کلفٹن گئے۔ پیروں کے نیچے گیلی گیلی زمین میرے پورے وجود کو سرور بخش رہی تھی۔ کتنا سکون محسوس ہو رہا تھا! لفظوں کے اس ساحر کی رفاقت سے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے پہلی بار چلنا سیکھا ہو۔ فہد خوب صورت اور حسین لفظوں کے جال میرے گرد بنتا رہا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ عورت لفظوں کے جال میں جلد آ جاتی ہے۔ پیار کی پیاسی عورت کو صرف میٹھے بول درکار ہوتے ہیں۔ فہد میری اس کمزوری کو جان گیا تھا۔ وہ خوب صورت باتیں کرتا رہا۔ یونہی باتوں باتوں میں، میں نے اس سے کہا۔ ''فہد! ایک بات پوچھوں؟''

''ضرور مگر پلیز! کوئی ایسی بات نہ پوچھ بیٹھنا جس کا جواب دینا میرے اختیار میں نہ ہو یا میرے زخم کا منہ پھر کھل جائے۔''

''زخم.....! کیا تم بھی!'' میں سخت متعجب ہوئی۔

''ہاں مریم! دنیا کا کون سا ایسا شخص ہے جو زخم آشنا نہیں۔ زمانے نے بہت دکھ دیے ہیں مجھے، بہت زخم لگائے ہیں مگر میں نے ان کی نمائش نہیں کی۔ قہقہے لگاتا ہوں۔ کون جانتا ہے کہ ہر دم ہنسنے والا فہد لمحہ لمحہ غموں کی لحد میں اتر رہا ہے۔ دنیا تو ہنسنے والوں کے ساتھ ہنستی ہے مگر رونے والوں کا ساتھ کوئی نہیں دیتا۔ یہ دنیا کا دستور ہے اور اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔ دن تو ہنگاموں میں کٹ جاتا ہے مگر رات کو خود سے، اپنے غموں سے دکھوں سے لڑتا رہتا ہوں اور آخر شب صبح میری ہوتی ہے۔ صبح کو میرے چہرے پر اس شکست کا کوئی تاثر نہیں ہوتا اور یہی میری زندگی میں کامیابی کی دلیل ہے۔ مریم! تم بھی مسکرایا کرو۔ تمام غم چھپا کے مگر فہد سے کچھ نہ چھپانا۔ مجھے آج سے اپنا دوست اور غم خوار سمجھنا۔''

میں نے اسے واقعی اپنا دوست اور غم خوار سمجھ لیا۔ تم مجھے بے غیرت، بے حس اور بے حیا بھی کہہ سکتی ہو مگر کوئی نہیں جانتا کہ عورت ایسے عالم میں کیا محسوس کرتی ہے؟ میرے اندر آگ تھی۔ فہد نے اس آگ کو خوب صورت

لفظوں کے چھینٹے ڈال کر ٹھنڈا کر دیا۔ میرے اندر کی سرکش عورت نے پھر سر اٹھایا۔ مجھے لگا کہ اب وہ شہزادہ آ گیا ہے جس کا میں انتظار کرتی رہی ہوں۔ ایسے سپنے تو میں نے احسن کی محبت میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ شاید وہ نوعمری کی محبت تھی۔ اب میں اس آگ میں جل کر کندن بن گئی تھی۔ میں ایسی لڑکی تھی جسے ماں باپ نے سوچے سمجھے بغیر ایک دولت مند شخص سے بیاہ دیا۔ بیٹی کو ڈولی میں بٹھاتے وقت شاید والدین خود بھی نہیں جانتے کہ جس کے حوالے وہ اپنی لڑکی کو کر رہے ہیں، وہ اسے سینے سے لگائے گا یا دھتکار دے گا۔ ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھے گا یا پیر کا کانٹا سمجھ کر نکال دے گا۔

میں دوسری بار خواب دیکھ رہی تھی اور کون بھی عورت دوسری بار خواب دیکھے تو اس کے اندر ہلچل مچ جاتی ہے۔ میں تو وہ صحرا نورد تھی جس کے سامنے سراب تھا اور سراب میں ایک پھول کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ کہانی پڑھتے ہوئے میرا دکھ وہی عورت جان سکتی ہے جس کا سہاگ جیتی جی چھن گیا ہو۔ عورت کنوار پن اور بیوگی کے عالم میں تمام زندگی گزار سکتی ہے مگر جب اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا سہاگ کبھی اس کا نہیں تھا، کبھی اس کا نہ ہوگا تو ایسی کرموں جلی عورت سدا اپنے آپ سے لڑتی رہتی ہے۔ الجھتی رہتی ہے۔ فہد میری ساری الجھنیں جان گیا تھا۔ وہ میرا بن گیا اور ہمیشہ کے لیے بن جانا چاہتا تھا مگر کسی طور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حیدر سے کس طرح چھٹکارا حاصل کروں؟

دوسرا عذاب یہ تھا کہ راتوں کی جلن اور بڑھ گئی تھی۔ جذبات کے بگولوں کو میں یادوں کے دیے سے بجھانے کی کوشش کرتی مگر یہ میرے بس میں کب تھا۔ مجھے تنہائی میں فہد کی سحر آگیں باتیں اور شیریں لہجہ یاد آتا۔ ہواؤں میں اس کی خوشبو محسوس ہوتی۔ لوگوں کی نظروں میں شاید میں انتہائی ذلیل عورت ہوں گی جو شوہر کے ہوتے ہوئے بھی کسی اور کے بارے میں سوچتے تھے لیکن میں چھوڑی ہوئی بیوی نہیں، چھوڑا ہوا گھر تھی جس کے در و دریچے اب بھی کھلے ہیں مگر انہیں زنگ لگ گیا ہے اور کوئی یہ دیکھنے نہیں آیا کہ کواڑوں کو زنگ کیوں لگ جاتا ہے۔ کنواری لڑکیاں کھڑکیاں کیوں کھولتی ہیں؟ اب فہد آیا تو میرے دل کو قرار آ گیا تھا۔ ہم کئی بار تنہا گئے مگر اس نے ہمیشہ شرافت اور پاکیزگی کا دامن تھامے رکھا۔ میں پناہ چاہتی تھی اور یہ پناہ ملی تو میں کلیتاً فہد کی ہوگئی، دل و جان سے۔

ایک روز فہد آیا تو بڑا الجھا ہوا تھا۔ ''کیا بات ہے، بہت پریشان ہو؟'' میرے درمیان آپ جناب کے تکلفات اور فارمیلٹیز ختم ہوگئی تھیں۔

''میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں مگر کوئی راہ نہیں مل رہی۔ زخمی دل کو زخمی دل کی پہچان ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے زخموں پر مرہم رکھو گی۔ مجھے سکون دو گی مگر.....''

''کیا تم اس لیے پریشان ہو کہ میری شادی ہو چکی ہے؟ گھبراؤ مت! حیدر مجھے باآسانی طلاق دے دیں گے۔ میں یوں بھی اس گھر میں فالتو چیز کی طرح ہوں۔ بے کار، بے معنی!''

''نہیں مریم! مسئلہ صرف تمہارا ہی نہیں، میرا بھی ہے اور اسے میں خود حل کروں گا۔''

''نہیں فہد! پلیز! مجھے بتاؤ، آخر ایسی کیا بات ہے؟ تم اپنے سارے دکھ مجھے دے دو۔''

''نہیں پگلی!'' اس نے اپنائیت سے کہا۔ ''تمہارے پاس پہلے ہی کم دکھ ہیں؟ میں تو تمہیں زندگی کی مسرتیں بہم پہنچانا چاہتا ہوں مگر.....؟''

''مگر کچھ بتاؤ ناں فہد۔'' میں پریشان ہوگئی کہ وہ میرا مسیحا تھا۔

''میری بھی شادی ہو چکی ہے۔'' اس نے شرمسار لہجے میں کہا۔

''کیا؟'' مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔''

''ہاں مریم! میں نے کہا تھا ناں کہ زخمی دل ہی زخمیوں کی پہچان کر سکتا ہے۔ وہ عورت سلگتا ہوا شرارہ ہے۔ میں اسے طلاق دے دوں گا۔ اب تک دے بھی دیتا مگر.....'' وہ تاسف سے ہاتھ ملنے لگا۔

''ہاں بتاؤ! کیا بات درپیش ہے؟'' اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں فہد کے ہاتھ جوڑ کر اسے لوٹا دیتی۔ ایک عورت کا سہاگ نہ چھینتی مگر میں عورت سے انتقام لینا چاہتی تھی۔

''اس کا حق مہر اتنا زیادہ ہے کہ میں زندگی بھر بھی ادا نہیں کر سکوں گا۔ بتاؤ! میں کیا کروں؟''

''کتنی رقم ہے حق مہر کی؟'' میں ہر طرح سے اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔

''ارے چھوڑو ان باتوں کو میں دوستوں سے اور دفتر سے قرض لے کر۔''

''نہیں فہد! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم کسی کے آگے ہاتھ پھیلاؤ۔''

''مریم! تم پریشان مت ہو۔ میں ان شاء اللہ بہت جلد تمہیں حاصل کر لوں گا۔''

''نہیں فہد! تمہیں میری قسم ہے اگر میری بات نہیں مانو گے تو میں سمجھوں گی کہ تم مجھے اپنا شریک غم نہیں سمجھتے۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اپنی ذاتی چیک بک لے آئی اور دو لاکھ روپے کا چیک بنا کر فہد کو تھما دیا۔''

وہ شرارت سے مجھ پر جھکا اور بولا۔ ''ارے ہاں! اب تم سیٹھ حیدر کو خط لکھ دو۔ میرا خیال تھا کہ ایک قیامت آجائے گی۔ وہ پھرے ہوئے آئیں گے اور فہد کو گولی سے اڑا دیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ لگتا تھا، وہ پہلے ہی مجھ سے جان چھڑانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ تیسرے روز ان کی جانب سے مجھے طلاق نامہ مل گیا۔ مجھے ایک دھچکا تو لگا مگر میں مسرور تھی کہ اب میں کلی طور پر فہد کی ہوں۔ میرا مسیحا فہد جو میرے دکھوں سے آشنا تھا، میرے دکھ بانٹنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

فہد کے لیے میرا انتظار اور بڑھ گیا۔ کئی روز سے وہ نہیں آیا تھا۔ لگتا تھا کہ اب کسی بھی لمحے وہ فتح سے مسرور دندناتا ہوا آئے گا اور مجھے اپنے پاس بلا کر کہے گا۔ ''اب وقت آ گیا ہے جس کا ہمیں صدیوں سے انتظار تھا۔'' اس لمحے کی آس میں دن بے کل اور راتیں کٹھن گزرنے لگیں اور ایک روز اس کا فون آ گیا۔ میری دھڑکنیں بے قابو ہو گئیں۔ دوسری جانب فہد ہی تھا۔ ''کہو فہد! کیا خبر ہے؟ تم نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی؟ پیسے کم تو نہیں تھے؟'' میں گھبراہٹ میں جانے کیا بول گئی۔

''تم سناؤ! حیدر نے آزاد کر دیا ناں تمہیں؟ میں بس یہی چاہتا تھا اور میں نے تم سے کہا بھی تھا نا کہ میں تمہیں پنجرے سے آزاد کر دوں گا۔ سو میں نے کر دیا۔''

''یہ بتاؤ! تم نے اپنی بیوی.....''

''ارے مریم!'' اس نے میری بات کاٹی۔ ''بار بار بیوی مت کہو، دلہن کہو۔ وہ میرے پہلو سے لگی کھڑی ہے اور اس وقت میں تمہیں ایئر پورٹ سے فون کر رہا ہوں۔''

میں اسے مذاق سمجھی اور بولی۔ ''کہیں جا رہے ہو کیا؟''

''ہاں! ہمیشہ کے لیے پردیس جا رہا ہوں۔ یہاں کوئی چارم نہیں بلکہ یوں کہو کہ میں ہنی مون کے لیے جا رہا ہوں اپنی نئی نویلی دلہن کی ساتھ۔ سدرہ سے میں نے پرسوں کورٹ میرج کی ہے۔ امیر باپ کی بیٹی ہے۔ چاہتی تھی کہ ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جائیں۔ سو اس کے لیے تمہیں پھنسانا پڑا۔ معاف کرنا مریم! جن عورتوں کے شوہر بھٹکے ہوئے ہوں، ان کی بیویاں کب پارسا رہ سکتی ہیں اور تم..... تم تو ویسے بھی ''سیکنڈ ہینڈ'' ہو مگر دیکھو میں نے جو کہا تھا، سچ کر دکھایا۔ اب تم مکمل آزاد ہو۔ میری طرف سے بھی اور حیدر کی طرف سے بھی۔ اچھا خدا حافظ! اور ہاں آئندہ کسی کے فریب میں مت آنا۔ مجھے دکھ ہے کہ سدرہ کی خاطر تمہارا دل.....''

ریسیور میرے ہاتھ سے نہ جانے کب کا چھوٹ چکا تھا اور میرے دل میں درد کے دھماکے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

مریم باجی اپنی کہانی ختم کر کے خلاؤں میں کچھ ڈھونڈنے لگیں جیسے وہاں تین چہرے، تین روپ، مرد کی پوری زندگی کا احاطہ کرنے والی تین کردار نظر آ رہے ہوں۔ خود میرا دل بھی دکھی ہو گیا تھا۔ میں زیادہ دیر تک وہاں بیٹھی نہ رہ سکی اور ردا کا ہاتھ پکڑے باہر نکل آئی۔ معصوم سی پٹر پٹر بولنے والی ردا بھی مریم باجی کی کہانی سن کر آبدیدہ ہو گئی تھی۔ ہم دونوں خاموش خاموشی سے گھر کی جانب بڑھتے چلے جا رہے تھے۔

☆☆

اب تک آپ مرد جاسوسوں کے کارناموں سے بھرپور جرم و سزا کی کہانیاں پڑھتے رہے ہیں لیکن اس خوب صورت اور چونکا دینے والی طویل کہانی میں آپ کی ملاقات ایک حسین ترین لیکن انتہائی شاطر جاسوسہ سے ہورہی ہے جس نے مردوں کے چھکے چھڑادیے تھے۔ شہر میں جعلی نوٹوں کو پھیلانے والوں کا اصل کھیل بہت ہی تباہ کن تھا۔

روشنی کی چوری

قانون والا

دونوں فلک قدر، صرغام پر کچھ ضرورت سے زیادہ مہربان تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صرغام نے جرائم کے سلسلہ میں اپنی رپورٹنگ سے ان کے اخبار روزنامہ "برق" کو آسمان تک پہنچا دیا تھا۔ اس کی اشاعت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اب وہ ہر گھر میں نظر آتا تھا۔ اشاعت کیساتھ ساتھ اشتہارات کی برنس میں بھی اضافہ ہوا تھا اور آمدنی بڑھ جانے کے سبب اب فلک قدر خود بھی آسمان پر اڑنے لگے تھے۔ تاہم ملازمین کی تنخواہوں کے معاملہ میں اب بھی ان کا رویہ وہی تھا جو اب سے پہلے رہا تھا۔ ہاں انہوں نے صرغام کی تنخواہ میں اضافہ ضرور کر دیا تھا۔ لیکن یہ اضافہ بھی صرف ایک کاغذی ہی تھا۔ صرغام نے اخبار کی ملازمت میں کبھی بھی تنخواہ وصول نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود صرف تین ماہ کی تنخواہ ہی باقی رہتی تھی۔ فلک قدر جب کبھی مہربان ہوتے تو صرغام سے یہی کہتے۔ "اماں اپنی تین ماہ کی بقایا تنخواہ لے لو۔"

فلک قدر کو آج کل کچھ فرصت زیادہ تھی۔ دراصل مرغ بسمل نے اخبار کی پوری ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں۔ وہ بظاہر احمق سا آدمی جو گفتگو کرتے وقت اچھا خاصہ یتیم نظر آنے لگتا تھا۔ تحریر کے اعتبار سے بے حد ذہین ثابت ہوا تھا۔ اداریہ مقالے لے کر مراسلے کالم تک خود لکھتا اور ضرورت پڑنے پر چپڑاسی تک کا کام انجام دے ڈالتا تھا۔ فلک قدر اس کے کام سے بے حد مطمئن تھے اور اخبار کی بیشتر ذمہ داریاں اس کے سپرد کر کے خود آزاد ہو گئے تھے۔ شام کا وقت ان کا ہوٹلوں اور چائے خانوں میں گزرتا تھا اور رات کو کبھی کبھی آنکھ بچا کر نائٹ کلب تک پہنچ جایا کرتے تھے۔ بیشتر وقت صرغام کے ساتھ ہی گزارنے کی کوشش کرتے آج بھی وہ ہوٹل زمرد میں صرغام کے ساتھ ایک میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا اور ہوٹل میں زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ رقص کرتی نظر آئی تھی۔ اس میز کے علاوہ جس پر فلک قدر اور صرغام بیٹھے ہوئے تھے کوئی ایسی میز نظر نہیں آ رہی تھی جس پر کوئی ماہ جبیں قتالہ روزگار نہ بیٹھی ہو۔ ہر سمت فضا میں سرخوشیاں بکھر رہی تھیں۔ سرمستی و سرشاری کی ایک لطیف سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی حسین قہقہوں کے طلائی اور نقرئی گھنگھرو اس طرح بج اٹھتے کہ صرغام چونک پڑتا اور فلک قدر کے چہرے پر شادمانی کا رنگ گہرا اور گہرا ہو جاتا اور ان کی کمر کا تناؤ بڑھ جاتا اور انہیں دیکھ کر صرغام کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی تھی۔

ویٹر لڑکی کافی میز پر رکھ کر جا چکی تھی۔ صرغام نے مسکراتے ہوئے کافی پیالی پیالیوں میں نکالی اور ایک پیالی فلک قدر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"آج آپ کی طبیعت کچھ زیادہ ہی بحال نظر آ رہی ہے۔ میں نے بہت کم آپ کو اتنا خوش دیکھا ہے۔"

"اب نظر لگاؤ گے میاں۔" فلک قدر نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔ "جب میں تمہاری عمر کا تھا تو....."

"ابھی کیا بوڑھے ہو گئے ہیں۔" صرغام نے فلک قدر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ماشاء اللہ، لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ایک ہیں۔ بس ذرا سر سفید ہو گیا ہے۔"

"کمبخت نزلہ نے پریشان کر دیا۔" فلک قدر نے کہا۔

"ہری ہاں میرا مطلب بھی یہی تھا۔" صرغام نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کے یہ سفید بال بھی لگتے ہیں۔ بہت خوبصورت بالکل ریشمی گالوں کی طرح۔"

"اماں کیوں بناتے ہو۔" فلک قدر نے مسکراتے ہوئے ٹوکا۔

"یقین کیجئے میں بنا نہیں رہا ہوں۔" صرغام نے پھر کہا۔ سپید و سرخ رنگت کشادہ پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں اس پر یہ خوبصورت بال لگتا ہے۔ کوئی یورپین شہزادہ زمرد میں بیٹھا ہوا ہے۔"

"کیا واقعی۔" فلک قدر نے حیرت سے پوچھا۔ اور چاروں طرف ایک نگاہ غلط انداز کی ڈالی اور پھر میز پر نگاہیں جما دیں۔

صرغام۔ فلک قدر کی کیفیات سے پورے طور پر لطف لے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بھی فلک قدر کی نگاہوں کے ساتھ قریب کی اس میز پر جا کر رک گئیں۔ بلاشبہ وہ ایک حسین ترین شخصیت کی مالک تھی۔ بظاہر یورپین معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کھلے ہوئے گلے کا بلاؤز پہن رکھا تھا اور اس کے اسکرٹ کا گھیر کچھ زیادہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔ گلے میں لٹکا ہوا لاکٹ اجنبی نگاہوں کو جسم کے تمام نشیب و فراز کو دیکھنے کی دعوت دے رہا تھا جو بلاؤز سے باہر نظر آ رہے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ کتابی چہرہ، پھول کی پتی جیسے نازک ہونٹ ستواں اور قدرے اونچی ناک جادو جگاتی ہوئی سیاہ آنکھیں۔ ایک بار یہ آنکھیں صرغام کی طرف اٹھیں تو خود اس کے جسم میں ایک قسم کی سنسنی سی دوڑ گئی۔

فلک قدر کی نگاہیں تو جیسے اس میز سے چپک گئی تھیں اس وقت ان کے چہرے پر بشاشت کا وہ عالم دیدنی تھا کہ جس میں دعوت کا رنگ بھی تھا اور مایوسی کی کیفیت بھی۔ وہ لڑکی

جو اپنی اٹھان کے سبب عورت معلوم ہوتی تھی۔ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ زمرد کے ہال میں آئی تھی اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہی قریب کی میز پر بیٹھ گئی تھی۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی ضرور تھی۔ لیکن جلد ہی پرسکون سی ہو کر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو گئی تھی۔ اس دوران اگر اس کی نگاہیں کبھی اٹھیں تو صرف ضرغام کی طرف۔

"آپ نے کافی نہیں لی" ضرغام نے فلک قدر کی کیفیت سے لطف اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اں کیا کہا صاحبزادے" فلک قدر چونک کر بولے۔

"میں نے عرض کیا آپ کی کافی ٹھنڈی ہو گئی" ضرغام نے کہا۔

"ہو جانے دو" فلک قدر نے جواب دیا "اور منگا لو اور کچھ کھانے کے لئے بھی"

"جی بہتر" ضرغام نے جواب دیا اور اس ویٹر کو اشارہ کیا جو قریب کی اسی میز سے آرڈر لے کر جانے لگی تھی۔

"مسٹر۔ اس میز سے آپ کو کیا آرڈر ملا ہے" ویٹر کے قریب پہنچنے کے بعد ضرغام نے خوبصورت اجنبی خاتون کی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی میں سمجھی نہیں، کیا فرمایا آپ نے" ویٹر نے پوچھا۔

"اس میز سے آپ کو جتنی چیزوں کا آرڈر ملا ہو وہی یہاں بھی لے آئیں"

ویٹر نے ضرغام کو گہری لیکن حیران کن نگاہوں سے دیکھا۔ ضرغام اس ہوٹل میں روز کے آنے والوں میں سے تھا اور ہوٹل کی تمام ویٹر لڑکیاں جانتی تھیں کہ وہ ایک ثقہ نوجوان تھا۔ اس کے ساتھ کبھی کبھی اس کی بہن کے علاوہ کسی لڑکی کو نہیں دیکھا گیا نہ وہ ویٹر لڑکیوں کے ساتھ بات چیت میں کبھی بے باک ہوا تھا۔

ویٹر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "جناب انہوں نے تو صرف کافی کا آرڈر دیا ہے"

"اچھا....." ضرغام نے اچھا کا الف ضرورت سے زیادہ کھینچتے ہوئے گہری آہ بھری۔

"کچھ کھانے کے لئے نہیں آرڈر دیا"

"جی نہیں کہئے تو کافی پھر حاضر کر دوں"

"ضرور کرو۔ ہائے رے محرومی۔ دیکھا آپ نے" فلک قدر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ کھلانا چاہتے ہیں اور ہم کھا بھی نہیں سکتے"

"ارے میاں۔ تو کون روکتا ہے تمہیں۔ آرڈر دو نا"

فلک قدر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

ویٹر نے فلک قدر کی طرف دیکھتے ہوئے ایک باریک سا قہقہہ لگایا اور بولی "کہئے تو آرڈر اس خاتون سے لے لوں"

"ارے نہیں، ایسا نہ کیجئے گا۔ بس آپ ہی جو بھی مناسب سمجھیں لے آئیں"

"یہ کیا بہکی بہکی باتیں کرنے لگے تھے" ویٹر کے جانے کے بعد فلک قدر نے ضرغام سے کہا۔

لیکن ضرغام نے جیسے ان کی بات سنی ہی نہ تھی۔ وہ اب اسی میز کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا جس پر وہ خوبصورت اجنبی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہو میاں صاحبزادے" فلک قدر نے ضرغام کو ٹوکا۔

"اللہ کی قدرت" ضرغام نے اس پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا۔

اسی وقت ویٹر نے ان کی میز پر کافی لا کر رکھ دی تھی اور ساتھ ہی تلے ہوئے کاجو، شامی کباب، پیسٹری جیکی پکوڑا کی پلیٹیں بھی میز پر سجا دی تھیں۔

دراصل ضرغام کی نگاہیں اس حسین عورت اور اس کے تینوں ساتھیوں کے ہاتھوں پر پڑ گئی تھیں۔ ان چاروں نے اپنے ہاتھ میز پر رکھ لئے تھے اور چاروں نے اپنے اپنے سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں ایک جیسی بڑی اور خوبصورت انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں جن کے نگینے کچھ زیادہ ہی باہر کی طرف ابھرے ہوئے تھے اور وہ باری باری انگوٹھیوں کو میز پر کھٹکھٹا رہے تھے۔ انگوٹھیوں میں یہ یکسانیت اور ہاتھوں کی حرکت ضرغام کے لئے دلچسپی کا باعث بن گئی تھی۔ اگرچہ اس کے کان انگوٹھیوں کے نگوں کی میز پر کھٹکھٹاہٹ کی آواز کو سن نہیں پا رہے تھے۔ تاہم اس نے یہ بات محسوس کی تھی کہ جب ایک انگوٹھی کے نگ کو میز پر کھٹکھٹانا بند کر دیتا ہے تو دوسرا شروع کر دیتا ہے اور وہ سب خاموش گم صم نظر آتے ہیں جیسے ان کے اندر قوت گویائی سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ اچانک کچھ سوچ کر وہ چونک پڑا اور اس نے جیب سے کاغذ اور قلم نکال لیا۔ اب وہ ان چاروں اجنبیوں کی انگوٹھیوں کی حرکت کو بغور دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا۔

اس تمام وقفہ میں فلک قدر حیرت کے ساتھ ضرغام کو دیکھتے رہے اور ساتھ ہی سامنے رکھی پلیٹوں کو خالی کرتے رہے

ان کی نگاہیں کبھی ضرغام کے چہرے پر اور کبھی اس کاغذ پر کہ جس پر ضرغام کچھ لکھ رہا تھا، رک جاتی تھیں۔

اچانک وہ خاتون کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بہت آہستہ خرامی کے ساتھ باہر کی طرف چلی گئی۔ اب اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے ہاتھوں کو میز پر سے اٹھا لیا تھا اور وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے تھے انہیں ایک نے ایک بار ضرغام کی طرف دیکھا بھی

ضرغام نے لڑکی کے چلے جانے کے بعد کاغذ پر نگاہ ڈالی۔ اجنبیوں کی انگوٹھی گھمانے کی حرکتیں تو نگاہ میں رکھتے ہوئے کاغذ پر جو تحریر اتاری وہ یہ تھی:

"میں پسند نہیں کرتی کہ کوئی اجنبی مجھ سے دلچسپی لے۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہے مادام، کوئی دل پھینک معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن میری چھٹی حس کچھ اور کہتی ہے۔ تم اسے چیک کرو۔"

"کیا آپ جانا چاہتی ہیں؟"

"کل میں نے ایک لڑکی کو دیکھا تھا جو ہو بہو اسی کی تصویر تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے خاص نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔"

"لیکن آپ تو بھکارن کے بھیس میں تھیں مادام۔ اس بھیس تو ہم آپ کے خادم بھی آپ کو نہیں پہچانتے۔"

"ضروری تو نہیں لیکن میری چھٹی حس۔"

"اچھا میں چلتی ہوں۔ تم لوگ بیٹھو۔ اگر یہ میرا پیچھا کرے تو اسے چیک کرو۔"

"کیا چیز ہے یہ۔ میرا مطلب ہے تم نے کیا لکھا ہے؟" فلک قدر نے پوچھا۔

"ایک کہانی۔" ضرغام نے جواب دیا۔

"اخبار کے لئے۔ لاؤ دو مجھے۔"

"جی نہیں، ابھی یہ مکمل نہیں ہوئی ہے۔" ضرغام نے جواب دیا اور پھر سامنے رکھی ہوئی پلیٹوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"اماں جلدی کیا ہے، آہستہ کھاؤ۔" فلک قدر نے جن کے کھانے کی رفتار اب دھیمی ہو گئی تھی، ضرغام سے کہا۔

لیکن ضرغام نے ان کی بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور وہ جلد جلد ہاتھ چلاتا رہا۔

پلیٹیں صاف کرنے کے بعد وہ فلک قدر کی طرف فتح مند نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پیالیوں میں کافی انڈیلنے لگا

"جی اب فرمائیے۔ کچھ کہہ رہے تھے آپ؟" ضرغام نے کہا۔

"کیسی کہانی ہے؟" فلک قدر نے پوچھا۔

"جب مکمل ہو جائے گی تو۔" فلک قدر نے ضرغام کی بات کو درمیان ہی میں اچک لیا اور کہا "میاں جلد مکمل کرنا مرغِ بسمل کا کچھ بوجھ ہی ہلکا ہوگا۔"

مرغِ بسمل کا نام آتے ہی ضرغام مسکرا دیا "کیا حال ہیں ان کے؟"

"اماں کیا پوچھتے ہو۔ ہے بڑا ذہین۔ وہ تو کمبخت صرف شاعری ہی میں پھسڈی رہ گیا، ورنہ ....."

"اچھی خاصی شاعری تو کر لیتے ہیں۔" ضرغام نے کہا۔

"خاک کرتا ہے۔ کمبخت کے چہرے پر تیس تو ناچتی رہتی ہے۔"

"وہ تو چہرے کی قدرتی بناوٹ ہے۔" ضرغام نے کہا۔

"خاک بناوٹ ہے۔ میاں تمہیں کیا پتہ وہ غریب واقعی مظلوم ہے۔" فلک قدر نے جواب دیا۔

"وہ کس طرح۔" ضرغام نے پوچھا۔

"بڑا دردناک واقعہ پیش آیا تھا اس کے ساتھ۔" فلک قدر نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

"وہ کیا۔" ضرغام نے چپ سے کہا۔

"اماں کیا بتاؤں، وہ جو کسی نے کہا ہے کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کی طرف دوڑتا ہے۔"

"گیدڑ کی شامت۔" ضرغام نے تصحیح کی۔

"ہوگی گیدڑ کی۔" فلک قدر نے برا مناتے ہوئے کہا۔ "شامت اور موت میں فرق کیا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ حضرت کی شامت اعمال نے دھکا دیا تو دلی جا پہنچے۔"

"کون؟" ضرغام نے پوچھا۔

"اماں وہی مرغِ بسمل اور کون۔ تم تو کھال میں سے بال نکالنے لگے ہو۔"

"حضرت بال میں سے کھال۔" ضرغام نے ٹوکا۔

"ہوگا۔ پوری بات سن لو۔ دلی پہنچ کر جا پہنچے ایک بہت بڑے استاد کے یہاں۔ آدمی دیکھنے میں مہذب لگتے تھے۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی اور دیوان خانے میں بڑی عزت کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ پھر تعارف ہوا حقہ منگوا دیا گیا۔ پان طلب کئے گئے غرض بڑے سلیقے سے گفتگو شروع ہو گئی۔ استاد صاحب مرغِ بسمل کے لباس اور انداز گفتگو سے خاصے متاثر ہوئے۔"

"مگر حضرت بسمل کے چہرے پر تو پھٹکار سی برستی ہے۔ یہ دلی میں ثقہ کیسے نظر آنے لگے ہوں گے۔" ضرغام نے پوچھا۔

"اماں اس واقعہ کے بعد تو پھٹکار برسنے لگی ہے۔" فلک قدر نے جواب دیا۔ "بس یہ تو پوچھو۔ واقعہ کیا ہے۔" اور پھر زور زور

سے ہنسنا شروع کر دیا۔ ارد گرد کی میزوں پر بیٹھے ہوئے کئی لوگوں نے حیرت کے ساتھ فلک قدر کو دیکھا تب کہیں جا کر ان کی ہنسی رکی۔

"بات کچھ سمجھ میں آئی نہیں" ضرغام نے کہا۔ جو خوبصورت عورت کے ساتھیوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

"تم کیا سمجھو گے برخوردار۔ شروع میں میں خود بھی نہیں سمجھ پایا تھا" فلک قدر نے جواب دیا، اور داد طلب نگاہوں سے ضرغام کو گھورا۔

"پھر کیا ہوا؟" ضرغام نے ٹہوکا دیا۔

"ہوا یہ کہ استاد صاحب نے مرغ سے میرا مطلب ہے۔ مرغ بسمل سے شعر سنانے کی فرمائش کر دی اور یہ حضرت بھی شروع ہو گئے۔

اوّل تو استاد صاحب کو ان سے مزاحیہ کلام کی توقع نہیں تھی پھر بھی صبر کے ساتھ سننے لگے۔ عالم یہ کہ کبھی چہرے پر ملال کی کیفیت پیدا ہوئی تھی اور کبھی آنکھوں میں خون کبوتر کی"

"آپ تو اس طرح بیان کرنے لگے ہیں جیسے خود بھی وہاں موجود تھے"

ضرغام نے ٹوکا۔

"ارے میاں۔ مرغ بسمل نے مجھے داستان گوئی کے پورے حق کے ساتھ یہ واقعہ سنایا تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کا خدا بھلا کرے کیا کہہ رہا تھا"

"استاد کلام سنتے رہے" ضرغام نے لقمہ دیا۔

"ہاں تو جب برداشت نہ ہوا تو چپٹ پڑے۔ آدمی تھے پلے چوڑے۔ زبردست ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے اور مرغ بسمل کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "بن جاؤ مرغا"

اور مرغ بسمل کو ان کے ڈر سے مرغا بن جانا پڑا۔ حیرت یہی نہیں۔ ستم ظریفی یہ کہ اس نے اپنے ملازم کو بلوا کر قدیم استادوں کے دیوان مرغ بسمل کی کمر پر لدواتے اور اس غریب کی ٹانگیں لرزنے لگیں اور پھر مقدور بھی دیر بعد کہا "نکل جاؤ یہاں سے"

ضرغام نے زوردار قہقہہ لگایا اور پوچھا۔ اشعار بھی جانے کیسے ہوں گے"

"اماں مجھے سناتے تھے بسمل نے۔ مجھے یاد بھی ہو گئے ہیں۔ لو تم بھی سنو"

میرے وطن کی سیاست عجب اکھاڑا ہے
کہ اس میں جہل نے خسرد کو پچھاڑا ہے
نہ دیکھ پاؤ گے سیاسی کبوتروں کی اڑان
کوئی ہے ترچھا میاں پر تو کوئی آڑا ہے

"واہ واہ کیا بحر منتخب کی ہے میں شعر کہے ہیں واہ واہ۔"

ضرغام نے داد دی۔

میاں ابھی کیا ہے لو اور سنو۔

جوان ہو کے اگر میں بگڑ گیا ہوں تو کیا
کہ ماں نے لوریاں دے کر مجھے بگاڑا ہے

"کیا بات ہے واہ" ضرغام نے داد دی

"اور میاں کچھ شعر یاد نہیں رہے" فلک قدر نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"حضرت یہی کیا کم نہیں۔ خدا کی قسم داد دیتا ہوں، آپ کی برداشت کو واللہ کیا خوب بڑا ظالم شاعر ہے یہ مرغ بسمل تو" فلک قدر نے ہنستے ہوئے کہا "نثر خوب لکھتا ہے"

"یعنی بڑے کام کی چیز ہے" ضرغام نے کہا

"ہے تو سہی مگر بیہودہ ہے بیہودی" فلک قدر نے منہ بنا کر کہا۔ گویا منہ میں کوئی تلخ گولی گھل گئی ہو۔

"کیا مطلب۔ کیا تنخواہ مانگتا ہے"

"ہاں۔ مانگتا کیا۔ پیشگی لے لیتا ہے کمبخت۔ میں نے ہزار بار کہا کہ تین ماہ میں حساب کر لیا کرو۔ مگر مانتا ہی نہیں"

ضرغام نے فلک قدر کی بات پوری سنی بھی نہ تھی کہ وہ تیزی سے اٹھا اور ہوٹل کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

دراصل خوبصورت عورت کے تینوں ساتھی اٹھ کر باہر جا چکے تھے۔

* * *

وہ بوڑھی عورت زہرہ کو کچھ عجیب سی لگی تھی۔

پہلے زہرہ نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی تھی اور پھر اچانک اس کی دلچسپی بڑھ گئی اور اس نے بڑے غور سے بوڑھی عورت کے سراپا کا جائزہ لیا تھا۔

اس وقت دھوپ اتر چکی تھی اور شام کی آمد آمد تھی زہرہ اپنی ایک سہیلی کی سالگرہ کی تقریب میں شرکت کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ جانے کیوں اس نے کار کا استعمال نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک ٹیکسی کے ذریعے پہلے وہ خاص روڈ کے شاپنگ سنٹر پہنچی۔ وہاں اس نے ایک دکان سے سہیلی کو دینے کے لئے تحفہ خریدا اور پھر وہ پیدل ہی اپنی سہیلی کے گھر کی طرف چل پڑی تھی۔ شاید اس لئے کہ وقت کافی تھا اور وہ وقت سے پہلے اپنی سہیلی کے گھر پہنچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت وہ خاص روڈ کے چوراہے کے دائیں طرف والی سڑک پر تھی جو دل شاد نگر کو جاتی ہے۔ اسے دل شاد نگر ہی جانا تھا۔ فاصلہ تقریباً ایک کلومیٹر کا ہو گا۔ وہ اپنی دھن میں

آگے بڑھ رہی تھی کہ وہ برقعہ پوش عورت اسے نظر آئی ـــ یہ دوسرا جھٹکا تھا جو زہرہ کو لگا۔ بوڑھی عورت اپنے داہنے ہاتھ کی درمیانی انگلی میں طلائی انگوٹھی پہنے ہوئے تھی جس میں ایک بڑا سا قرمزی نگ لگا ہوا تھا۔

بھلا کہاں عورت کا بظاہر حال اس کا لباس اور کہاں یہ انگوٹھی زہرہ کے ذہن میں بہت سے شکوک و شبہات کلبلانے لگے۔

کیا اتفاق ہے یہ۔ اس نے سوچا۔ ذہن میں ہلچل آتی۔ اور نہ اس بوڑھی کو دیکھتی۔ جب بھی زہرہ انجانے میں کوئی خلافِ معمول قدم اٹھاتی تھی تو اس کا نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ اسے کسی نہ کسی مجرم یا مجرموں کے گروہ سے واسطہ پڑ جاتا تھا۔ اس بار اگرچہ زہرہ کو اس بات کا پختہ یقین نہیں تھا کہ اس پراسرار بوڑھی عورت سے کوئی جرم وابستہ ہوگا۔ تاہم ذہنی طور پر اس نے اس بوڑھی عورت کو چیک کرنے کا فیصلہ ضرور کر لیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی قریب کے بس اسٹینڈ پہنچ کر رک گئی۔ اس کا اندازہ تھا کہ بوڑھی عورت اس طرف آئے گی اور دوسری طرف گئی تو بھی وہ اس کا پیچھا کرے گی۔

زہرہ کا اندازہ درست ہی نکلا ـــ کچھ دیر بعد ہی بوڑھی عورت بس اسٹینڈ پہ پہنچ کر کھڑی ہوگئی تھی اور وہ نوجوان جو اس کے پاس کھڑا ہوا تھا جا چکا تھا۔ اس وقت بوڑھی عورت کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ زہرہ کو یاد تھا کہ جب اس نے بوڑھی عورت کو نوجوان سے بات کرتے دیکھا تھا تو پیکٹ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا بس اسٹاپ پہ عورت کو دیکھ کر اس نے دل ہی دل میں بوڑھی عورت کے متناسب الاعضا ہونے کی تعریف کی۔ اگر یہ کمبخت واقعی بوڑھی ہے تو جوانی میں یقیناً ایک قیامت ہوگی۔ زہرہ نے سوچا۔ ویسے اس کو کچھ یقین تھا کہ وہ میک اپ میں ہے مگر میک اپ ہے بہت شاندار کئی بسیں آ کر نکل گئیں۔ لیکن بوڑھی عورت نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ زہرہ بھی پرسکون طریقے سے کھڑی ہوئی تھی اور ہر ایک آنے والی بس کو اس طرح دیکھنے لگتی تھی کہ جیسے وہی اس کی مطلوبہ بس ہو اور پھر مایوسی سے سر ہلا دیتی تھی۔ بوڑھی عورت نے اسے اور اس نے بوڑھی عورت کو اس عرصہ میں کئی بار دیکھا لیکن اجنبیوں کی طرح۔

پھر آخر وہ بس آ ہی گئی جس کا اس بوڑھی عورت کو انتظار تھا۔ بس کے اسٹینڈ کے قریب آتے ہی وہ آگے بڑھی اور بس کے رکتے ہی اس میں سوار ہوگئی۔ زہرہ نے بھی بس میں چڑھنے میں تاخیر نہیں کی تھی۔ اس وقت بوڑھی عورت نے زہرہ کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھا تھا اور زہرہ کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں طنزیہ سی مسکراہٹ سمٹ آئی ہے۔

بس کا سفر جاری رہا۔ دل شاد نگر کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ اور اب بس کا رخ وکاس ایونیو کی طرف تھا جو روپ نگر کے بالکل آخر میں ایک اچھی کالونی تھی اور اس کے پیچھے کی طرف وہ ندی بہتی تھی جو کچھ آگے جا کر سمندر کی آغوش میں گم ہو جاتی تھی۔ زہرہ سمجھ گئی تھی کہ بوڑھی عورت کی منزل وکاس ایونیو کی شاندار کالونی میں ہو سکتی ہے۔

بس وکاس ایونیو کالونی کے بس اسٹینڈ پر رکی تو بوڑھی عورت تیزی کے ساتھ نیچے اتر گئی اور سڑک کراس کرنے لگی۔ زہرہ بھی بس اسٹینڈ پہ اتر چکی تھی لیکن کچھ سوچ کر ایک لمحہ کے لئے ٹھہر گئی وہ دراصل چاہتی تھی کہ بوڑھی عورت کو تعاقب کا شبہ نہ ہو کیونکہ اسے یاد تھا کہ بس کے اندر بوڑھی عورت نے اس کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھا تھا۔

بوڑھی نے سڑک پار کرنے کے بعد پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا، اور پھر سامنے کی ایک چھوٹی گلی میں داخل ہو گئی۔ زہرہ نے بھی جو اس وقت تک بس کی آڑ میں تھی۔ تیزی کے ساتھ آگے قدم بڑھا دیئے۔ اس نے بوڑھی عورت کو آگے جا کر بائیں طرف مڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا ـــ وہ بجائے ـــ اس گلی میں داخل ہونے کے سڑک کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئی اور دوسری گلی میں داخل ہو کر جیسے دوڑنے لگی۔ بوڑھی عورت بھی اس گلی میں پہنچ چکی تھی۔ اور ایک فلیٹ کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ زہرہ نے قدم آہستہ کر دیئے۔ اب اس نے ساڑھی کا پلو سر پہ ڈال کر تھوڑا سا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔

بوڑھی عورت نے فلیٹ کے دروازے کو کھولا اور اندر پہنچ کر دروازہ فوراً بند کر لیا۔

یہ بات بھی زہرہ کے لئے بھی بڑی عجیب تھی کہ ایک بظاہر مفلوک الحال بوڑھی عورت اس شاندار فلیٹ کی چابی رکھے اور اس میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی فلیٹ کے سامنے رک گئی۔ دروازے پر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ اس نے دروازے کے قریب جا کر کی ہول میں سے جھانکا لیکن بے کوشش کے باوجود کوئی دکھائی نہیں دیا۔

اب وہ کیا کرے۔ زہرہ نے سنجیدگی کے ساتھ سوچا۔ ویسے اس تمام تگ و دو کے لئے کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بس اس کی چھٹی حس تھی۔ جو اسے وکاس ایونیو تک لے آئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دور دور تک کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ جہاں وہ رک کر فلیٹ کی نگرانی کر سکے۔ جبر

فلیٹ میں بوڑھی عورت داخل ہوئی تھی۔ وہ کالونی کا آخری فلیٹ تھا۔ اور تمام فلیٹ زندگی سے خالی نظر آ رہے تھے۔ وہاں اِکا دُکا ہی کوئی آتا جاتا نظر آ جاتا تھا۔ زہرہ نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پھر مین روڈ پر پہنچ گئی۔

وہ جو کوئی بھی ہو اب جلد ہی گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔

زہرہ نے دل ہی دل میں سوچا اور بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی۔

اسے شادنگر میں اپنی سہیلی کے یہاں سالگرہ کی تقریب میں شریک ہونا تھا۔ اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اتنی دیر یونہی اس نے فضول ضائع کی تھی۔

٭ ٭ ٭

وہ سیاہ وین اسٹیٹ بنک کی عمارت سے نصف فرلانگ کے فاصلہ پر آ کر رک گئی۔ اس جگہ سے بنک کی عمارت صرف ایک ہیولے کے طور پر ہی دکھائی دے رہی تھی۔ وین کا دروازہ کھلا اور اس میں سے چار آدمی باہر نکل آئے۔ یہ سب ایک جیسے لباس میں تھے۔ یعنی سر پر فلیٹ ہٹ اور جسم پر برساتی۔ ان لوگوں نے ربڑ کے جوتے پہن رکھے تھے ۔۔۔ چاروں ایک دوسرے سے بات کئے بغیر آہستہ آہستہ بنک کی عمارت کی طرف بڑھنے لگے۔ رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ ایک مشین کے پرزے ہوں۔ جو ایک مقررہ رفتار کے ساتھ ایک مقررہ وقفہ کو پورا کر رہے ہوں۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ رات انتہائی تاریک تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی بارش ہو چکی تھی۔ جس کے سبب سڑک پر جگہ جگہ پانی بھرا نظر آتا تھا۔ بارش کے سبب اس علاقے میں بجلی فیل ہو گئی تھی جس کے سبب تاریکی کچھ اور زیادہ بڑھ گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ظلمت نور کی سیاہی تمام تر علاقوں کو نگل چکی ہو۔

چاروں ایک رفتار کے ساتھ چلتے ہوئے بنک کی عمارت سے کچھ فاصلہ پر پہنچ کر رک گئے۔ وہ چاروں بنک کے گیٹ پر موجود سنتری کو صاف طور پر دیکھ رہے تھے۔ کیونکہ سنتری نے بجلی فیل ہو جانے کے سبب ٹارچ جلا رکھی تھی۔ اور وہ گیٹ پر ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا۔ اس کے کندھے پر لٹکی رائفل بھی ان چاروں کو نظر آ رہی تھی۔

چاروں نے کچھ دیر ٹھہر کر سنتری کو دیکھا اور پھر ان میں سے ایک اپنے ساتھیوں سے کچھ کہے بغیر آہستگی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اس کا رخ سنتری کی طرف تھا۔ چونکہ تاریکی بہت زیادہ تھی۔ اس لئے سنتری دور کی چیزوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی اس کی تمام تر توجہ بنک کی طرف ہی تھی۔ کبھی کبھی وہ بجلی والوں پر غصہ کرنے لگتا تھا کہ ایسے موسم میں ہی بجلی فیل ہوتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بجلی فیل ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور نگرانی کا کام زیادہ دشوار ہو جاتا ہے ۔۔۔ سنتری اسی احساس اور ذمے داری کے ساتھ بنک کے گیٹ اور اس کے اردگرد کے حصوں کی طرف متوجہ تھا اور وہ سامنے سے آنے والے شخص کو دیکھ نہیں سکا تھا۔

وہ شخص بھی بہت محتاط تھا۔

سنتری پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ ایک بار جیسے ہی سنتری کی پشت اس کی طرف ہوئی۔ وہ پھرتی کے ساتھ کئی میٹر کا فاصلہ طے کر گیا اور ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ جو تاریکی کے سبب اپنے سائے سے محروم نظر آتا تھا۔ اب چوکیدار سے اس کا فاصلہ چار پانچ میٹر سے زیادہ نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ برساتی کی جیب میں ڈالا اور کوئی گول سی شئے نکالی ۔۔۔ اب وہ زیادہ چوکنا اور ہوشیار دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ہی چوکیدار یا سنتری کے ہاتھ میں ٹارچ ایک لمحہ کے لئے بجھی۔ اس شخص نے ایک گول سی شئے چوکیدار کی طرف پھینک دی اور پھر ردعمل دیکھنے کے لئے درخت کے تنے سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا۔

گول سی چیز زمین سے ٹکرانے کے بعد پھٹ گئی لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے نتیجے میں کوئی دھماکہ نہیں ہوا، نہ کوئی روشنی نکلی اور نہ دھواں اٹھا۔ ایک بہت ہی معمولی سی آواز ضرور ہوئی جس کو سنتری قطعی طور پر نہیں سن سکا تھا۔

اس شخص نے دیکھا کہ سنتری نے پھر ٹارچ جلا دیا اور اس کی روشنی ادھر ادھر ڈالی۔ وہ عین اس جگہ تھا کہ جہاں گول سی شئے زمین سے ٹکرائی تھی۔ سنتری وہاں سے ہٹا اور گیٹ پر پہنچ کر دیوار سے کمر لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں ٹارچ نہیں تھی۔ وہ شاید اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور اس پر گہری نیند کا غلبہ ہو گیا تھا۔ اس نے بار بار سر کو جھٹکا لیکن نیند بری طرح حاوی ہو چکی تھی اور وہ دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔

اور کھڑے ہوئے شخص نے اس منظر کو اچھی طرح دیکھا تھا ۔۔۔ وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا کہ اس کے ذمے جو کام تھا وہ خوش اسلوبی کے ساتھ پورا ہو گیا۔ اب اس نے جیب میں پھر ہاتھ ڈالا اور سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا۔ اس نے سگریٹ منہ میں لگا کر لائٹر جلایا اور گہرے گہرے کش لگانے لگا۔ لائٹر کی روشنی گویا ایک سگنل تھی اس کے ساتھیوں کے لئے جو تعداد میں تین تھے اور سیاہ وین کے قریب ہی اب تک

کھڑے ہوئے تھے۔ روشنی کا سگنل پاتے ہی یہ تینوں بنک کے گیٹ کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک کے پاس ایک بڑا سا پیکٹ تھا اور دوسرے کے پاس ایک چھوٹا سا بیگ۔ تیسرا شخص ایک آٹومیٹک اسٹین گن سے لیس تھا۔ جلد ہی یہ تینوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں چوتھا شخص ٹھہرا ہوا تھا۔

" اوکے " ان تینوں میں سے ایک نے پوچھا۔

" یس اوکے " چوتھے شخص نے جواب دیا۔ اب وہ اپنے تینوں ساتھیوں کے ساتھ بنک کی عمارت کی طرف جا رہا تھا

اسٹین گن والے نے سنتری کو اٹھایا اور ایک طرف دیوار کی آڑ میں لٹا دیا۔ ساتھ ہی زمین پر پڑی ہوئی ٹارچ کو اٹھا کر بار بار جلانے اور بجھانے لگا۔ ٹارچ کی روشنی میں وہ بالکل سنتری نما نظر آ رہا تھا۔ وہی سنتری کا لباس۔ وہی صورت اور وہی ٹہلنے اور گشت کرنے کا انداز کسی کو بھی شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ بنک کا سنتری نہیں ہے۔ اس کے تینوں ساتھی کچھ فاصلے پر تاریکی میں کھڑے ہوتے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک آگے بڑھ کر اپنے اس ساتھی کے قریب پہنچا جو سنتری بنا ہوا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی سنتری نے چابی اپنے ساتھی کے حوالے کر دی جو اس نے بنک کے سنتری کی جیب سے نکالی تھی۔

بنک کے گیٹ کی کھڑکی کا تالا بہت آسانی کے ساتھ کھل گیا اور وہ شخص بنک کے اندر داخل ہو گیا۔ اس کے دو ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی اور بنک کے اندر داخل ہو گئے۔

" رنجیت تم یہیں ٹھہرو " تالا کھولنے والے سے کہا گیا۔

" یس مادام " رنجیت سنگھ نے جواب دیا اور وہ گیٹ کے اندر ہی رک گیا۔ اب اس نے جیب سے عجیب ساخت کا ریوالور نکال لیا تھا اور وہ گیٹ کی کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

رنجیت کو جس شخص نے رک جانے کا حکم دیا تھا وہ دراصل کوئی آدمی نہیں تھا بلکہ عورت تھی۔ مغربی جرمنی کی ایک حسین ترین مجرمہ جولیانا۔

جولیانا جس قدر حسین اور خوبصورت تھی۔ اسی قدر مکار اور چالاک بھی۔ مغربی جرمنی کے علاوہ وہ یورپ کے کئی ملکوں میں سرگرم رہی تھی۔ اور ان سبھی ملکوں کی پولیس کو اس کی تلاش تھی۔ اس کا شمار دنیا کے بڑے مجرموں میں ہونے لگا تھا۔ اور انٹرپول کی ساری مشینری اس کے لئے حرکت میں رہتی تھی۔ لیکن کوئی بھی اس کا سراغ ابھی تک نہیں لگا سکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی وہ کئی چہرے رکھتی تھی۔ میک اپ میں اس کو کمال حاصل تھا۔ رات کو ان تنہائیوں کے علاوہ کہ جن میں وہ اپنے معتمد ساتھیوں میں سے کسی ایک کو شریک کر لیا کرتی تھی۔ وہ کبھی اپنے اصل چہرے کے ساتھ نہیں رہتی تھی اور راتوں میں بھی اس کے ساتھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ اصل چہرے کے ساتھ نہیں ہے۔ ایک بات جو اس کے بارے میں سنی تھی وہ یہ کہ اس نے کوئی قتل نہیں کیا ہے حالانکہ یہ بات سو فیصدی درست نہیں تھی۔ وہ بڑی چالاکی اور منصوبہ بندی کے ساتھ جرائم کیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایک دوسرے ملک کے ایجنٹ یا ڈبل ایجنٹ کا رول بھی اس نے ادا کیا تھا۔ لیکن زیادہ تر اس کے جرم کا تعلق جعلی کرنسی اور اسمگلنگ سے ہوتا تھا۔

رنجیت کو گیٹ کے اندر کھڑے رہنے کا حکم دے کر جولیانا آگے بڑھ گئی اب اس کے ساتھ ایک ہی آدمی رہ گیا تھا جس کے ہاتھ ایک چھوٹا سا تھیلا تھا۔

جولیانا نے بنک میں داخل ہو کر کیشیئر کے کیبن کو بالکل نظرانداز کر دیا اور وہ سیدھی بنک کے منیجر کے کمرے کے سامنے پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھی نے تھیلا زمین پر رکھ کر کھولا اور اس میں کچھ اوزار نکالے اور پھر ان میں سے ایک اوزار سے بنک منیجر کے کمرے کا تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی کوشش میں صرف چند ہی منٹ صرف ہوئے اور بنک منیجر کے کمرے کا تالا کھل گیا۔ اب وہ دونوں کمرے کے اندر تھے۔

جولیانا نے جو اب تک خاموش تھی۔ کمرے میں پہنچ کر ایک الماری کی طرف اشارہ کیا جو جسامت کے اعتبار سے بڑی نظر آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جولیانا نے بنک پر کئی دن سے نگاہ رکھی ہوگی اور خاص طور پر بنک منیجر کے کمرے کو چیک کیا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسی الماری کی طرف فوراً ہی اشارہ نہ کرتی جو دراصل الماری نہ تھی بلکہ اسٹرانگ روم کو جانے کا ایک خفیہ دروازہ تھا۔

یہ الماری کچھ عجیب و غریب ساخت کی تھی۔ اس میں بظاہر کوئی تالا نظر نہیں آتا تھا بلکہ جس جگہ لاک ہونا چاہیے تھا۔ وہاں ایک گھڑی لگی ہوئی تھی اور وہ صحیح ٹائم دے رہی تھی۔

تھیلے والے شخص نے الماری پر ایک نگاہ ڈالی اور وہ گھڑی کا جائزہ لینے کے لئے اس پر جھک گیا۔ اپنا تھیلا وہ پہلے ہی پڑی ہوئی میز پر رکھ چکا تھا۔ گھڑی کا تھوڑی دیر تک جائزہ لینے کے بعد اس نے گھڑی کی بڑی سوئی کو حرکت دینی شروع کی اور اس کو پیچھے کی طرف آہستہ آہستہ گھمانا شروع کر دیا۔ ابھی گھڑی کی اس بڑی سوئی نے ایک راؤنڈ پورا نہیں کیا تھا کہ نو کے ہندسے پر آنے کے بعد جام ہو گئی اور نو کا ہندسہ غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ اب چابی کا سوراخ نظر آتا تھا۔ اس نے تھیلے سے ایک عجیب ساخت کی

چابی نکالی اور اس کو کی ہول میں داخل کر دیا۔ لیکن کوشش کرنے کے باوجود بھی چابی نہیں گھومی اس نے اس کوشش کو ترک کر دیا اور ایک بار پھر گھڑی کا جائزہ لیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اب اس نے سیکنڈ کی سوئی کو الٹا گھمانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے چابی کو گھمانے کی کوشش کرتا رہا۔

اور بالآخر سیکنڈ کی سوئی جب ایک جگہ پہنچی تو چابی گھوم گئی، اور الماری کھول دی گئی۔

"الماری کو پھر اسی طرح بند کرنا ہے۔" جولیانا نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"بس مادام۔ آپ کوئی فکر نہ کریں۔" اس کے ساتھی نے جواب دیا۔ وہ ایک ماہر جوزف تھا اور دنیا بھر میں کسی ساخت کا بھی تالا ہو وہ اس کے فن کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اس وقت وہ بھی میک اپ میں تھا اور خالص دیسی معلوم ہوتا تھا۔ ویسے وہ تھا مغربی جرمنی کا ہی اور جولیانا کا ایک انتہائی معتمد اور مددگار ساتھی تھا در اصل وہ جولیانا کے حسن پر فریفتہ تھا اور اس کے اسی جذبۂ عشق نے اسے جولیانا کا انتہائی وفادار بنا دیا تھا۔

الماری کا دروازہ کھلتے ہی جولیانا نے اس کے اندر قدم رکھ دیا۔ سامنے ہی لفٹ کا دروازہ تھا۔ اس نے لفٹ کے دروازے کو کھولا اور اس کے اندر داخل ہو گئی۔ جیکب اس کے ساتھ تھا۔ جولیانا نے لفٹ کا انڈر گراؤنڈ فلور کا بٹن دبایا اور لفٹ تیزی کے ساتھ نیچے جانے لگی۔

چند سیکنڈ بعد ہی وہ بنک کے تہہ خانے میں موجود تھے۔ جہاں چاروں طرف لاکرز رکھے ہوتے تھے۔ اور ایک طرف ایک مخصوص کیبن تھا جس کے اندر کرنسی نوٹوں کا بنک کا تمام اثاثہ صندوقوں کے اندر رکھا ہوا تھا۔

کیبن کا لاک معمولی کوشش سے کھل گیا۔ جولیانا نے ایک صندوق کی طرف اشارہ کیا اور جیکب نے اس کا تالہ بھی بغیر کسی دشواری کے کھول دیا، اب جولیانا نے اپنے ہاتھ سے پیکٹ کو برابر کے صندوق پر رکھ دیا۔ اور اس صندوق کا ڈھکن اٹھا دیا جس کا تالہ جیکب نے کھولا تھا۔ صندوق سو سو کے کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا یہ سب نئے نوٹ تھے۔ جولیانا نے نوٹوں کے ایک سو بنڈل گن کر صندوق سے باہر نکال لئے اور پھر اپنا پیکٹ کھولا اس میں بھی نوٹوں کے بنڈل تھے۔ لیکن یہ سب جعلی نوٹ تھے۔ اس نے ان نوٹوں کو اصلی نوٹوں کی جگہ صندوق میں رکھا اور پھر اس کا ڈھکن بند کر دیا۔ جیکب کو جیسے اپنے فرائض

کا بخوبی علم تھا۔ اس نے واپسی پر وہ تمام تالے پھر اسی طرح لگا دیئے جس طرح پہلے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی وہ انگلیوں کے نشانات مٹانا بھی نہیں بھولا تھا۔ تمام کام میں بیس منٹ لگے تھے۔

جولیانا جیسے ہی گیٹ کے قریب پہنچی۔ رنجیت نے کہا۔

"باہر سب خیریت ہے مادام۔"

"اوکے" جولیانا نے جواب دیا۔ "کھڑکی کھولو۔"

وہ تینوں اب باہر آ چکے تھے۔ گیٹ کے باہر جو تھا آدمی نے کر جو چوکیدار کا رول ادا کر رہا تھا۔ تینوں کو دیکھا اور پھر بیہوش چوکیدار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے چوکیدار کو اٹھایا اور بنک کے گیٹ سے اس کی کمر لگا کر بٹھا دیا۔ ساتھ ہی اس کی رائفل اور ٹارچ اس کے پاس رکھ دی اور پھر سیاہ وین کی طرف چلا گیا۔ جس کو جولیانا اسٹارٹ کر چکی تھی۔

٭ ٭ ٭

ضرغام جب ہوٹل زمرد کے بیرونی گیٹ پر پہنچا تو اسے وہاں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔ گیٹ کے باہر کار پارکنگ کا تمام علاقہ سنسان تھا۔ باہر کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ضرغام نے ایک لمحہ رک کر سوچا اور پھر مسکرا دیا۔ اسے وہ عبارت یاد آ گئی جو اس نے خوبصورت عورت اور اس کے ساتھیوں کی انگوٹھیوں کی کھٹ کھٹ سن کر تحریر کی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ تینوں کار پارکنگ میں ہی کہیں چھپ گئے ہوں گے اور اس کا تعاقب کریں گے۔

وہ ان تینوں کی دانشمندی کی دل ہی دل میں تعریف کئے بغیر نہیں رہا تھا۔ ظاہر ہے تینوں نے سوچا ہوگا کہ جب بھی وہ آئیں گے۔ میں ان کا تعاقب کروں گا۔ بڑی نفسیاتی حرکت تھی ان کی۔

ضرغام ان لوگوں کی گفتگو کے ڈھنگ پر بھی حیران تھا یہ سب کے سب تار والی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح تار گھر میں کھٹ کھٹ کی آوازوں کے ساتھ پیغام دوسری جگہوں پر پہنچایا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح یہ ایک دوسرے کو پیغام دیتے ہیں اور اس میں مہارت بھی رکھتے ہیں۔ انہیں تحریر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ ذہانت اور یادداشت سے کام لیتے ہیں۔ ضرغام کو ان کا یہ طریقہ بہت دلچسپ محسوس ہوا۔ اب تک اس نے کبھی کسی مجرم یا مجرموں کے گروہ کو اس طریقے کا استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ویسے ضرغام یہ بات تو سمجھ گیا تھا کہ ان لوگوں کا تعلق کسی مجرم ٹولے سے ضرور ہے اور وہ دراصل یہی جاننا چاہتا تھا کہ یہ مجرم ٹولہ کونسا ہے اور کس قسم کے جرائم میں ملوث ہے۔

ایک لمحہ رک کر سوچنے کے بعد ضرغام نے کار پارکنگ کی طرف قدم بڑھائے اور اپنی اسپورٹس کار کے قریب پہنچ گیا

اس دوران وہ بہت ہوشیار اور چوکنا رہا تھا کیونکہ اس پر حملہ بھی ہو سکتا تھا لیکن ایسا ہوا نہیں اور وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ لوگ صرف اس کا تعاقب کریں گے۔

ضرغام نے چابی لگا کر کار کا دروازہ کھولا۔ اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر کار کو چلا دیا۔ ضرغام کی یہ اسپورٹس کار بیت اسپیشل کار تھی اور اس کو مخصوص طور پر تیار کرا کے منگوایا گیا تھا۔ کار قطعی طور پر بلٹ پروف تھی۔ اس کے ڈیش بورڈ میں مختلف قسم کے رنگوں کے بہت سے بٹن لگے تھے۔ ایک بٹن کو دبانے سے کار کے اگلے اور پچھلے پہیوں پر اسٹیل کور چڑھ جاتا تھا۔ دوسرے بٹن کا تعلق کار میں نیچے لگے ہوئے ایک پائپ سے تھا کہ جس کے ذریعے گیس یا دھواں خارج ہو سکتا تھا۔ ایک اور بٹن کے دبانے سے کار کی ڈگی میں لگی پوشیدہ رائفلوں کو چلایا جا سکتا تھا اس کے ساتھ لگے دوسرے بٹن کا تعلق انجن میں فٹ دو رائفلوں سے تھا۔ گویا کار کیا تھی، ایک مضبوط قلعہ تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ بہت ہیوی تھی۔ اگرچہ دیکھنے میں ہیوی نہیں لگتی تھی، اس کے باوجود انتہائی تیز رفتاری سے چلانے کے باوجود کار سڑک پر اس طرح دوڑتی تھی جیسے پانی میں آب دوز دوڑتی ہے۔

جیسے ہی ضرغام کی اسپورٹس کار ہوٹل سے باہر نکلی۔ ضرغام نے ڈیش بورڈ میں لگے ایک بٹن کو دبایا اور اس کے ساتھ ہی کار کے اگلے اور پچھلے پہیوں پر اسٹیل کور چڑھ گیا۔ تھوڑی دور آگے جانے کے بعد ضرغام نے سامنے لگے آئینے میں دیکھا کہ ایک سیاہ رنگ کی وین ہوٹل سے نکلی ہے اور اسی کی طرف آ رہی ہے۔ وہ مسکرا دیا۔

جیسے ہی سیاہ وین ضرغام کی کار کے قریب پہنچی۔ اس نے آئینے میں وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی صورت دیکھی۔ وہ ان ہی تین میں سے ایک تھا۔ اس نے اپنی کار کی رفتار بڑھا دی ساتھ ہی پیچھے آنے والی وین کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ ضرغام نے یکے بعد دیگرے مختلف سڑکوں پر کار کو دوڑایا۔ وین بھی اس کے تعاقب میں آتی برابر دکھائی دیتی رہی۔

اب ضرغام نے کار کا رخ ہل روڈ کی طرف موڑ دیا تھا۔ یہ ہل روڈ آگے جا کر تارجام جانے والی شاہراہ سے مل جاتی تھی۔ جس کے دونوں طرف کافی دور تک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ ہل روڈ پر پہنچنے کے بعد ضرغام نے اپنی اسپورٹس کار کی سپیڈ اور بڑھا دی اور وین کے ساتھ اس کی کار کا فاصلہ بڑھنے لگا۔ لیکن یہ فاصلہ زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکا تھا۔ تارجام کو جانے والی سڑک پر جیسے ہی دونوں گاڑیاں پہنچیں۔ یہ فاصلہ کم ہونے لگا۔ وین کی اسپیڈ بھی بڑھا دی گئی تھی۔

کار اور وین کے درمیان رفتار کم اور زیادہ کرنے کا کھیل زیادہ دیر تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ضرغام نے تارجام کا نصف فاصلہ طے کر لیا۔ ویسے اسے اس کا یقین ہو چلا تھا کہ تعاقب کرنے والے جو کوئی بھی ہیں صرف تعاقب کر رہے ہیں اور تعاقب کے علاوہ ان کی اور کوئی نیت نہیں ہے۔ کیونکہ کئی بار ضرغام نے اپنی کار کی رفتار اس قدر کم کر لی تھی کہ تعاقب کرنے والے اگر چاہتے تو اس کی کار سے آگے نکل سکتے تھے اور آگے نکلنے کے بعد رک جانے پر مجبور کر سکتے تھے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب بھی ضرغام نے اپنی کار کی رفتار کم کی، وین والوں نے بھی رفتار کم کر لی۔

کئی بار ضرغام نے سوچا کہ اس کھیل کی ضرورت کیا ہے۔ وین میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی تعاقب کرنے کی بات تو سمجھ میں آتی تھی۔ لیکن وہ کیوں پٹرول پھونک رہا ہے یہ بات خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جو کچھ بھی ہو رہا تھا انہیں اسکے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ ضرغام خود روپ نگر کی سڑکوں پر بھی ان سے دور نکل سکتا تھا۔

معاً اس کے ذہن میں تفریح کی سوجھی۔ اس نے کار میں لگے ٹرانسمیٹر کو آن کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی تھری زیڈ کے ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم ہو چکا تھا "ہیلو زیڈ ون اسپیکنگ"۔

"معلوم ہے برخوردار" ضرغام نے جواب دیا وہ ظہیر کی آواز کو بخوبی پہچان گیا تھا جو ہمیشہ اس کی غیر موجودگی میں ٹیلیفون پر زیڈ ون کا کردار ادا کرتا تھا۔

"اوہ، یہ آپ ہیں" ظہیر نے دوسری طرف جیسے ٹھنڈی سانس لی۔

"کہاں کا سفر ہے؟"

"زمرد سے بول رہا ہوں" ضرغام نے ہنس کر جواب دیا۔

"بالکل غلط" میں کار کی آواز صاف طور پر سن رہا ہوں کہیے تو یہ بھی بتا دوں کہ جناب شہر سے کس طرف اور کتنی دور ہیں؟"

"بس بس مان لیا۔ ذہین بچے ہو" ضرغام نے ہنس کر جواب دیا اور پھر اسے ہوٹل میں پیش آنے والے واقعہ کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا "اب میں تارجام جانے والی شاہراہ پر ہوں۔ وین میں وہ تینوں آدمی میرے پیچھے دوڑ رہے ہیں"

"تو کیا میں آؤں۔" ظہیر نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں" ضرغام نے جواب دیا۔ "میں آج ذرا تفریح کے موڈ میں ہوں۔ اگر آج گھر نہ آ سکوں تو پرواہ نہ کرنا" یہ بات اس نے کچھ امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے کہی تھی۔

"کیا مطلب۔ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"اک خیال ہے ذہن میں۔ اور تمہیں معلوم ہے میں اپنا خیال وقت سے پہلے کبھی ظاہر نہیں کیا کرتا۔"

"اپنا خیال رکھئے گا۔" ظہیر نے سوچ کر کہا۔

"اوہ ۔۔۔" ضرغام نے جواب دیا ۔۔۔ "اب زیادہ وفادار بننے کی کوشش مت کرو۔"

"میرا مطلب ہے تعاقب کرنے والے تین ہیں۔"

"وہ دس بھی ہو سکتے تھے۔ تم کوئی فکر نہ کرو۔ زہرہ کو سمجھا دینا۔"

"شاید وہ اپنی کسی سہیلی کے یہاں سالگرہ میں کہیں گئی ہوئی ہیں۔" ظہیر نے جواب دیا۔

"مجھے معلوم ہے۔" ضرغام نے کہا اور ٹرانسمیٹر کو بند کر دیا۔

اب اس کی آنکھوں میں ایک مخصوص قسم کی شوخی اور لبوں پہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اس نے ایکسیلیٹر پہ دباؤ بڑھا دیا اور کار ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اس سے پہلے وہ ہلکا سا ریڈی میڈ میک اپ کرنا نہیں بھولا تھا۔ وین کی رفتار بھی بڑھ گئی تھی۔ لیکن ظاہر ہے وہ اسپورٹس کار کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ فاصلہ بڑھتا رہا۔ لیکن ضرغام نے اتنا فاصلہ ضرور رہنے دیا کہ وین والوں کو اس کی کار نظر آتی رہے۔

نصف گھنٹے کے بعد وہ تارجام کی حدود میں داخل ہو چکا تھا شہر میں داخل ہوتے ہی اس نے کار کو دائیں طرف ایک گلی میں موڑ دیا۔

چند منٹ بعد ہی وین وہاں سے گزرتی چلی گئی۔ غالباً اس میں سوار تینوں آدمی بدحواس ہو گئے ہوں گے۔ کیونکہ تارجام کی آبادی میں داخل ہو جانے کے باوجود ان لوگوں نے وین کی رفتار کو کم نہیں کیا تھا۔

ضرغام نے وین کے گذر جانے کے فوراً بعد اپنی کار کو بیک کیا اور پھر روڈ پر لے آیا۔ لیکن اب اس کی اسپورٹس کار کا رنگ سرخ ہونے کے بجائے سفید تھا۔ یہ جادو بھی کار میں ڈیش بورڈ پر لگے ایک بٹن کو دبانے کا ایک کرشمہ تھا کہ کار کا رنگ اور نمبر پلیٹ ایک ساتھ تبدیل ہو گئی۔

اب ضرغام آگے جانے والی سیاہ وین کا تعاقب کر رہا تھا جو تارکول کی مختلف سڑکوں پہ کبھی کم اور کبھی تیز رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ آخر وہ ایک چائے خانے کے پاس جا کر رک گئی۔ ضرغام نے بھی اپنی کار کو کچھ فاصلے پر روک لیا تھا اور وہ بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چائے خانے میں داخل ہو گیا۔

وہ تینوں ایک میز پہ بیٹھے ہوئے چائے کا انتظار کر رہے تھے ۔۔۔ ضرغام بھی ان کے قریب ایک دوسری میز پہ بیٹھ گیا چائے کے لئے وہ کاؤنٹر پہ ہی آرڈر دے آیا تھا۔ حالانکہ اب رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا ۔۔۔ ضرغام کا خیال تھا کہ تعاقب کرنے والے پریشان ہو کر کہیں رک جائیں گے۔ پھر ممکن ہے رات میں روپ نگر کے لئے واپسی کا سفر کریں۔ لیکن اس خیال کے برعکس اب اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ قیام نہیں کریں گے بلکہ ان کو واپسی کی جلدی ہے۔ ورنہ وہ چائے کے بجائے کہیں کھانا کھاتے۔ ضرغام یہ سب باتیں سوچ رہا تھا کہ اس کے کان میں آواز آئی۔

"بدمعاش نے پریشان کر دیا۔" یہ تینوں میں سے ایک کی آواز تھی۔

"یار رنجیت ماننا پڑے گا۔ اس نے تمہیں کھلایا اچھی طرح۔"

رنجیت نے جو وین کو چلا رہا تھا بری طرح منہ بنایا اور پھر تیسرے آدمی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"کہو جیکب تمہارا کیا خیال ہے۔ واپس چلنا ہے یا ابھی اور آوارہ گردی کا ارادہ ہے۔ میں نے روپ نگر میں کہا تھا کہ تعاقب بے کار ہوگا ۔۔۔"

"واپس چلیں گے دوست۔" جیکب نے جو جسامت میں دوسرے افراد سے بھاری اور خطرناک نظر آتا تھا جواب دیا "ابھی مال پہنچانا ہوگا۔"

"آج ہی؟" رنجیت نے پوچھا۔

"ہاں۔ مادام کا حکم ہے۔"

اتنی دیر میں ویٹر چائے میز پر رکھ گیا اور وہ خاموشی کے ساتھ چائے میں مصروف ہو گئے لیکن ضرغام کا ذہن مال اور مادام میں الجھ کر رہ گیا۔ ان لوگوں پر شبہ تو پہلے ہی تھا۔ لیکن اب یقین ہو چلا کہ ان لوگوں کا ضرور کسی ایسے گروہ سے تعلق ہے جو بردہ فروشی اور اسمگلنگ کرتا ہے۔ اس کی میز پہ بھی چائے آ چکی تھی اور وہ بھی آہستہ آہستہ گھونٹ لینے لگا تھا۔ وہ تینوں اس سے قطعی بے پرواہ ہو کر خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ چاہتے بھی تو ضرغام کو نہیں پہچان سکتے تھے۔

جیکب رنجیت اور ان کا تیسرا ساتھی چائے پی کر اٹھے اور وین میں جا بیٹھے۔ ضرغام اپنی جگہ جما ہوا بیٹھا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وین کا انجن جاگ اٹھا اور وہ تیر کی طرح آگے بڑھ گئی۔ وین کے جانے کے بعد ضرغام اطمینان کے ساتھ اٹھا اور بل ادا کرنے کے بعد چائے خانے سے باہر نکل گیا۔ اسے جیسے وین کی پروا ہی نہ تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کی اسپورٹس کار اس کو بہرحال جانے گی ۔۔۔ باہر پنواڑی کی دکان سے اس نے اپنی مخصوص برانڈ کا سگریٹ خریدا اور کار میں جا بیٹھا۔

اسپورٹس کار اب روپ نگر جانے والی شاہراہ پر رواں دواں تھی۔ نصف گھنٹے کے بعد ہی ضرغام کو آگے جانے والی وین کار نظر آ گئی۔ اس نے اپنی کار کی رفتار کو کم کیا اور پھر ہیڈ لائیٹس کو آف کر دیا ہے۔

تعاقب کا یہ سلسلہ اس وقت تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ جب تک وین روپ نگر کے نواحی علاقے میں داخل نہیں ہوئی۔ تمام راستے وین میں سوار ہر فرد میں سے کسی ایک کو بھی تعاقب کا شبہ نہیں ہوا۔ لیکن جیسے ہی وین نواحی علاقے میں داخل ہوئی کہ جہاں برقی قمقمے تاریکی کو نگل رہے تھے۔ وین میں سوار سوار افراد نے اسپورٹس کار کو دیکھ لیا۔ حسن اتفاق سے جس وقت ان لوگوں نے اسپورٹس کار کو دیکھا۔ عین اسی وقت ضرغام نے کار کی ہیڈ لائیٹس کو آن کیا تھا۔ اس سے تینوں افراد اور بھی زیادہ چونک پڑے۔

وین کے ڈرائیور نے روپ نگر میں داخل ہونے کے بعد کار کو دو جگہ روکا۔ ایک جگہ حبیب اترا۔ اور دوسری جگہ ان کا تیسرا ساتھی جس کا نام ضرغام کو معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن ضرغام نے صرف وین کا پیچھا کرنا ہی ضروری سمجھا۔

اور پھر وین دل شاد نگر میں ایک فلیٹ کے آگے پہنچ کر رک گئی۔ رنجیت وین سے اترا اور فلیٹ میں داخل ہو گیا۔

اور ضرغام اس وقت تک وہیں رہا جب تک زیڈ نمبر ر وہاں نہیں پہنچ گیا۔ جسے ضرغام نے ٹرانسمیٹر پر اطلاع دیدی تھی۔

❁ ❁ ❁

اگلے روز معمولات سے فارغ ہو جانے کے بعد ضرغام ٹھیک سات بجے ڈائننگ ٹیبل پر پہنچ چکا تھا۔ اس معاملہ میں وہ وقت کا بہت پابند تھا۔ سوائے غیر معمولی حالات کے وہ روزانہ ٹھیک ساڑھے سات بجے ٹیبل پر پہنچتا تھا اور آٹھ بجے تک اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ آٹھ بجے زہرہ اور ظہیر ٹیبل پر پہنچ جاتے تھے اور پھر ناشتہ شروع ہوتا تھا۔

اخبارات میں مقامی خبروں میں دو خبریں بہت دلچسپ تھیں۔ ایک خبر قتل کی ایک واردات کے سلسلہ میں تھی۔ رج روڈ پر ایک نوجوان کی لاش پائی گئی تھی۔ اور لکھا تھا کہ پولیس مقتول کو شناخت کرانے میں کامیاب نہیں ہوئی اور تفتیش کا سلسلہ جاری ہے۔ خبر کے ساتھ مقتول کی تصویر بھی چھپی تھی۔ دوسری خبر بھی بڑی اہم تھی۔ اور وہ شہر میں ہونے والی گرفتاریوں کے بارے میں تھی ۔ اس خبر میں لکھا تھا کہ جو لوگ گرفتار ہوتے ہیں ان کا تعلق سماج کے مختلف طبقوں سے ہے اور یہ سب جعلی نوٹ چلاتے ہوئے گرفتار ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں جعلی نوٹوں کا جال پھیل چکا ہے اور اب وہ لوگ بھی جن کے پاس دراصل کرنسی نوٹ ہیں بازار میں اس ڈر سے جاتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ ان کا نوٹ بھی جعلی نہ نکل آئے۔ گرفتار ہونے والوں میں صاحب حیثیت لوگ کچھ زیادہ تھے۔ اس لئے اس خبر نے اچھی خاصی سنسنی پیدا کر دی تھی۔

ضرغام نے کئی بار ان دونوں خبروں کو پڑھا۔ مختلف اخبارات نے ان خبروں کو اپنے اپنے طور پر حاشیہ آرائی کے ساتھ چھاپا تھا۔ بعض نے تو نمک مرچ کچھ زیادہ ہی ملا دیا تھا۔ پولیس پر بھی کڑی نکتہ چینی کی تھی اور اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر جعلی نوٹوں کے چلن کا یہی عالم رہا تو ملک افراط زر کا شکار ہو جائے گا۔

ضرغام نے اخبارات کو میز پر رکھ دیا اور وہ غور و فکر میں ڈوب گیا اسے یہ خبر ہی نہیں ہوئی کہ زہرہ اور ظہیر کس وقت میز پر آئے اور کب خانساماں ناشتہ چن کر چلا گیا۔ زہرہ اور ظہیر اپنی اپنی جگہ خاموش بڑے غور سے ضرغام کے چہرے پر اتار چڑھاؤ کو دیکھ رہے تھے۔

”ظہیر صاحب آپ ناشتہ شروع کریں۔ بھیا تو آج فکر کے غوطے کھا رہے ہیں۔“ بالآخر زہرہ نے بوجھل خاموشی کو توڑا۔

اور ضرغام جیسے چونک پڑا ”کب آتے آپ لوگ ۔“ اس نے پوچھا۔

”جب آپ یہاں نہیں تھے۔“ ظہیر نے جواب دیا۔

”پھر میں کہاں تھا؟“ ضرغام نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”پریوں کے دیس میں ہوں گے۔ میں کیا جانوں۔ بات یہ ہے کہ جب لوگ ضرورت سے زیادہ جوان ہو جاتے ہیں تو آوارہ ہی ہو جاتے ہیں۔ کچھ سڑکوں کے آوارہ اور کچھ سوتے جاگتے خوابوں کے ۔ اگر شادی کر لیں تو یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں۔“

”بہت خوب۔“ ضرغام نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے ۔؟“

”میں ذرۂ ناچیز تو مرید ہوں۔ پیر آگے بڑھے تو میں بھی آگے بڑھوں۔“ ظہیر نے جواب دیا۔

”اور وہ کسی نے کہا ہے کہ پیراں نمی پرند، مریداں ....“

”وہ تو فارسی میں ہے میں تو اردو میں ثابت کر رہا تھا۔“ ظہیر نے ضرغام کی بات کاٹتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”اوہ تمہارے لہجہ میں مردمی کا رنگ نمایاں ہے۔“ ضرغام نے کہا ”میری مانو تو اردو چھوڑ دو، سب کچھ مل جائے گا۔“

”سرکار درست فرماتے ہیں۔“ مختار ہیں جو بھی چاہیں کر سکتے

ہیں۔ ہم تو صرف پیروی کے قائل ہیں۔"

زہرہ نے جو بڑی دلچسپی کے ساتھ ان مکالموں کو سن رہی تھی۔ آملیٹ کی پلیٹ ضرغام کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان واقعی اب شادی کر ہی ڈالیئے ۔۔۔ بھابھی کی بڑی تمنا ہے مجھے ۔۔۔"

"آج کل کی لڑکیوں کی حیا تو جیسے اڑ گئی ہے۔" ضرغام نے شوخ نگاہی سے زہرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنی شادی کا تذکرہ کس خوبصورتی سے کر دیتی ہیں کہ بس ۔۔۔"

"بھائی جان!" زہرہ نے جھینپ کر ضرغام کو ٹوکا۔ "آپ بڑے وہ ہیں، بات کو ٹالنے میں تو آپ کا جواب ہی نہیں ہے۔"

"بات کہاں ٹال رہا ہوں بہن۔" ضرغام کا لہجہ اب کچھ جذباتی ہو گیا تھا۔ "پہلے تو مجھے بہن کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں۔"

"نہیں مانیں گے بھائی جان آپ۔ سچ میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔"

"ارے جانا تو تمہیں ہے ہی، دو دن کے لئے ہی سہی، یہ تو ظاہر ہے کہ پھر میرے ساتھ ہی رہو گی۔" یہ بات ضرغام نے ظہیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہی جو نگاہیں جھکائے ہوئے تھا۔

زہرہ نے ضرغام کی یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ضرغام کا منشا کیا ہے۔ لیکن اس نے اپنے چہرے پر کوئی رنگ نہیں آنے دیا۔

"لڑکی میں آپ کو دکھا چکی ہوں۔" زہرہ نے ضرغام کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یقین ہے پسند آ گئی ہو گی۔"

"کیا مطلب۔ پسند سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"صرف یہ کہہ دیجئے کہ پسند آ گئی۔ پھر میں جانوں اور میرا کام۔"

ضرغام نے قہقہہ لگایا۔ "واہ بی شاطرہ۔ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔"

"ہاں ضرغام صاحب! اب آپ سنجیدگی سے اس بارے میں بھی سوچئے۔" اتنی دیر میں پہلی بار ظہیر بولا۔

"بھئی، ابھی میں فی الحال اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" ضرغام نے کہا۔ "سچ بات یہ ہے کہ میں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔ تم جانتے نہیں ہو کہ میری زندگی کا ایک مشن ہے، اور یہ مشن مجھے عزیز ہے۔ شادی کا مطلب یہ ہو گا کہ میں یا تو اس مشن کو ترک کر دوں یا اس لڑکی کیلئے عذاب بن جاؤں جو میرے یہاں دلہن بن کر آئے۔"

"تو پھر یہی بات تو ہم لوگوں کے ساتھ بھی ہے۔" زہرہ نے ٹوکا۔

"نہیں، میری ننھی بہن۔ تم ہمیشہ اس مشن میں شریک نہیں رہ سکتیں البتہ میں تمہارا ۔۔۔"

"بس بس اب رہنے دیجئے۔" زہرہ نے ضرغام کی بات کو درمیان میں سے کاٹ دیا اور ہاتھ بڑھا کر اخبارات اپنی طرف کھسکا لئے ۔۔۔ جیسے ہی اس نے اس میں سے ایک اخبار کو اٹھا کر کھولا۔ وہ چونک پڑی۔

"ارے۔ یہ تو وہی ہے۔" وہ مونہہ ہی مونہہ میں بڑبڑائی۔

"کون۔ وہی کون ہے۔" ضرغام چونکا۔ ظہیر نے بھی زہرہ کے چہرے پر آئی ہوئی تشابہت کو بڑے غور سے دیکھا۔

"بالکل وہی بھائی جان۔ میں نے اسے کل ہی تو دیکھا تھا۔"

اب ضرغام زہرہ کی بات کو سمجھ گیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں نوجوان کے قتل کی خبر گھوم گئی تھی۔

"کہاں دیکھا تھا تم نے اسے۔" ضرغام نے پوچھا۔

اور پھر زہرہ نے ضرغام کو پوری تفصیل بتائی۔ اس نے اس بوڑھی عورت کا خاص طور پر تذکرہ کیا تھا ۔۔۔

"تم نے اس کا تعاقب کیوں ضروری سمجھا تھا؟" ضرغام نے پوچھا۔

"دو باتوں کی وجہ سے۔ اول تو یہ نوجوان نفیس لباس پہنے ہوئے تھا اور ایک معمولی عورت کے سامنے اس طرح سر جھکائے اس کی ڈانٹ پھٹکار سن رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی دیوی ہو۔ اور دوسری وجہ اس کی انگوٹھی۔"

"انگوٹھی؟" ضرغام اک بار پھر چونکا۔ "کیسی تھی وہ انگوٹھی؟"

"کوئی خاص نہیں تھی اس میں۔ سوائے اس کے کہ اس کا نگ قدرے بڑا تھا اور وہ پھر سونے کی تھی۔ ایک معمولی عورت کے ہاتھ میں قیمتی انگوٹھی دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔"

"تمہیں یقین ہے وہ دل شاد نگر کے جس فلیٹ میں گئی وہ اسی کا ہو گا؟"

"یقین سے تو نہیں کہہ سکتی مگر وہاں جس اطمینان کے ساتھ اس نے دروازے کا لاک کھولا اور وہ اندر گئی اس سے تو یہی محسوس ہوا تھا۔"

"یاد کر کے بتاؤ یہ فلیٹ لب سڑک ہے؟" ضرغام کے ذہن میں وہ فلیٹ گھوم گیا جس میں رنجیت داخل ہوا تھا۔

"جی نہیں بھائی جان، وہ بالکل آخری قطار میں تھا۔ جس کے پیچھے ندی بہتی ہے اور ایک بائی لین میں اس کا دروازہ ہے۔"

"ہوں۔" ضرغام نے میز کو ہاتھ سے تھپتھپایا۔ "ذرا ایک پیالی اور تو بناؤ۔" اس نے زہرہ سے کہا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

اس وقفہ میں ظہیر اخبار اٹھا کر دونوں خبروں کو پڑھ چکا تھا۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ جعلی نوٹوں کی خبر بھی بڑی سنسنی خیز ہے۔"

"ہے تو سہی۔" ضرغام نے جواب دیا۔ پھر کچھ دیر سوچنے

کے بعد بولا۔ ظہیر تم زاہرے کہو کہ وہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو حاصل کرلے۔"

"جی بہتر" ظہیر نے جواب دیا اور بستر سے اٹھ گیا۔

"اور سنو۔ تم زہرہ کو لیکر دل شاد نگر جانا۔ اس فلیٹ کی نگرانی ضروری ہے۔ زہرہ فلیٹ دکھاکر واپس آجائے گی"

اگر وہ بوڑھی عورت باہر جائے تو کیا میں اس کا تعاقب کروں" ظہیر نے جو زیڈ تھری تھا، پوچھا۔

"نہیں۔ تم دیکھوگے کہ وہاں کون آتا ہے۔ اگر کوئی مشتبہ آدمی دکھائی دے کہ اس کا تعاقب کرنا ہے۔ بوڑھی عورت کے بارے میں بعد میں دیکھا جائے گا۔ لیکن یاد رہے اگر تمہیں کسی کے تعاقب میں جانا پڑے تو زہرہ کو اس کی اطلاع ضرور دینا ہیں شاید تمہیں نہ مل سکوں گا"

"بہتر ہے" ظہیر نے کہا اور تھری زیڈ کے خفیہ ہیڈکوارٹر جانے کے لئے گیرج کی طرف چلا گیا، جہاں سے ہیڈکوارٹر کو خفیہ راستہ جاتا تھا۔

* * *

ضرغام ان دنوں ذہنی طور پر بہت مصروف تھا۔ خاص طور پر جعلی نوٹ والا معاملہ خود اس کے لئے بے حد سنسنی خیز ثابت ہوا تھا۔ نامعلوم نوجوان کے قتل کی واردات سے اس نے بارہا جعلی نوٹ والے معاملے کو جوڑنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اسے اس کی چھٹی حس بار بار اکساتی تھی کہ وہ اور غور کرے ۔۔۔ وہ دونوں الگ الگ معاملے میں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اس وقت بھی وہ اس تمام معاملے پر غور کر رہا تھا اور اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے بار بار پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور نوجوان کے قتل کے سلسلہ میں پولیس کی تفتیش کی تفصیلات کو پڑھا تھا جو اسے تھری زیڈ کے ایک ایجنٹ کے ذریعے موصول ہوئی تھیں جو پولیس ہیڈکوارٹر میں کام کرتا تھا۔ لیکن بار بار پڑھنے پر بھی ضرغام ان میں کوئی خاص نکتہ تلاش نہیں کر پایا تھا۔۔۔ عام سی باتیں تھیں۔ البتہ یہ بات بہت صاف تھی کہ پولیس کی تفتیش میں کہیں بھی شبہ کے طور پر بھی جعلی نوٹ والے معاملے کا ذکر نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس ان دونوں معاملات کو الگ الگ تصور کر رہی ہے۔ ضرغام کو ابھی تک رنجیت اور بوڑھی عورت کی نگرانی کرنے والے تھری زیڈ ٹو اور زیڈ فور سے بھی کوئی خاص اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔ ان کی رپورٹوں میں مسلسل ایک ہی بات کہی جارہی تھی کہ ان دونوں سے ملنے کوئی نہیں آیا البتہ کئی بار وہ اپنے اپنے فلیٹ سے باہر ضرور گئے۔ لیکن بازار سے کچھ خرید و فروخت کرکے واپس آگئے۔ بازار یا راستے میں وہ کسی سے نہیں ملے۔ اس صورت حال سے غیر مطمئن ہوکر ضرغام نے زیڈ تھری اور زیڈ فور دونوں کو ہدایت کردی تھی کہ وہ رنجیت اور بوڑھی عورت کے فلیٹ میں ڈکٹیفو ٹرانسمیٹر چھپا دیں تاکہ فلیٹ کے اندر کوئی بات ہوئی ہو تو اس کو سنا جاسکے۔۔۔ یہ ڈکٹیفو ٹرانسمیٹر املی کے بیج کے سائز کے اعلیٰ طاقت کے ٹرانسمیٹر تھے۔ جن کے ساتھ کسی برقی تار کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی فریکوئنسی سیٹ تھی۔ اس فریکوئنسی پر ان کے ذریعے تھری زیڈ کے ہیڈکوارٹر میں تمام گفتگو کو سنا اور ٹیپ کیا جاسکتا تھا۔ بشرطیکہ یہ ہیڈکوارٹر سے پانچ کلومیٹر کے کے دائرے کے اندر رہوں۔ اس سے زیادہ فاصلہ ہو تو ان کے ذریعے گفتگو سننے کا انتظام کرنا پڑتا تھا اور تھری زیڈ کے ایجنٹوں کو ٹیپ ریکارڈ کم ٹرانسمیٹر مہیا کرنے پڑتے تھے۔ خوش قسمتی سے دل شاد نگر کے دونوں فلیٹ جن میں رنجیت اور وہ بوڑھی عورت مقیم تھی، پانچ کلومیٹر کے دائرے ہی میں واقع تھے۔

ضرغام کچھ غیر مطمئن انداز میں ان دونوں معاملوں پر غور کر رہا تھا کہ ذاکر خفیہ ہیڈکوارٹر کی لیب سے بڑی تیزی کے ساتھ باہر آیا۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا، اور آنکھوں میں شوخی اس امر کی غمازی کر رہی تھی کہ وہ کسی خاص اطلاع کے ساتھ لیب سے باہر آیا ہے۔ ذاکر کا تھری زیڈ میں اپنا کوئی نمبر نہیں تھا۔ لیکن وہ ضرغام کا نائب تھا اور ضرغام کی غیر موجودگی میں زیڈ ون کے طور پر ہی کام کرتا تھا۔ اور ضرغام نے ذاکر کو اس طرح آتے دیکھا تو چونک اٹھا۔

ذاکر نے غالباً ضرغام کی آنکھوں میں ابھرنے والے سوالات کو پڑھ لیا تھا۔ مقابل کے صوفے پر اس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بہت اہم اطلاعات ہیں ضرغام صاحب"

"سسپنس پیدا نہ کرو برخوردار۔ میرے خیال میں جعلی نوٹوں کے سلسلہ میں کچھ معلومات لائے ہو"

"آپ کا خیال درست ہے" ذاکر نے جواب دیا ۔۔۔

"یہ معاملہ اب خاصہ دلچسپ بن گیا ہے"

"پھر وہی سسپنس" ضرغام نے ٹوکا۔

"بتاتا ہوں۔ آپ تو سانس بھی نہیں لینے دیتے"

"ہوں" ضرغام نے ہنکارا بھرا" اچھا تو تم سانس لے لو۔ میں ذرا کہیں ہوا آؤں"

"ارے نہیں" ذاکر بہ عجلت بولا۔ میرا مطلب یہ تھوڑا ہی تھا۔ بخدا آپ تو سرسوں پر ہتھیلی۔۔۔۔"

"ہتھیلی پر سرسوں برخوردار" ضرغام مسکرایا" مجھے واقعی کچھ کام ہے اور پھر تمہارے پاس کچھ خاص معلومات بھی نہیں ہوں گی"

عمران نے دراصل یہ کہہ کر ذاکر کو اکسایا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ ذاکر اس طرح کا سسپنس اسی وقت پیدا کرتا ہے جب اس کے پاس کچھ اہم معلومات ہوتی ہیں۔

"سبھی کو چھوڑ دیا گیا ہے۔" ذاکر نے ویسے دھماکہ کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح عمران کے نفسیاتی حملے کا شکار ہو گیا تھا۔

"کس کو چھوڑ دیا گیا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"ان سبھی کو جنہیں جعلی نوٹوں کے سلسلہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔" ذاکر نے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی اطلاع نہ ہوئی۔" عمران نے کہا۔ "ظاہر ہے بڑی تعداد میں معزز اور عام لوگ گرفتار کئے گئے تھے۔ وہ سب تو کسی اسکینڈل میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے ان کو تو چھوڑا جانا ہی تھا۔"

"افوہ۔" ذاکر نے گہری سانس لی اور پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے، آپ کو اس کی توقع تھی۔"

"یقیناً، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان کے بیانات کیا ہیں۔ ایک ہی نوعیت کے ہیں یا الگ الگ اور یہ کہ جعلی نوٹ ان کو کہاں سے اور کیسے ملے؟"

"دراصل عالی نوٹوں پر اتنے لوگوں کی گرفتاری سے شہر میں سنسنی پھیل گئی تھی اور عام لوگ....."

ذاکر اپنا جملہ پورا بھی نہ کرنے پایا تھا کہ عمران نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"پھر وہی سسپنس۔ ہاں مجھے معلوم ہے شہر میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔ بازاروں میں خرید و فروخت بند سی ہو گئی تھی۔ لوگوں نے سو کے نوٹ چھپاتے تھے بس، اور کچھ۔ اب آگے کہو۔"

"بہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبان میری۔" ذاکر نے یہ کہتے ہوئے گہرا سانس لیا اور کچھ وقفہ خاموش رہ کر پوچھا۔

"تو پھر گرفتار شدگان کے بیانات کے بارے میں بھی خود اندازے لگا لیجئے۔"

عمران ذاکر کی بات سن کر صرف مسکرا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ذاکر خود ہی تھوڑی دیر میں گرامو فون بن جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

"آپ کا خیال درست ہے۔ گرفتار ہونے والے زیادہ تر کاروباری لوگ تھے یا ملوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے ورکرز تھے۔"

"کوئی خاص بات نہیں بتائی تم نے۔ میں نے ان کے بیانات کے بارے میں پوچھا تھا۔"

"وہی تو بتا رہا ہوں۔ کاروباری لوگوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے یہ روپے بنک سے چیک کیش کرا کے حاصل کئے ہیں۔ ورکروں اور مزدوروں کا کہنا تھا کہ انہوں نے جو نوٹ پیلائے وہ انکے فیکٹری مالکوں نے تنخواہ کی صورت میں دیئے تھے۔ جب اس سلسلہ میں ان لوگوں سے پولیس نے پوچھ تاچھ کی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ انہیں یہ نوٹ بنک سے ملے تھے۔"

"کس بنک سے؟" عمران نے پوچھا۔

"اسٹیٹ بنک کی مقامی برانچ سے۔" ذاکر نے جواب دیا۔ "اب پولیس بنک کے ملازمین اور افسران کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔"

"میرا خیال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ بنک کے ملازمین کے بیانات کیا ہیں، معلوم کرو۔ مجھے یہ بنک میں ڈکیتی کی ایک دلچسپ واردات محسوس ہوتی ہے۔"

"پولیس نے بنک منیجر کیشیئر چوکیدار اور اسٹرانگ روم کے انچارج کو حراست میں لے لیا ہے۔" ذاکر نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن ان میں سے کسی سے بھی کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ اسٹرانگ روم کے اندر اس صندوق میں جس میں سو سو کے کرنسی نوٹ رکھے جاتے ہیں، کچھ جعلی نوٹ اور ملے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اسٹرانگ روم سے جعلی نوٹ کیشیئر کے پاس پہنچے اور اس نے ان کو تقسیم کر دیا مگر یہ اسٹرانگ روم میں پہنچے کیسے؟"

"یہ بات معلوم نہیں ہو سکی۔ پولیس اسی سلسلہ میں پوچھ تاچھ کر رہی ہے۔" ذاکر نے جواب دیا۔

"میرے خیال میں یہ بات ممکن نہیں ہے۔ بنک منیجر یا اسٹرانگ روم کے انچارج نے جعلی نوٹ صندوق میں رکھے ہونگے۔" عمران نے کہا۔

"لیکن پھر اس کے علاوہ اور کیا سوچا جا سکتا ہے۔" ذاکر نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے بنک میں ڈاکہ پڑا ہو۔" عمران نے رائے ظاہر کی۔

"قطعی نہیں۔" عمران کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ذاکر نے کہا۔ "بنک کے تمام لاک محفوظ پائے گئے۔ پولیس کو بھی اس سلسلہ میں شبہ ہوا تھا۔ لیکن کوئی علامت ایسی نہیں پائی گئی جس سے اس رخ پر معاملہ آگے بڑھایا جا سکتا۔ کسی دروازے یا لاک پر انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ اگر پائے گئے تو ان ہی لوگوں کے جو متعلق ہیں۔ بنک کا چوکیدار کہتا ہے کہ وہ تمام رات ڈیوٹی دیتا رہا ہے اور اس کا کہنا یہ ہے کہ ایک رات بجلی غروب ہو گئی تھی

اور نیند کے غلبہ کے سبب اس کی آنکھ جھپک گئی تھی۔

"بس تو اسی روز سب کچھ ہو گیا ہوگا" ضرغام نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں چمک کچھ بڑھ گئی تھی۔

"چوکیدار کا کہنا ہے کہ اس نے بنک کے گیٹ سے ٹیک لگا لی تھی۔ اگر کچھ ذرا سا بھی کھٹکا ہوتا تو اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ گہری نیند نہیں سویا تھا" ذاکر نے جواب دیا۔

"ابھی بچے ہو برخوردار" ضرغام نے ہنس کر کہا۔ "یہاں سائنس کی ایجادات کا بیشتر فائدہ صرف مجرم ہی اٹھاتے ہیں۔ کیا تم انٹرپول کی وہ رپورٹ بھول گئے جو مغربی جرمنی کی مجرم جولیانا کی مجرمانہ سرگرمیوں کے بارے میں ہے اور ہماری لائبریری میں موجود ہے۔"

"اوہ" ذاکر نے گہرا سانس لیا۔

"صاف ظاہر ہے۔ اس قسم کی گیس ایجاد ہو چکی ہے جو بغیر کسی دھماکے کے پھیل جاتی ہے اور انسانی دماغ پر اس طرح اثر انداز ہو جاتی ہے کہ وہ آہستہ آہستہ بالکل اسی طرح سو جاتا ہے جس طرح قدرتی طور پر نیند آتی ہے اور اس نیند کے عالم میں بھی وہ خود کو جاگتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یعنی اس کو گہری نیند کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف غنودگی کا احساس ہوتا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا" ذاکر نے پوچھا۔

"چوکیدار کے بیان کو سننے کے بعد میرا یہی خیال ہے۔ اس طرح کی نیند کی کیفیت ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ دیر تک رہتی ہے اور یہ مہلت کسی بھی جرم کے لئے کافی ہے۔"

"آپ تو اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے واقعی بنک میں ڈاکہ پڑا ہو" ذاکر نے کہا۔

"واقعی ڈاکہ پڑا ہے" ضرغام نے جواب دیا۔

"لیکن تالے جوں کے توں پائے گئے" ذاکر نے کہا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تالے کھولے جا سکتے ہیں۔" ضرغام نے جواب دیا۔ "کوئی بھی ماہر چور اس کام کو بخوبی انجام دے سکتا ہے۔"

"آپ ایک بات بھول رہے ہیں ضرغام صاحب" ذاکر نے جواب دیا۔ "جعلی نوٹ اسٹرانگ روم میں رکھے ہوئے صندوق میں ملے ہیں اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ اسٹرانگ روم سے یہ نوٹ بنک میں کیشیئر تک پہنچے۔"

"تمہارا مطلب یہی ہے۔ اسٹرانگ روم جانے کے لئے راہداری میں بہترین اسپیشل تالا لگا ہوا ہے۔ بنک منیجر کا کہنا ہے کہ کوئی بھی اس تالے کو کھول نہیں سکتا۔ صرف اسٹرانگ روم کے انچارج کو اس کے کھولنے کا راز معلوم ہے۔"

"اور یہ تالا مغربی جرمنی سے منگوا کر لایا گیا تھا۔ ہیں نا" ضرغام نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بنک منیجر کا یہی کہنا ہے۔"

"جولیانا نے پیرس کے انٹرنیشنل بنک میں ایسا ہی تالا کھول کر ڈاکہ ڈالا تھا" ضرغام نے کہا۔

"مجھے یاد ہے۔ میں نے اس بارے میں انٹرپول کی رپورٹ دیکھی ہے۔ لیکن جولیانا یہاں کہاں۔ وہ تو گرفتار ہو چکی تھی۔"

"گرفتار ہونے والی حسینہ اس کی کاپی تھی" ضرغام نے جواب دیا۔ "رہا جولیانا کا یہاں ہونے کا سوال تو مجھے ہوٹل زمرد میں بیٹھی وہ حسینہ یاد آ رہی ہے جس کے ساتھیوں نے میرا پیچھا کیا تھا۔"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بوڑھی عورت جس کے پاس زہرہ نے نامعلوم مقتول کو دیکھا تھا جولیانا ہو سکتی ہے۔"

"کبھی کبھی بڑے کام کی بات کہہ جاتے ہو برخوردار۔" ضرغام کی آنکھوں میں چمک کچھ اور زیادہ بڑھ گئی۔ "وہ بوڑھی عورت بھی جولیانا ہو سکتی ہے۔ میرا ذہن اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ قتل کی اس واردات کا جعلی نوٹوں کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"لیجئے آپ نے تو تعلق بھی جوڑ لیا" ذاکر نے کہا اور ہنسنے لگا۔

"سچ مچ کبھی کبھی بالکل گھامڑ لگتے ہو۔"

"سچ جانیئے تو میں نے خود بھی انہی خطوط پر سوچا تھا۔" ذاکر نے ضرغام کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل آپ سے اپنے اندازے کی تصدیق چاہتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے" ضرغام نے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ کو تو جیسے ہر بات معلوم تھی" ذاکر نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ایک اطلاع تم اب بھی چھپاتے ہوئے ہو" ضرغام نے کہا۔

"چلئے مان لیا۔ اب لگے ہاتھوں وہ بھی خود ہی بتا دیجئے" ذاکر نے جواب دیا۔ ویسے وہ ضرغام کی ذہانت کا ہمیشہ سے قائل تھا۔

"ظاہر ہے مجھے علم غیب نہیں آتا" ضرغام نے جواب دیا۔ "یہ تو میرا اندازہ تھا کہ ابھی تمہارے حلق میں کچھ اٹکا ہوا ضرور ہے۔"

"جعلی نوٹوں کے سلسلے میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ انہوں نے رہائی کے بعد بڑا مظاہرہ کیا تھا۔ مظاہرے میں صرف وہی لوگ نہیں تھے بلکہ بڑی تعداد میں شہر کے دوسرے لوگ بھی

شامل ہو گئے تھے۔"

"اوہ" ضرغام نے چونک کر کہا "اس کا مطلب ہے کہ معاملہ کو سیاسی رنگ بھی دیا گیا ہے۔"

"جی ہاں، ہمارے دیش کی سیاسی پارٹیاں بڑی چوکنا رہتی ہیں۔ ذرا کوئی بات ہوئی اور اسے لے اڑیں۔ خاص طور پر اگر حکمران سیاسی جماعت کو بدنام کرنے کی بات ہو تو پھر سب کچھ کر گزرتی ہیں۔ عوامی مشکلات سے اگر کسی کو فائدہ اٹھانا ہو تو ان پارٹیوں میں شامل ہو جائیے۔ پھر مزے کی بات یہ ہے کہ ہر حکمران پارٹی جب زوال پذیر ہوتی ہے تو وہ بھی یہی رول ادا کرتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد بھی سماج کی نشاۃ ثانیہ ممکن نہیں ہو سکی ہے۔ سماجی طور پر جو لوگ بہت بڑے تھے وہ اب بھی بڑے ہیں..."

"بس بس، کبھی کبھی تم بھی بہت جذباتی بن جاتے ہو۔ ایسا کرو تم بھی ایک نئی سیاسی پارٹی بنا لو۔"

"حضور یہ سب کچھ آپ کے قریب رہ کر ہی تو سیکھا ہوں۔ یہ نیک کام بھی آپ ہی کر ڈالیں۔" ذاکر نے ہنس کر جواب دیا۔

"ہاں تو پھر مظاہرہ ہوا۔ اس کے بعد؟" ضرغام نے پوچھا۔

"اس مظاہرے میں سیاسی لیڈروں نے بھاشن دیئے۔ سرکار پر نااہلی کا الزام لگایا اور مطالبہ کیا کہ بینک سے تمام نقلی نوٹوں کو بدلوایا جائے۔"

"اوہ" اور وہ مانگ پوری کر دی گئی؟" ضرغام نے چونک کر ذاکر کو دیکھا۔

"ماننی تو پھر کیا کرتی۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ جو لوگ جعلی نوٹوں کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے تھے وہ بے قصور تھے۔ اسی لئے ان سب کو اعلیٰ افسروں نے رہا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اب رہا نوٹوں کا سوال تو اس میں بھی ان کا کیا قصور تھا۔ بینک نے وہ نوٹ جاری کئے اور انہوں نے چلانے کی کوشش کی۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی گھپلا ہوا ہے تو اس کو عام لوگ کیوں بھگتیں.... چنانچہ وزیر اعظم نے اعلان کر دیا ہے کہ جن لوگوں کے پاس جعلی نوٹ ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے بعد کہ انہیں یہ بینک سے ملے ہیں۔ واپس کر سکتے ہیں اور اس کی جگہ اصلی کرنسی نوٹ حاصل کر سکتے ہیں۔"

"یہ شرط تو بڑی مشکل نظر آتی ہے۔ خیر اس کا مطلب ہوا کہ قوم کا دوہرا نقصان۔ بھلا کتنی جعلی کرنسی کے نوٹ ہوں گے؟"

"پچاس لاکھ کا اندازہ ہے۔" ذاکر نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے بینک کو ایک کروڑ روپے کا نقصان ہوگا۔"

"جی ہاں۔" ذاکر نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ پچاس لاکھ روپیہ جو بینک سے جعلی نوٹوں کے بدلے دے جایا گیا۔ بازار میں بلیک منی کے طور پر آ جائے گا۔" ضرغام نے ذاکر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "اور افراط زر سے کساد بازاری پیدا ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے ایک تیر سے کئی شکار کئے گئے ہیں۔"

"لیکن جو نوٹ بدلے گئے ہیں ان کے نمبر بینک میں نوٹ ہیں اور ظاہر ہے پولیس نے ان کو مشتہر کر دیا ہوگا۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ضرغام نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے اگر اس جرم میں جولیانا کا ہاتھ ہے تو وہ ان نوٹوں کو بازار میں پھینک بھی چکی ہوگی۔"

"جولیانا کے بارے میں یہ بات بڑی قطعیت کے ساتھ کہ رہے ہیں۔" ذاکر نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"صرف اندازہ ہے میرا۔ کیوں کہ جرائم کی دنیا میں اس انداز سے جرم کرنے کا انداز صرف جولیانا ہی کا ہے۔"

"خیر۔ اگر آپ کا اندازہ درست ہے تو پھر جولیانا کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ضرغام کے وطن میں جرم کرنے کا مطلب کیا ہے۔" ذاکر نے کہا اور ایک زوردار انگڑائی لے کر اٹھ گیا۔

ضرغام دیر تک اس پورے کیس پر غور کرتا رہا اور کڑی سے کڑی ملانے کیلئے ذہنی ورزش کرتا رہا۔ کئی بار اسے نامعلوم مقتول کا خیال بھی آیا۔ یہ بات تو اب اس کے ذہن میں تقریباً صاف ہو گئی تھی کہ مقتول جو کوئی بھی رہا ہو اس کا تعلق کسی نہ کسی طرح جعلی نوٹوں کے معاملے سے ضرور تھا۔ لیکن کیا؟ یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ مقتول کیا اسی گروہ کا ممبر تھا یا پھر بوڑھی عورت نے اس کو کوئی جعلی نوٹ دیا تھا اور وہ پہچان کر جھگڑا کرنے لگا تھا؟ یہ سوال اس کے ذہن میں تیزی کے ساتھ گردش کر رہا تھا۔ لیکن فی الحال کسی سوال کا جواب وہ تلاش نہیں کر سکا تھا۔

٭ ٭ ٭

اسٹیٹ بینک میں جعلی نوٹوں کی تبدیلی لوگوں کی گرفتاری اور رہائی اور پھر اس کے بعد مظاہرے کے سلسلہ میں اخبارات کی قیاس آرائیوں نے خاصی دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ ایک طرف اخبارات کی اشاعت بڑھ گئی تھی۔ اور دوسری طرف پولیس کے ذمہ دار افسر خاص طور پر انسپکٹر شیکھر بار بار اخبارات کے دفتروں میں جا دھمکتا تھا۔ پہلے وہ ان سے قیاس آرائیوں کے سلسلہ میں پوچھتا اور جب تسلی بخش جواب نہ پاتا تو دھمکیاں دیتا ہوا واپس چلا جاتا۔ اخبارات کو بھی دور کی سوجھتی تھی۔ وہ بینک کے منیجر اور دوسرے عملے کو بے گناہ بتاتے ہوئے یہ رائے ظاہر کر رہے تھے کہ جعلی نوٹ

ٹکسال ہی سے بھجوائے گئے ہوں گے اور ضرور اوپر کی سطح پر کوئی ڈکیٹ کام کر رہا ہوگا۔ اخبارات نے اور زیادہ دلچسپی اس وقت پیدا کر دی جب ان اصلی نوٹوں کو بازاروں میں چلاتے ہوئے کچھ لوگ پکڑے گئے جن کو بنک سے تبدیل کیا گیا تھا اور جن کی جگہ جعلی نوٹ رکھ دیئے گئے تھے۔ پولیس کا خیال تھا کہ اسے جعلی نوٹوں کے اسکینڈل کو حل کرنے کا سراغ مل گیا ہے۔ لیکن جب گرفتاریوں کا سلسلہ سیکڑوں تک پہنچنے لگا تو مایوسی کی فضا پیدا ہوگئی۔

عجیب سی صورتحال تھی۔ انسپکٹر شیکھر کو اعلیٰ افسروں کی جھاڑ پر جھاڑ پڑ رہی تھی۔ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد کسی نہ کسی جگہ سے اصلی نوٹ چلاتے ہوئے لوگوں کی گرفتاریوں کی جو اطلاعات مل رہی تھیں وہ الگ پریشان کن تھیں۔

انسپکٹر شیکھر ابھی ابھی آئی جی پولیس کے دفتر میں خاصی جھاڑ سننے کے بعد واپس آیا تھا اور اپنے دفتر میں سر پکڑے ہوئے بیٹھا تھا۔ ابھی افسروں کا تازہ گرفتاریوں کے سلسلہ میں بھی نقطہ نظر دیا تھا۔ جو جعلی نوٹوں کے سلسلہ میں گرفتار ہونے والوں کے بارے میں تھا یعنی یہ کہ اگر اصلی نوٹ بازار میں لے کر جانے والے مجرم ہوتے تو ان کی اتنی بڑی تعداد نہ ہوتی۔ ان افسران نے شیکھر کو ہدایت کی کہ وہ ان سب کو بھی رہا کردے اور یہ معلوم کرے کہ ان لوگوں کے پاس اصلی نوٹ کہاں سے آتے۔ انسپکٹر شیکھر کا بس چلتا تو وہ جعلی نوٹ چلانے والوں کو بھی نہ چھوڑتا۔ چہ جائیکہ اصلی نوٹ چلانے والے اس کے خیال میں کیس تو حل ہونے والا ہی تھا۔ جعلی افسران خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہے تھے۔ بہرحال اس کو ہدایت کی پابندی کرنی پڑی اور دن بھر میں جتنے لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا ان سب کو چھوڑ دیا گیا اور ان کے بیانات ضرور لے لئے گئے۔

اب ایک بڑا مسئلہ ان اصلی نوٹوں کا پیدا ہوگیا تھا۔ جن کے پاس یہ نوٹ تھے آخر ان کا کیا قصور ہ معاملہ کیبنٹ میں پہنچا اور فیصلہ یہی کیا گیا کہ جو اصلی نوٹ بازار میں آئیں انہیں چلنے دیا جائے اور کسی سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ البتہ یہ ضرور معلوم کیا جانا چاہیئے کہ یہ نوٹ کہاں سے چلے اور کس طرح عام لوگوں تک پہنچے۔

انسپکٹر شیکھر نے مختلف تھانوں سے موصول ہونے والی اطلاعات کو دیکھا اور کچھ ضروری نوٹ کئے اور پھر اٹھ کر اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔

گھر پہنچنے کے بعد انسپکٹر شیکھر نے ابھی بیلٹ ہی کھولی تھی کہ ٹیلیفون کا بزر چیخ اٹھا۔ اس نے غصہ کی حالت میں گھور کر ٹیلیفون کو دیکھا اور بیلٹ پھر کس لی۔

"نجانے کون کمبخت ہے۔ ناک میں دم آگیا ہے۔" وہ بڑبڑایا اور ٹیلیفون اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے دھاڑا۔

"اب کون ہے؟"

"بہت زیادہ غصے میں معلوم ہوتے ہو؟" دوسری طرف ضرغام تھا۔

"میں پوچھتا ہوں تم کون ہو؟" انسپکٹر شیکھر نے پھر پوچھا۔

"پہچانو؟" ضرغام نے کہا۔

"میرے پاس فضول باتوں کے لئے وقت نہیں ہے سمجھے۔ میں فون بند کر رہا ہوں؟" انسپکٹر شیکھر نے جیسے دھمکی دی۔

"کیا شکرے شکرے لگا رکھی ہے۔ کون ہو تم۔" انسپکٹر شیکھر نے ایک بار پھر سوال کیا۔

"بھئی مجھے شیکھر نام کچھ جچتا نہیں ہے۔ آج سے میں نے تمہارا نام شکرے رکھ دیا۔ یوں بھی تم شکرا ہو پالتو شکرا۔ جب تک تمہیں شکار نہ دکھایا جائے اڑ ہی نہیں سکتے؟"

"میں پوچھتا ہوں یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے؟" انسپکٹر شیکھر نے زور سے کہا اور پھر ٹیلیفون رکھ دیا۔

ابھی اس نے کھولنے کے لئے بیلٹ کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ ٹیلیفون پھر چیخا۔ اس دوران اس کی بیوی وینا بھی وہاں آکھڑی ہوئی تھی — وینا ایک نیک خو اور اچھے خدوخال کی شوہر پرست عورت تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر فون اٹھا لیا۔

"ہیلو" وینا نے کہا۔

"ہیلو۔ کون وینا بہن بول رہی ہیں؟" ضرغام نے شیکھر کو دوبارہ فون کیا تھا۔

"ہاں۔ میں وینا ہوں۔ آپ کون بول رہے ہیں؟"

"تمہارا وہ بھائی جس کو تم نے کبھی نہیں دیکھا —" دوسری طرف ضرغام نے جواب دیا۔

"اوہ۔ بھیا۔ میں نہیں بولتی آپ سے" وینا نے کہا۔

"کیوں۔ بھلا کوئی بہن بھی اپنے بھائی سے روٹھتی ہے —" ضرغام نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"مگر کوئی بھائی بھی ایسا ہوتا ہے جو بہن کو دکھائی نہ دے" وینا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"کون ہے —" شیکھر نے جو یہ گفتگو سن رہا تھا۔ ٹیلی فون کے قریب پہنچنے پر اپنی بیوی سے پوچھا۔

ضرغام نے دوسری طرف انسپکٹر شیکھر کی آواز سن لی تھی۔

"تم کپڑے اتارو" وینا نے اپنے شوہر سے کہا — "ہے کوئی میرا بھائی۔"

"کیا کہا۔ کیر رہے؟" ضرغام نے پوچھا۔

"دینا ہنس دی" ارے ان سے کہہ رہی تھی ٹیلیفون ہاتھ میں ہے اور پوچھ رہے ہیں کس کا ٹیلیفون ہے۔ آپ بتلائیے آپ مجھ سے ملنے آئے کیوں نہیں؟"

"اوہ معلوم ہوتا ہے تم نے شوہر کے ساتھ کوئی سازش کر لی ہے" ضرغام نے کہا۔

"کیسی سازش" دینا نے پوچھا۔

"مجھے پکڑنے کی اور کیسی" ضرغام نے ہنس کر جواب دیا۔

"آپ کو۔ آپ کو پکڑ سکتا ہے بھلا کوئی اور وہ بھی میرے گھر میں" دینا نے کہا۔

"بھئی مجھے سچ مچ ڈر لگتا ہے انسپکٹر شیکھر سے۔ اس نے عہد کیا ہے مجھے ہتھکڑی پہنانے کا" ضرغام نے بدستور ہنستے ہوئے جتا دیا۔

"دماغ خراب ہے ان کا" دینا نے غصہ میں کہا۔ شاید اس کو غصہ بھی آ گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس کا بھائی خواہ وہ کوئی بھی ہے اس کے شوہر کے کام آتا رہا ہے اور اس کے شوہر کو جتنی بھی ترقیاں ملیں سب اسی کی وجہ سے ملی ہیں۔ دراصل یہی وہ بات تھی کہ جس کے سبب وہ اپنے ان دیکھے بھائی کو دیکھنے کے لئے بے چین ہو جاتی تھی۔

"ارے میں آپ کی وجہ سے ہی تو خاموش ہو جاتا ہوں ورنہ اس شکرے کو تو"

"کیا بکتے ہو" انسپکٹر شیکھر نے جو اس دوران اپنی بیوی سے ریسور لے کر کان سے لگا چکا تھا، دھاڑ کر کہا۔

"شانتی شانتی انسپکٹر" ضرغام نے ہنس کر جواب دیا "یہ جنس تم کب سے بدلنے لگے ہو"

"بکواس بند کرو" انسپکٹر شیکھر نے کہا "کیوں ٹیلیفون کیا ہے"

"یہ نہیں پوچھو گے کہ میں کون ہوں" ضرغام نے پوچھا۔

"اب ضرورت نہیں، تمہیں پہچان چکا ہوں" انسپکٹر شیکھر نے جواب دیا "مقصد بیان کرو، مجھے نیند آ رہی ہے"

"حالانکہ یہ وقت جاگنے کا ہے۔ مجرم رات ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں"

"کیسے مجرم" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔

"جعلی کرنسی والے اور کیسے" ضرغام نے جواب دیا۔

"اوہ تو یہ تم ہو" انسپکٹر شیکھر نے طنز کیا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس قدر گھٹیا پن پر اتر جاؤ گے"

"کیا مطلب" ضرغام نے قہقہہ لگایا۔

"مطلب جب ہاتھ آ جاؤ گے تو سمجھا دوں گا۔ میں ایک مدت سے تمہاری تلاش میں ہوں"

"اور زندگی بھر رہو گے" ضرغام نے جواب دیا۔ "ویسے میں ایک دن تمہارے گھر آؤں گا ضرور اپنی بہن سے ملنے کے لئے"

"بکواس بند کرو" انسپکٹر چیخا "شریف عورتیں مجرموں کی بہن نہیں ہوا کرتیں"

"اور شریف مرد مجرم عورتوں کے وہ بن جاتے ہیں ——" ضرغام نے قہقہہ لگایا۔

"کیا مطلب" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔

"شریف مرد کا مطلب بتاؤں یا مجرم عورتوں کا یا ازبیلا کا"

"خاموش رہو" انسپکٹر نے بعجلت کہا۔ اس کے لہجے میں گرمی کم ہو گئی تھی۔

ازبیلا دراصل ایک مجرم عورت تھی۔ لکھی پڑھی لکھی بنگالن کس طرح انسپکٹر شیکھر کی اسٹینو بن گئی تھی۔ شیکھر نے اس سے آگے عشق کی پینگیں بڑھائیں اور اس نے شیکھر کی سرپرستی میں جرائم کیے۔ اس معاملے میں انسپکٹر شیکھر بھی لپیٹ میں آ جاتا وہ تو ضرغام نے اس کی مدد کی۔ ازبیلا کی بات ضرغام کے منہ سے سن کر شیکھر کو پسینہ آ گیا۔ اگرچہ اس کو معلوم نہیں تھا کہ ازبیلا کے چکر سے اس کو بچانے والا کون تھا۔

"تو وہ بھی تم تھے" انسپکٹر شیکھر نے کچھ وقفہ کے بعد کہا۔

"خیر کوئی بات نہیں" ضرغام نے انسپکٹر شیکھر کی بات کا جواب نہ دیتے ہوئے کہا "اس بار میں نے ازبیلا سے تمہیں نجات دلائی تھی تو اب کی بار ایک خوبصورت بلا تمہارے حوالے کر دونگا۔ تم اسے بھی اسٹینو بنا لینا اور مزے کرنا"

"کیا مطلب" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے جعلی نوٹوں کے معاملے میں تم تو کچھ کر پاؤ گے نہیں، میں ہی کچھ کروں گا" ضرغام نے جواب دیا۔

"کیا جانتے ہو اس معاملے میں" ضرغام نے جواب دیا۔

"میں بہت پریشان ہوں یار" اس بار انسپکٹر شیکھر جیسے رو پڑا "عجیب طرح کا کیس ہے نہ سر ہے نہ پیر ہے"

"پرواہ نہ کرو۔ الٹے ہو کر کھڑے ہو جایا کرو۔ سر بھی ہو جائے گا اور پیر بھی" ضرغام نے کہا۔

"مذاق اڑا رہے ہو" انسپکٹر نے کہا۔

"ارے توبہ۔ بھلا یہ میری مجال کہاں" ضرغام نے جواب دیا "وہ تو میں دماغ کو تیز کرنے کا نسخہ بتا رہا تھا اور ظاہر ہے جب تک دماغ کام نہیں کرے گا، تم سراغ رسانی کیسے کرو گے؟"

"جعلی نوٹ والے معاملے میں کچھ معلوم ہو تو بتاؤ" انسپکٹر

شیکھر نے پوچھا۔
"ابھی کچھ دن پہلے جو قتل ہوا تھا۔ اس بارے میں تمہاری تفتیش کہاں تک پہنچی" ضرغام نے انسپکٹر شیکھر کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"کہیں تک بھی نہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ معاملہ آگے بڑھے" انسپکٹر شیکھر نے جواب دیا۔
"لیکن اس قتل سے جعلی نوٹ کے کیس کا کیا تعلق ؟"
"تعلق ہے پیارے" ضرغام نے جواب دیا — "مشکل یہ ہے کہ تم صرف پولیس والے ہو"
"کیا تعلق ہے ؟" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔
"اس کا تعلق بھی اسی لئے ہوا کہ وہ جعلی نوٹ والے گروہ سے بچھڑ گیا تھا" ضرغام نے جواب دیا۔
"کیا مطلب ہے اس سے تمہارا" انسپکٹر شیکھر نے مایوسی کے ساتھ پوچھا۔
"فی الحال نہیں"
"تو پھر فون کس لئے کیا تھا۔ بک بک کے لئے" انسپکٹر شیکھر نے جھلا کر کہا۔
"تمہیں مستقبل میں ایک اچھی سی اسٹینو گرافر کا تحفہ پیش کرنے کی اطلاع دینے کے لئے" ضرغام نے ہنس کر جواب دیا۔ ویسے وہ انسپکٹر شیکھر کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا اور لطف اندوز ہو رہا تھا
"میں واقعی آجکل پریشان ہوں" انسپکٹر شیکھر نے کہا۔
"تبھی تو میں تم پر مہربان ہوا ہوں" ضرغام نے جواب دیا
"ویسے ایک بات مانو تو کہوں ؟"۔
"کیا ؟" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔
"بنک منیجر اور عملہ کے دوسرے لوگوں کو چھوڑ دو —" ضرغام نے کہا۔
"کیا مطلب۔ کیوں چھوڑ دوں ؟" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔
"کیوں کہ وہ بے قصور ہیں۔ انہیں کچھ بھی نہیں معلوم" ضرغام نے جواب دیا اور اگر چاہو تو ان پر صرف نگاہ رکھ سکتے ہو"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے" انسپکٹر شیکھر نے کہا — اگر یہ لوگ بے قصور ہیں تو بنک کے اس حصہ میں جہاں پرندہ بھی پار نہیں سکتا کرنسی کیسے تبدیل ہو گئی ؟"
"شاید تم آسانی سے یقین نہ کرو۔ بنک پر ڈاکہ پڑا تھا" ضرغام نے جواب دیا اور اچانک اس کو محسوس ہوا جیسے دوسری طرف انسپکٹر شیکھر اچھل پڑا ہو۔
"ڈاکہ۔ کیسا ڈاکہ۔ کہیں بھنگ تو نہیں پی گئے ہو" انسپکٹر شیکھر نے کہا۔
"عجیب و غریب ڈاکہ۔ ڈاکو حیرت انگیز طور پر بنک میں داخل ہوتے اور اصلی کرنسی کی جگہ جعلی کرنسی رکھ کر اصلی کرنسی لے گئے"
"یہ ناممکن بات ہے، ڈاکے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیئے" انسپکٹر شیکھر نے کہا۔
"نہ مانو تمہاری مرضی" ضرغام نے جواب دیا "پھر اس صورت میں میری مہربانی ختم ہی سمجھو"
"لیکن میں انہیں چھوڑ کیسے سکتا ہوں" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔
"جیسے چھوڑتے ہیں۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا ان لوگوں کی نگرانی کرائی ہے" ضرغام نے جواب دیا۔
"اچھا چھوڑ دوں گا۔ لیکن تمہارا..." انسپکٹر شیکھر پوری بات بھی نہ کر پایا تھا کہ ضرغام نے کہا۔
"اسٹینو گرافر کے وعدے پر قائم رہوں گا" ضرغام نے ہنس کر جواب دیا اور پھر اسے بتایا کہ بنک میں کس طرح ڈاکہ پڑا ہوگا اور مجرم کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ جب ضرغام نے اس سلسلہ میں جولیانا کا نام لیا تو انسپکٹر شیکھر چونک پڑا۔ جولیانا کا نام اس نے بھی کہیں پڑھا تھا۔
"اچھی بات ہے" تمام تفصیلات سننے کے بعد انسپکٹر شیکھر نے کہا لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر یہ بات غلط نکلی تو میں تمہیں پاتال میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔ میرا نام شیکھر ہے۔ کسی گھمنڈ میں نہ رہنا"
"کسے پاتال میں بھی نہیں چھوڑو گے۔ دماغ تو ٹھیک ہے نا"۔ یہ دینا کی آواز تھی۔ ضرغام نے صاف طور پر دینا کی بات سنی اور وہ مسکرا کر رہ گیا۔
"تم خاموش رہو جی، یہ سرکاری کام ہے" انسپکٹر شیکھر نے اپنی بیوی سے کہا۔
"ہوگا سرکاری، لاؤ فون مجھے دو" دینا کی پھر آواز آئی۔ ضرغام خاموشی کے ساتھ دوسری طرف ان کے مکالموں کو سن رہا تھا۔ — اور مسکرا رہا تھا۔
ضرغام کو محسوس ہوا جیسے دینا نے خود شیکھر کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا ہے۔
"ہیلو۔ بھائی میں دینا ہوں"
"سن لیا تا اپنے پتی دیو کا بھاشن"
"ارے وہ تو یوں ہی بکتے رہتے ہیں۔ آپ تو یہ بتایئے کب آرہے ہیں ہمارے یہاں"
"واہ بہن واہ۔ بھائی کو پکڑوانا چاہتی ہو" ضرغام نے ہنس کر جواب دیا۔
"کس کی مجال ہے جو تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے" دینا

نے کہا۔ "سچ آپ کو دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ نہ جانے کیسے ہوں گے آپ؟"

"ڈر جاؤ گی۔ بڑا بھیانک ہوں۔ یقین نہ آئے تو شیکھر سے پوچھ لو" مرغام نے جواب دیا۔

"خیر جیسی بھی شکل ہے۔ ہمیں کو تو دکھا دو؟"

"وعدہ رہا۔ ایک بار تم سے ملوں گا ضرور" مرغام نے جواب دیا۔

"اپنی اصلی شکل میں ملو گے نا؟" شیکھر کی بیوی نے پوچھا۔

"یہ وعدہ کرنا مشکل ہے۔ ذرا اپنے شکھرے کو فون پہ بلا دیجئے۔"

دینا نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا "کیا شیکھر کو کہہ رہے ہو؟"

"ہاں" مرغام نے ہنس کر جواب دیا۔

"اچھی بات ہے۔ بلاتی ہوں۔ خدا حافظ" دینا نے کہا اور کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد دوسری طرف سے پھر دھاڑ سنائی دی۔

"اب کیا ہے؟" شیکھر بولا۔ اس کی آواز سے پتہ چلتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں نیند سے بھاری پن پیدا ہو چکا ہے۔

"سنو شکھرے۔ تمہارے افسروں کی ایک بڑی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ان اصلی نوٹوں کے چلن کو نہیں روکا جو جعلی نوٹوں سے تبدیل کئے گئے تھے۔"

"تو پھر اور کیا کرتے؟" شیکھر نے پوچھا۔

"ضرورت اس بات کی تھی کہ ان نوٹوں کے نمبروں کو مشتہر کر دیا جاتا اور عوام کو اطلاع دی جاتی کہ یہ نوٹ چوری ہو چکے ہیں اور ان کا چلانا جرم ہے۔ اگر کسی کے پاس یہ نوٹ ہوں تو اس کو چاہئے کہ وہ انہیں بنک پہنچ کر تبدیل کرائے۔"

"اس سے کیا ہوتا؟" شیکھر نے پھر پوچھا۔

"تم ایسا کرو پولیس کی نوکری سے استعفیٰ دے دو۔ بالکل بے وقوف ہو، ذرا سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔"

"تو نہیں سمجھا دو نا" شیکھر نے اس بار مرغام کے طنز کا برا نہیں مانا تھا۔

"بھلے آدمی سیدھی سی تو بات ہے" مرغام نے جواب دیا۔ "اس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ نوٹ کن لوگوں کے پاس زیادہ تعداد میں ہیں اور پھر یہ معلوم کرنے میں مدد ملتی کہ ان کا مجرموں سے کیا تعلق ہے اور زیادہ نوٹ ان کے پاس کہاں سے آئے۔"

"ان کے بیانات بھی وہی ہوتے جو دوسروں نے دیے ہیں، یعنی کوئی کہتا اسے اجرت ملی ہے اور کوئی کہتا اسے فلاں شخص نے نوٹ دیا تھا۔ یہ بات کیا ہوئی" شیکھر نے کہا۔

"نہیں۔ ضرور فرق نکلتا" مرغام نے جواب دیا۔

"آخر تم کیا سوچ رہے ہو؟" شیکھر نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے نوٹ مجرموں کے ذریعے براہ راست عام آدمی تک نہیں پہنچے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجرموں نے بڑی تیزی کے ساتھ چوری کے اصلی نوٹوں کو بازار میں پھینک دیا تھا اور ظاہر ہے اس کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔"

"وہ کیا؟" شیکھر نے پوچھا۔

"صرافہ میں سونے کی خریداری" مرغام نے جواب دیا۔

"اوہ، تو تم اس طرح سوچ رہے ہو" شیکھر نے کہا۔

"کیا غلط سوچ رہا ہوں" مرغام نے پوچھا۔

"نہیں" شیکھر نے جواب دیا "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ حالات کے اس پہلو پر میں نے اب تک غور نہیں کیا۔"

"بد صورت جو ٹھہرے" مرغام نے ہنس کر کہا

"بکواس بند کرو" شیکھر نے کہا۔ لیکن اب اس کے لہجہ میں جھلاہٹ نہیں تھی۔

"تو اس کا مطلب ہے مجرموں نے ایک تیر سے کئی شکار کئے ہیں" اس نے کہا۔

"بہت چالاک ہے وہ عورت" مرغام نے جواب دیا۔

"کون عورت؟" شیکھر نے پوچھا۔

"جوریانا اور کون۔ کہاں رہتے ہو" مرغام نے کہا۔

"اوہ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" شیکھر نے نحوست کے ساتھ کہا۔ بہر حال مجرموں نے بڑی ہوشیاری سے یہ چکر چلایا ہے۔ پچاس لاکھ بنک سے چوری ہوتے۔ پچاس لاکھ کے جعلی نوٹ تبدیل کرنے پڑے۔ ایک کروڑ ہو گیا۔"

"صرف ایک کروڑ" مرغام نے جواب دیا "اور یہ پچاس لاکھ کی چوری کی جو اصلی کرنسی بدلنی پڑے گی۔ پھر اگر اندازہ درست ہے تو پچاس لاکھ کا سونا بھی گیا۔ ہماری معیشت پر بڑی گہری چوٹ لگی ہے۔"

"تو پھر اب کیا کیا جاتے" شیکھر نے پوچھا۔

"چوری کے اصلی نوٹوں کو غیر قانونی قرار دلواؤ اور پھر ایک مہلت لوگوں کو دو کہ اگر ان کے پاس یہ نوٹ ہیں تو وہ بدل کرلے جائیں" مرغام نے کہا۔

"اچھی بات ہے" شیکھر نے جواب دیا "ہمیں اعلیٰ افسروں سے رابطہ قائم کرنا ہوگا۔"

"اور سنو" مرغام نے کہا "مجھے یقین ہے زیادہ نوٹ بنک میں لے کر آنے والے صراف ہوں گے۔ ان سے صرف یہ پوچھنا کہ سونا کس نے خریدا۔ ویسے وہ لوگ بے گناہ ہی نکلیں گے۔"

"بہت اچھا" شیکھر نے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا ضرغام نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

٭ ٭ ٭

زہرہ ہوٹل زمرد کے ہال میں جیسے ہی داخل ہوئی اس کی نگاہیں فلک قدر پر پڑیں جو ہال میں دائیں طرف کی ایک درمیانی میز پر بیٹھے ہوئے تھے ان کے ہمراہ مرغ بسمل بھی زہرہ کو دور ہی سے نظر آ گیا۔ دونوں کو دیکھتے ہی زہرہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ تیزی کے ساتھ ہال کو عبور کرتے ہوئے ان کی میز کے قریب پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔

"آداب عرض کرتی ہوں حضور والا" زہرہ نے نہایت ادب اور تعظیم کے ساتھ فلک قدر کو سلام کیا۔

"اوہو۔ بی زہرہ ہیں۔ آیئے آیئے تشریف رکھئے" فلک قدر نے چونکتے ہوئے زہرہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا "بہت دنوں کے بعد نظر آئیں"

زہرہ نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے مرغ بسمل پر نظر ڈالی اور مسکرا کر بولی۔

"شاید آپ بھی کافی دنوں میں تشریف لائے ہیں یہاں"

"کیوں مرغ بسمل" فلک قدر نے اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا ہم نے بہت دنوں میں قدم رنجہ فرمایا ہے یہاں"

"میں اپنے بارے میں عرض کروں یا آپ کے بارے میں" مرغ بسمل نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" فلک قدر نے پوچھا۔

"جہاں تک میرا تعلق ہے دوسری بار ہی یہاں آیا ہوں اور جہاں تک آپ کا تعلق ہے آپ جانیں" مرغ بسمل نے جواب دیا۔

"یعنی بخدا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں آپ کو یہاں پہلے کبھی لے کر نہیں آیا" فلک قدر نے پوچھا۔

"چھوڑیے اس بحث کو" زہرہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ فرمائیں مزاج گرامی کیسا ہے؟"

"معبود حقیقی کا احسان ہے۔ مرغ بسمل نے کام کا بار بہت ہلکا کر دیا ہے" فلک قدر نے کہا۔

"گویا اب راوی چین لکھتا ہے" زہرہ نے پوچھا۔

"جی نہیں" مرغ بسمل نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ "اب انہیں روپیہ وصول کرنے کی بے چینی لگی رہتی ہے"

"اوہ" زہرہ نے کہا "بھائی جان کہتے تو تھے کہ اب روزنامہ برق کی اشاعت اور آمدنی بڑھ گئی ہے۔ کسی روز تین ماہ کی واجب تنخواہ لینے جاؤں گا"

"ارے بھئی، اب تین ماہ کی تنخواہ کہاں رہ گئی ہے" فلک قدر نے جواب دیا۔ "وہ حضرت ایک ماہ سے قطعی غائب ہیں سو ایک ماہ تو ویسے ہی کم ہو گیا"

"بجا فرماتے ہیں" زہرہ نے جواب دیا "آپ ایک ماہ کی تنخواہ یوں وضع کر لیجئے اور ایک ماہ کی تنخواہ غیر حاضری کے لئے جرمانہ وصول کر لیجئے۔ رہا باقی ایک ماہ تو اس کی آسان قسطیں ہو جائیں گی"

"واللہ کیا فرمایا ہے، آپ نے" فلک قدر نے جھینپتے ہوئے کہا "میں اور ضرغام کی تنخواہ کاٹوں گا۔ ناممکن۔ کیوں مرغ بسمل صاحب ٹھیک ہے نا"

"معلوم نہیں جناب آپ کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں جہاں تک میرا تعلق ہے میں تو تین ماہ کی تنخواہ لے کر بھی مطمئن نہیں ہوتا"

"کیا خوب۔ ماشاءاللہ" فلک قدر نے طنز کیا "صاحب ذرا اہل قلم کیا بنے کہ تیر بھی چھوڑنے لگے" "معاف کیجئے گا۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا" مرغ بسمل نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا مطلب تھا جناب کا؟" فلک قدر نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں تھا" زہرہ نے درمیان میں ٹوکا "ویسے یہ بات تو ہے جناب کہ ہر اہل قلم بھوکا ہی رہتا ہے۔ مقروض رہتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ ایڈوانس اور قرض میں کوئی فرق نہیں ہے"

"غلط میں کہاں بھوکا مرتا ہوں"

"حضرت میں نے بات ادیبوں، شاعروں اور کہانی کاروں کے بارے میں کہی تھی" زہرہ نے کہا "آپ تو ماشاءاللہ مالک ہیں مالک، صاحب قلم آپ تو خدانہ کرے۔ ہوں"

"شکریہ" فلک قدر نے زہرہ کو نگاہ تحسین دیکھتے ہوئے کہا "کیا لیں گی آپ؟"

زہرہ ابھی جواب نہ دینے پائی تھی کہ ویٹر لڑکی نے فلک قدر کے آرڈر کا سامان لا کر میز پہ رکھ دیا۔

کافی کی کیتلی دو پیالیاں اور کچھ نمکین بسکٹ۔

زہرہ نے ویٹر لڑکی کے چلے جانے کے بعد میز پر ایک بار پھر نگاہ ڈالی اور بولی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے فلک قدر صاحب"

"میری طبیعت" فلک قدر نے حیرت سے زہرہ کو دیکھتے ہوئے کہا "یہ کیوں پوچھا ہے آپ نے، کیا خدانخواستہ میں کچھ علیل نظر آتا ہوں"

"بظاہر تو نہیں" زہرہ نے جواب دیا "لیکن خیر چھوڑیئے"

"نہیں نہیں بتایئے، آپ کو قسم ہے میں آپ کو کیسا لگتا ہوں" فلک قدر نے پوچھا۔

"کیسا لگتا ہوں کیا مطلب" زہرہ نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے اُلٹا سوال کر دیا۔

فلک قدر نے گھبرا کر کہا "میرا مطلب تھا کہ میں علیل دکھائی دیتا ہوں۔"

"خدا نہ کرے" زہرہ نے جواب دیا۔

زہرہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ مرغ بسمل کا باریک قہقہہ فضا میں اس طرح گونجا کہ اردگرد کے لوگ چونک اٹھے اور حیرت کے ساتھ اسے دیکھنے لگے۔

"مگر وہ آپ نے میری طبیعت کے بارے میں کچھ شک ظاہر کیا تھا" فلک قدر نے کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ میز کو دیکھ کر یہ خیال آیا کہ کہیں آپ کی طبیعت تو خراب نہیں ہے کیونکہ آپ کھانے پینے کے معاملے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ میں نے ہمیشہ آپ کی میز کو مطلوبہ اشیاء سے بھرا ہوا دیکھا ہے۔"

"اوہ یہ بات ہے" فلک قدر نے گہرا سانس لیا۔

"میں سمجھ گئی۔ غالباً آپ مرغ بسمل کے سامنے کچھ اور منگانا نہ چاہتے ہوں گے۔"

"لاحول ولا قوۃ" فلک قدر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ کو میرا انتظار رہا ہوگا" زہرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ آپ کہہ سکتی ہیں مگر کیا کھایا آپ نے؟"

زہرہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی ویٹر لڑکی کو اشارہ کیا جو اس وقت قریب سے گزر رہی تھی۔

"ایک پلیٹ چکن پکوڑا، ایک جوس پیسٹری، اور وہ بادام کا حلوہ بھی لاؤ" زہرہ نے ویٹر لڑکی سے کہا جو میز پر آ کھڑی ہوئی تھی۔

"ابھی لیجئے مادام۔ کچھ اور بھی حاضر کروں؟"

"کیا کچھ اور بھی یہاں ملتا ہے؟" زہرہ نے پوچھا۔

ویٹر لڑکی نے جھینپ کر کہا "میرا مطلب تھا ان کے علاوہ بھی اور کوئی چیز؟"

"اوہ میں کچھ اور سمجھی تھی۔ تو پھر ایسا کرو اگر مچھلی کے کباب بھی مل سکیں تو لے آنا۔"

"ضرور لیں گے مادام" ویٹر لڑکی نے کہا اور آرڈر لیکر چلی گئی۔

اس دوران فلک قدر زہرہ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے البتہ مرغ بسمل کے چہرے پر طمانیت کی لہر دوڑ گئی تھی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں" زہرہ نے فلک قدر سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" فلک قدر نے عجلت سے جواب دیا "میں تو اس بات پر حیران تھا کہ کھانے پینے کے معاملے میں آپ کا ذوق کتنا بلند ہے۔"

"اصل میں مرزا غلام بھائی نے آپ سے بہت کچھ سیکھا ہے اور میں ان سے سیکھ رہی ہوں" زہرہ نے جواب دیا۔

"بے شک یہی بات ہوگی" فلک قدر نے تن کر جواب دیا اور مرغ بسمل کی طرف فاتحانہ نگاہوں سے دیکھا جو زہرہ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"کیا کوئی نظم کہہ رہے ہیں" زہرہ نے مرغ بسمل سے کہا جو اس کو تکے جا رہا تھا۔

"جی۔ جی نہیں" مرغ بسمل بڑبڑا گیا "کیا آپ کو شاعری کا ذوق بھی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں نہیں" زہرہ نے جواب دیا۔

"تو عرض ہے۔ سماعت فرمائیے۔"

"جی۔ ارشاد۔ جب تک کھانے پینے کا سامان آئے، یہی سہی" زہرہ نے کہا

عرض کرتا ہوں۔

کہنے کو دہن پان ہوتا ہے　　حسن لیکن پٹھان ہوتا ہے

"ارے واہ۔ سبحان اللہ" زہرہ نے ہاتھ پھیلا کر داد دی۔ "ماشاءاللہ کیا زور بیان ہے۔"

"تسلیمات" مرغ بسمل نے داد وصول کی اور کہا "شعر ملاحظہ فرمائیے۔"

رنگ آتا ہے ہر جوانی پر　　بچہ ہر اک جوان ہوتا ہے

"بہت خوب۔ میاں خوب کہتے ہو" اس بار فلک قدر نے داد دی۔ "وہ کیا بات ہے" بچہ ہر اک جوان ہوتا ہے۔"

"اور حضرت یہ شعر آپ کی نظر ہے" مرغ بسمل نے آداب کرتے ہوئے فلک قدر کو مخاطب کیا۔

خوب تر ہے یہ آدمی لیکن　　ہاں مگر بے ایمان ہوتا ہے

"کیا مطلب۔ یہاں یہ شعر میری نذر کیا معنی" فلک قدر نے غصے میں کہا۔

"چھوڑیئے بھی۔ یہ تو ادب ہے۔ اس کا زندگی سے کیا تعلق" زہرہ نے ٹوکا "ہاں مرغ بسمل صاحب آگے ارشاد فرمائیں۔ واللہ خوب کہتے ہیں آپ۔"

"سماعت فرمائیے۔"

بھونکتا ہے گلی میں جو کتا　　وہ بھی اہل زبان ہوتا ہے

"واہ بہت خوب۔" اس بار زہرہ اور فلک قدر نے مل کر داد دی "بے شک کتے کی زبان سمجھنا مشکل ہے۔"

زہرہ نے داد دی: "واللہ لطف آگیا۔ خوب پالا ہے آپ نے فلک قدر صاحب"۔

"ایک دوسری غزل ملاحظہ فرمائیں۔" مرغ بسمل نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی نہیں جناب۔" زہرہ نے جواب دیا دراصل اس نے ویٹر لڑکی کو دیکھ لیا تھا جو دونوں ہاتھوں میں بھری ٹرے لے کر ان کی میز کی طرف آرہی تھی۔

"آپ سماعت فرمایئے تو واللہ لطف آجائے گا۔" مرغ بسمل نے اصرار کیا۔

"پہلے کھانا پھر بجانا حضرت۔" زہرہ نے کہا "بھوکے پیٹ شعروشاعری کچھ اچھی نہیں لگتی۔"

"حالانکہ شاعری بھوکے پیٹ ہی ہوتی ہے۔" مرغ بسمل نے جواب دیا۔

اس دوران ویٹر لڑکی میز کو پلیٹوں سے سجا چکی تھی۔

زہرہ اب کھانے پر جیسے ٹوٹ پڑی تھی۔ لیکن ابھی اس نے ایک چمچ بھر کر ہی کھایا تھا کہ اس کی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی چبھنے لگی وہ چونک پڑی۔

"آئی ایم سوری جناب۔ ابھی حاضر ہوتی ہوں۔" زہرہ نے فلک قدر سے کہا اور تیزی کے ساتھ اٹھ کر باتھ روم کی طرف چل پڑی۔

* * *

اچانک زہرہ کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ضرب شدید تھی۔ اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا اور نیچے گر پڑی۔ اب وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد اس کو ہوش آیا اور اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا تو تاریکی میں اس کو کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ایک آہ کھینچ کر پھر اس نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا۔ دراصل بیٹھتے بیٹھتے اس کے سر میں پھر دھماکے ہونے لگے تھے۔ زہرہ نے سر پر اس جگہ ہاتھ رکھا۔ جہاں ٹیس ہو رہی تھی اس نے محسوس کیا کہ سر کا ایک حصہ ہے اور شاید کھال پھٹ گئی ہے۔ کیوں کہ اس کو اپنی انگلیوں میں کچھ گیلا پن محسوس ہوا تھا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔ یہاں تک چند فٹ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد دیوار سے ٹکرا گئی۔ اب وہ دیوار کے سہارے سہارے چاروں طرف گھوم گئی اور ایک دروازے کے سامنے آگئی۔ دروازے میں کواڑ عجیب ساخت کے تھے۔ باہر کی ذرا بھی روشنی اندر نہیں آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کواڑوں کی جھریوں کو بند کر دیا گیا ہے۔ اس نے کواڑوں کو پوری طرح ٹٹول کر دیکھا اور اس کا ہاتھ زنجیر پر آکر ٹھہر گیا۔ زہرہ نے زنجیر پکڑ کر کواڑوں کو ہلانے کی کوشش کی۔ اس خیال سے کہ شاید دروازہ کھلا ہو۔ لیکن وہ جنبش بھی نہیں کر سکے۔ کواڑ باہر سے بند تھے۔ زہرہ مایوس ہو کر دروازے کے ساتھ ہی دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔

اب اس کے سر میں تکلیف کم تھی اور وہ کچھ سوچ سکتی تھی اسے یاد آیا کہ زیڈ فور کی اطلاع پر وہ اس بوڑھی عورت کے فلیٹ پر پہنچی تھی جہاں نگرانی کے لئے زیڈ فور کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ وہاں پہنچنے پر زیڈ فور نے اس کو بتایا تھا کہ اندر پانچ آدمی گئے ہیں، وہ بڑی احتیاط کے ساتھ وہاں پہنچے ہیں۔ وہ ان پانچوں کے چہروں کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ لیکن اس نے بتایا کہ دروازہ کھولنے والا بھی کوئی مرد ہی تھا۔ وہ بوڑھی عورت نہیں تھی۔ زیڈ فور یہ نہیں بتا سکا کہ وہ چھٹا آدمی کس وقت اس بوڑھی عورت کے فلیٹ میں پہنچا۔ زہرہ نے سوچا کہ شاید وہ پہلے ہی سے فلیٹ کے اندر رہا ہو۔ زیڈ فور نے اس کو بتایا کہ دروازہ کھولنے اور ان پانچوں کے اندر جانے کا انداز بڑا مشتبہ تھا اور وہ سب ایک ایک کر کے آئے تھے ایک ساتھ نہیں۔

زہرہ کو یاد آیا کہ زیڈ فور سے یہ تمام باتیں سننے کے بعد وہ فلیٹ کے گرد چکر لگاتی ہوئی اس کے دائیں طرف پہنچی جہاں غالباً صحن تھا۔ کیونکہ اس حصہ میں فلیٹ کی دیوار نسبتاً بلند تھی۔ زہرہ کو یہی جگہ فلیٹ میں اندر داخل ہونے کے لئے سب سے بہتر معلوم ہوئی۔ ابھی وہ دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف اتر جانے کا منصوبہ بنا ہی رہی تھی کہ اچانک اس کو اپنا گلا گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ ہوا یوں کہ زیڈ تھری جو رنجیت کا تعاقب کرتے ہوتے وہاں پہنچا تھا اور زہرہ کو دشمن کا آدمی سمجھ کر اچانک اس پر حملہ آور ہو گیا تھا۔ زہرہ کو اس اچانک افتاد پر ایک لمحہ کے لئے حیرانی ضرور ہوئی۔ لیکن پھر اس نے کمر کو جھکا کر پلٹا کھایا اور خود حملہ آور کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جیب سے اپنی مختصر سی ٹارچ نکال کر جلائی اور پھر چونک کر اپنا پاؤں ہٹا لیا۔ کیوں کہ حملہ آور زیڈ تھری کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے بھی زہرہ کو پہچان لیا اور خفت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں بھی تو کہوں اس قدر پھرتی کے ساتھ مجھے زیر کرنے والا آخر کون ہو سکتا ہے۔" اس نے ہنس کر زہرہ کو دیکھا۔

زہرہ کو یہ باتیں بڑی تفصیل کے ساتھ یاد آرہی تھیں۔ اس کو زیڈ تھری نے رنجیت کے تعاقب کی پوری تفصیل بتائی اور یہ بھی بتایا کہ زیڈ فور کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا ہے اور زیڈ فور کے مشورہ پر ہی فلیٹ کے اس طرف پہنچ کر نگرانی کر رہا تھا۔

زہرہ کے لئے اب دیوار پر چڑھنا آسان ہو گیا۔ کیونکہ اب وہ آسانی کے ساتھ زیڈ تھری کی مدد سے کر دیوار پر چڑھ سکتی تھی حالانکہ

زیڈ تھری نے اس بات کی ضد کی کہ وہ خود دیوار پر چڑھ کر اندر جانے کے لئے تیار ہے۔ لیکن زہرہ نے اس کی تجویز کو رد کر دیا تھا۔

بالآخر کچھ دیر کی بحث کے بعد زیڈ تھری دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر آپس میں جوڑ لئے۔ زہرہ نے اپنا پاؤں زیڈ تھری کے دونوں ہاتھوں پر رکھا اور اُچک کر دیوار پکڑ لی۔ ایک لمحہ اس نے اندرونی حصہ پر نگاہ ڈالی۔ وہ ایک مختصر سا صحن تھا جہاں کافی تعداد میں پودے لگے ہوئے تھے۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ صحن میں کوئی نہیں ہے۔ زہرہ دیوار پر دونوں ہاتھ رکھ کر اُچھلی اور دیوار پر چڑھ گئی اور پھر بہت آسانی کے ساتھ دیوار کے دوسری طرف صحن میں اتر گئی۔

زہرہ یہ تمام باتیں یاد کرتے کرتے ایک لمحہ کے لئے رکی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے دروازے پر کوئی آیا ہو۔ لیکن یہ اس کا محض ایک واہمہ تھا۔

اسے یاد آیا کہ جب وہ فلیٹ میں پہنچنے کے بعد ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لگی اندر جھانک رہی تھی تو اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اندر کا پورا منظر اس کے ذہن میں ابھر آیا اور سنبھالے کیوں وہ اپنے آپ شرما گئی۔ اندر کا منظر تھا ہی کچھ ایسا۔ پانچ افراد ایک قطار میں لگی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک حسین ترین عورت جو دیکھنے میں بھی کم عمر لگتی تھی، غصے سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ وہ جینٹ اور قمیض پہنے ہوئی تھی اور قمیض کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے۔ شاید قمیض کے اندر کوئی اور کپڑا نہیں تھا۔ کیونکہ اس کے شباب کی تمام رعنائیاں باہر جھانک رہی تھیں اور وہ پانچوں بڑی حریص نگاہوں سے اس کے سینے کو تک رہے تھے۔ اس کے کولھوں کا ابھار بھی کچھ کم قیامت خیز نظر نہیں آ رہا تھا۔ زہرہ اس منظر کے بارے میں سوچ کر شرم سے سرخ ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہاں اس کو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے اس کے لبوں پر مسکراہٹ بھی رقصاں ہو گئی ہو۔

کچھ دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ایک خیال اس کے ذہن میں آ گیا۔ اس نے دیوار کو پھر ٹٹولنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیوار پر اس طرح پھیر رہی تھی جیسے صفائی کر رہی ہو۔ بالآخر اس کا ہاتھ ایک سوئچ پر جا پڑا۔ اس نے سوئچ کو دبا دیا۔ اچانک روشنی ہو گئی۔

وہ ایک مختصر سا کمرہ تھا۔ زہرہ نے اس کمرے پر بھرپور نگاہ ڈالی نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشن دان اور کوئی الماری۔ البتہ بالکل درمیان میں ایک چھوٹی سی میز کے گرد دو آرام کرسیاں ضرور پڑی ہوئی تھیں زہرہ ان میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ اب وہ زیڈ فور کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

زہرہ نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ گھڑی اس کی کلائی میں چبھنے لگی۔ اس نے گھڑی کی چابی باہر کی طرف کھینچ لی۔

"ہیلو۔ زیڈ ٹو دس سائیڈ۔"

"ہیلو۔ میں زیڈ فور بول رہا ہوں۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟"

"فی الحال تو ہوں۔" زہرہ نے جواب دیا۔ "میں خود تمہیں کال کرنے والی تھی۔"

"میں نے یہ تیسری بار آپ کو کال کی ہے۔" زیڈ فور نے کہا "مجھے زیڈ تھری نے اطلاع دی تھی۔ کہ آپ فلیٹ کے اندر داخل ہو گئی ہیں۔ جب کافی دیر تک آپ باہر واپس نہیں پہنچیں تو زیڈ تھری نے مجھے اس بارے میں اطلاع دی۔ اس کے بعد میں نے پہلی بار آپ کو ٹرانسمیٹر پر کال کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔"

"ملتا کیسے۔ اس وقت میں بے ہوش رہی ہوں گی۔"

"کیا مطلب" زیڈ فور نے بڑے کرب کے ساتھ پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میں اس وقت تاریک کمرے میں بیہوش تھی۔"

اور پھر زہرہ نے زیڈ فور کو فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد کی پوری تفصیلات بتائیں اور وہاں خوش قسمتی سے مجھے سوئچ مل گیا اور اب کمرہ روشن ہے اور میں ایک آرام چیئر پر بیٹھی ہوں۔ دروازہ بند ہے اور کوئی ابھی تک اس کمرے میں نہیں آیا ہے۔"

"اوہ آپ کے سر میں زیادہ تکلیف تو نہیں ہے؟"

"تم فضول وقت ضائع کر رہے ہو۔ ادھر نہ معلوم وہ لوگ کیا میٹنگ کر رہے ہوں گے۔"

"میں دراصل زیلیرون کا انتظار کر رہا ہوں۔" زیڈ فور نے جواب دیا۔

"کیا تم نے انہیں اطلاع دی ہے۔" زہرہ نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ جب آپ دیر تک واپس نہ آئیں اور نہ آپ سے دو بار کوشش کے باوجود کوئی رابطہ قائم نہ ہو سکا تو میں نے فلیٹ میں پانچ افراد کے پہنچنے پر آپ کے بارے میں اطلاع کرنے اور آپ کے فلیٹ کے اندر داخل ہونے کے بارے میں تمام تفصیل سے باخبر کر دیا تھا۔ بس اب پہنچنے والے ہوں گے۔ تیسری بار اب کوشش کی تو آپ سے رابطہ قائم ہو سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ ٹھیک ہیں۔"

"ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ بوڑھی عورت وہی خوشحال حسینہ تھی جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔" زیڈ فور نے جواب دیا۔ "بہرحال ہم اطمینان کے ساتھ کارروائی کر سکیں گے۔"

"بھائی جان نے اور کچھ کہا" زہرہ نے پوچھا "اس کا

خیال تھا کہ شاید فلیٹ میں اس طرح اس کے داخل ہونے پر ضرغام نے ناراضگی ظاہر کی ہو۔

"جی نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں پھر آپ سے رابطہ قائم کروں اور اگر یہ محسوس کروں کہ آپ کو کوئی خطرہ ہے تو فوری طور پر کوئی کارروائی کر ڈالوں اور ان کے پہنچنے کا انتظار نہ کروں۔ لیجیے وہ بھی آ گئے ہیں۔ اچھا میں اب ٹرانسمیٹر آف کر رہا ہوں۔"

زبیدہ نے بات ختم کرتے ہی ٹرانسمیٹر بند کر دیا تھا وہ پھر کرسی پر آ بیٹھی اور آنکھیں بند کر کے غور و فکر میں ڈوب گئی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ اس کا بھائی سب کچھ سن کر کس قدر پریشان ہوا ہوگا۔ زہرہ کو یہ سوچ کر اپنے بھائی پر پیار آ گیا اور وہ مسکرا پڑی۔

اور میں بھی تو انہیں ہمیشہ اسی طرح پریشان کرتی رہتی ہوں۔ اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور انگڑائی لے کر سر کرسی پر ٹکا دیا۔

٭ ٭ ٭

ضرغام نے فلیٹ کے قریب پہنچکر اوپر کو دیکھا۔ چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ یہ ایک یک منزلہ فلیٹ تھا اور دوسرے فلیٹس کے مقابلہ میں زیادہ الگ تھلگ تھا۔ زیڈ فور زیڈ تھری اس کے قریب پہنچکر خاموش کھڑے ہو گئے تھے اور اس کے حکم کے منتظر تھے۔ ضرغام اس وقت سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ایک ہیولہ بنا ہوا تھا۔ فلیٹ تک کا سفر اس نے اپنی مخصوص اسپورٹس کار میں کیا تھا جو کار کم تھی اور ایک قلعہ زیادہ۔ اسپورٹس کار کو اس نے فلیٹ سے کچھ فاصلہ پر روک دیا تھا اور کار سے باہر آتے ہی زیڈ فور اور زیڈ تھری کے لئے روشنی کا ایک مخصوص سگنل دیا تھا۔ اسی سگنل کا نتیجہ تھا کہ یہ دونوں ضرغام کے قریب پہنچکر اس کے حکم کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔

دراصل زیڈ فور کی اس اطلاع پر کہ زہرہ فلیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم نہیں ہو سکا ہے ضرغام بے چین ہو گیا تھا۔ زہرہ کو اس نے بار بار ہدایت کی تھی کہ وہ زیادہ ایڈونچر نہ کیا کرے۔ لیکن تھی وہ ضرغام کی بہن۔ خطرے میں کود پڑنا اس کی طبیعت بن چکا تھا۔ ضرغام کے ساتھ اسپورٹس کار میں ظہیر بھی وہاں پہنچا تھا۔ ضرغام نے ظہیر کو ہدایت کی کہ وہ فلیٹ کے دروازے کی نگرانی کرے اگر مجرم فرار ہونے کی کوشش کریں تو انہیں ہر قیمت پر روکے خواہ اس کے لئے ریوالور کا استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ظہیر جو کہ تھری زیڈ کے ہیڈ کوارٹر میں رہتا تھا۔ اور ضرغام کی ڈمی کے طور پر زیڈون کی ذمہ داری پوری کیا کرتا تھا اسے جانتے تو سبھی تھے لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ضرغام یعنی زیڈون کی ڈمی بھی ہے۔ یہاں تک کہ زیڈ فور اور زیڈ تھری بھی اس راز سے واقف نہیں تھے جو ضرغام کے انتہائی معتمد تھے اور اس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ تھری زیڈ تنظیم کے دوسرے ممبروں کا اس راز سے واقف ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ضرغام نے چھت کی بلندی کا اندازہ کرنے کے بعد اپنی سیاہ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک ریشمی رسی کا گولا نکالا۔ پھر اس نے اس رسی کے سرے پر ایک کانٹا باندھا اور ہاتھ سے پوری قوت کے ساتھ گھماتے ہوئے اوپر پھینک دیا۔ پہلی ہی کوشش میں ریشمی ڈوری کا کانٹا دیوار کی اینٹوں میں جا کر پھنس گیا۔ یہ کمال ضرغام ہی کو حاصل تھا۔ اس کی اس طرح کی کوئی کوشش بھی اب تک ناکام نہیں ہوئی تھی۔ کانٹے کے اوپر پھنس جانے کے بعد اس نے رسی کو پوری طاقت کے ساتھ کئی جھٹکے دیئے اور یہ اندازہ کرنے کے بعد کہ اب انتہائی وزن کے سبب کانٹا اپنی جگہ نہیں چھوڑے گا۔ اس نے زیڈ فور اور زیڈ تھری کو اشارہ کیا۔

دونوں ضرغام کے اشاروں کی زبان سے واقف تھے اگرچہ پتلی سی رسی کے ذریعے بلندی پر چڑھنا مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن تھری زیڈ کے سبھی ممبروں کو اس کی مہارت حاصل تھی۔ اس مہارت کا نتیجہ تھا کہ زیڈ فور اور زیڈ تھری دونوں یکے بعد دیگرے بڑی پھرتی کے ساتھ فلیٹ کی چھت پر پہنچ گئے۔ دونوں کے اوپر پہنچنے کے بعد ضرغام نے ادھر ادھر دیکھا اور خود بھی بندر جیسی پھرتی کے ساتھ اوپر چڑھنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دیوار نہ ہو بلکہ ہموار زمین ہو جس پر جسم پھسلتا جا رہا ہے۔

چھت پر پہنچتے ہی ضرغام کی نگاہ چھت کے درمیانی حصہ میں بنے ہوئے روشندان پر پڑی جو کافی بڑا اور برجی نما تھا اور جس میں بڑے بڑے سے شیشے لگے ہوئے تھے۔ روشن دان کو دیکھتے ہی ضرغام کی آنکھوں میں چمک آ گئی ورنہ وہ توڑنے کے ذریعے فلیٹ کے اندر جانے کے لئے چھت پر چڑھا تھا۔ ضرغام تیزی کے ساتھ روشن دان کے پاس پہنچ گیا۔ زیڈ فور اور زیڈ تھری بھی اس کے ساتھ تھے۔

جیسے ہی ضرغام نے روشندان کے شیشے سے سر لگا کر اندر جھانکا اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ روشندان کے نیچے ڈرائنگ روم تھا اور اس میں وہ لڑکی جس کو وہ پہلے ہوٹل زمرد میں دیکھ چکا تھا۔ اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ موجود تھی۔ ضرغام نے ان میں سے چار کو تو پہچان لیا کہ ان لوگوں نے تار رحام تک اس کا تعاقب کیا تھا لیکن وہ پانچویں آدمی کو نہ پہچان سکا۔ اس نے روشندان سے نگاہ ہٹا کر زیڈ فور اور زیڈ تھری کو دیکھا اور بولا۔

"تم لوگ زینے کے ذریعے نیچے پہنچو اور میرے اشارے کا انتظار کرو۔ اپنے ٹرانسمیٹر آن رکھنا تاکہ میں ضرورت کے وقت جو کہوں اس کو سن سکو اور پھر احتیاط کے ساتھ نیچے جانا۔ میرا خیال ہے کہ باہر صحن کے کسی حصے میں کوئی اور آدمی بھی ہونا چاہیے۔ وہ آدمی جس نے زہرہ پر حملہ کیا ہوگا۔"

"یس سر۔" زیڈ فور اور زیڈ تھری نے ایک ساتھ جواب دیا اور وہ آہستہ قدمی کے ساتھ زینے کی طرف بڑھ گئے۔

ضرغام نے پھر آنکھیں روشن دان کے شیشے کے ساتھ لگا دیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے شیشے کو ذرا سا اٹھا کر ڈکٹیفون ٹرانسمیٹر اندر کی طرف لٹکا دیا تاکہ اندر ہونے والی گفتگو کو سن سکے۔

"تو یہ جولیانا ہے۔" ضرغام نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ شبہ تو اسے ابتداء ہی سے تھا لیکن ڈکٹیفون ٹرانسمیٹر کو اندر لٹکاتے ہی اس نے جو پہلا جملہ سنا وہ یہ تھا۔

"تمہیں معلوم ہے جولیانا خون خرابہ کو پسند نہیں کرتی۔"

ضرغام نے دیکھا وہ قمیض اور پتلون میں واقعی ایک قیامت معلوم ہو رہی تھی۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ گلے کے بٹن کھلے ہوئے۔

جولیانا کی پیشانی پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنا ایک پاؤں کرسی پر رکھا ہوا تھا اور سینہ تان کر کھڑی ہوئی تھی۔ ضرغام نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ریوالور نما کوئی شے ہے لیکن وہ اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ اس کی آنکھیں اندر کا منظر دیکھنے میں اور اس کے کان اندر ہونے والی گفتگو کو سننے میں لگے ہوئے تھے۔

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی خود بخود چل کر یہاں آ گئی ہوگی۔ اور اس نے تم میں سے کسی کا تعاقب نہ کیا ہوگا۔"

"یقین کیجئے میڈم۔ ہم پوری احتیاط کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ کسی کے تعاقب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" پانچوں نے بیک آواز کہا۔

"کیا اسے غیب سے پتہ چل گیا کہ اس فلیٹ میں کچھ ہے اور لوگ یہاں آنے والے۔" جولیانا نے جھڑک کر کہا۔

"ہم خود حیران ہیں میڈم۔" اس بار تنہا جکیب نے جواب دیا۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ ہم لوگ اس معاملہ میں کتنی احتیاط برتنے کے عادی ہیں۔"

"وہ احتیاط بھی میں نے دیکھی ہے۔" جولیانا نے جواب دیا۔ "تمہاری احتیاط ہی کا تو نتیجہ ہے کہ رنجیت کے فلیٹ کی نگرانی شروع ہو گئی۔ میرے اور اس کے فلیٹوں میں ڈکٹیفون ٹرانسمیٹر پڑے ہوئے پائے گئے۔ وہ تو خود میں بہت محتاط ہوں ورنہ اب تک ان ٹرانسمیٹروں کے ذریعے پولیس کو کیا کچھ معلوم نہ ہو گیا ہوتا۔"

ضرغام یہ جملہ سن کر حیرت سے اچھل پڑا۔ اسے خود بڑی حیرانی تھی کہ دونوں فلیٹوں میں اس کے ماتحتوں نے ڈکٹیفون ٹرانسمیٹر چھپائے ہوئے تھے اور ان کے ذریعے کوئی پیغام بھی تھری زیڈ کے ہیڈ کوارٹر میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ کیا بیتی۔ اس معاملے میں وہ جولیانا کی چالاکی کا قائل ہو گیا۔

"لیکن میڈم ہوٹل زمرد میں اس آدمی کی نگرانی کا حکم آپ ہی نے تو دیا تھا۔" جکیب نے کہا۔

"صرف نگرانی کا نا۔" جولیانا دھاڑی۔ "یہ تو نہیں کہا تھا کہ تم اس کا تعاقب کرتے ہوئے تاج محل جا پہنچو اور پھر اس کو اپنے پیچھے لگا لاؤ۔"

"مگر وہ کمبخت تھا بڑا چالاک، ہم خود حیران ہیں کہ وہ تاج محل میں داخل ہوتے ہی غائب کہاں ہو گیا۔ ہم نے تو اس پر پوری نگاہ رکھی تھی۔"

"خاموش رہو۔" جولیانا نے جھڑکا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس حلک میں آنے کے بعد تم بھی ناکارہ ہو گئے ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بالکل اسی طرح تمہارے فلیٹ کی نگرانی بھی نہ کی جاتی ہو۔"

"نہیں میڈم ایسا نہیں ہے۔" جکیب نے پھر کہا۔ دوسرے چاروں افراد اب تک خاموش تھے۔

"رنجیت کے فلیٹ کے علاوہ اور کسی فلیٹ کی نگرانی نہیں کی گئی ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔" جولیانا نے غصے سے پوچھا۔ غصے میں اس وقت وہ بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔

"ہم نے احتیاطاً خود ایک دوسرے کے فلیٹ کی باری باری نگرانی کی ہے۔" جکیب نے جواب دیا۔

"تو پھر یہ لڑکی اس فلیٹ میں کیسے پہنچی۔" جولیانا نے پوچھا۔

"ہم خود حیران ہیں میڈم۔" اس بار رنجیت بولا۔

"تم کیا کہہ سکتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے فلیٹ کی نگرانی کرنے والا تمہارے تعاقب میں نہیں آیا ہوگا۔ تمہیں تو چاہیے تھا کہ یہاں آنے کے لیے دن میں ہی کسی وقت اپنے فلیٹ سے نکل جاتے۔"

"لیکن میڈم۔" جکیب درمیان میں بولا۔ "رنجیت کا تعاقب بھی کسی نے نہیں کیا۔ میں خود اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں آیا ہوں۔"

"بہت خوب۔" جولیانا نے طنز کیا۔ "اس کا مطلب ہے اگر کسی نے تعاقب کیا ہوگا تو ان کی نگاہ میں تم بھی آ گئے ہوگے۔ ہے نا۔"

جکیب خاموش ہو گیا۔ اس کی نگاہوں سے الجھن صاف طور پر مترشح تھی۔

"ابھی تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ آدمی جس کا تم لوگوں نے

تار جام تک تعاقب کیا۔ کون ہے آیا پولیس کا کوئی آدمی ہے یا کسی گروہ کا سرغنہ؟" جولیانا نے کہا۔

"اس لڑکی سے بھی کچھ پوچھا جا سکتا ہے میڈم۔" رنجیت بولا۔

"وہ تو کیا ہی جائے گا" جولیانا نے جواب دیا۔ لیکن ہم یہ کام بعد میں کریں گے۔ مجھے افسوس ہے اس ملک میں آنے کے بعد مجھے خون خرابے سے بھی کام لینا پڑا۔ اس بے وقوف نوجوان کو قتل کرانا پڑا۔ جو مجھ سے بھڑ گیا تھا اور اب یہ لڑکی....."

یہ کہتے کہتے جولیانا خاموش ہو گئی جیسے کوئی بات سوچنے لگی ہو۔ وہ پانچوں آدمی خاموشی کے ساتھ اس کے چہرے کو تک رہے تھے۔ ان میں سے صرف جیکب کی نگاہیں کبھی کبھی جولیانا کے اُبلتے ہوئے شباب سے ٹکراتی تھیں۔

غالباً جولیانا نے جیکب کی نگاہوں کی گرمی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ مسکرائی اور جیکب کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے تمہاری خدمات کا ہمیشہ اچھا صلہ دیا ہے نا؟"

"یس میڈم۔" جیکب نے جواب دیا۔ "میں آپ کا صرف ایک غلام ہوں۔"

"لیکن تمہاری کارکردگی غیر اطمینان بخش رہی ہے۔" جولیانا نے جواب دیا۔

"مجھے افسوس ہے میڈم۔ آپ ایسا خیال کرتی ہیں۔" جیکب نے اداس ہو کر جواب دیا۔

"تم نہیں سمجھتے کہ اس ملک میں میری یہ مہم جو دیکھنے میں بہت سیدھی سادھی اور آسان لگتی ہے۔ کتنی اہم ہے اور اس سے تم لوگوں کو کتنا فائدہ پہنچنے والا ہے۔" جولیانا بڑبڑائی۔

"میڈم عظیم ہیں۔" جیکب نے جواب دیا "ہم تو بس اتنا ہی جانتے ہیں اور یہ کافی ہے۔"

جولیانا قدرے مسکرائی۔ اس نے جیکب اور دوسرے لوگوں پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور بولی۔

"پولیس یہ معلوم نہیں کر سکی کہ اسٹیٹ بنک میں ڈاکہ کس طرح پڑا۔ وہ معلوم بھی نہیں کر سکتی کیونکہ معلومات کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے چوکیدار۔ لیکن چوکیدار سو جنم میں بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ بیہوش ہوا تھا وہ صرف یہی کہے گا کہ اس کی پلک جھپک گئی تھی اور یہ بات بھی اگر اس نے کہی تو خاصے تشدد کے بعد ہی کہہ سکے گا۔ لیکن کرنسی نوٹوں کو جعلی نوٹوں سے بدلنے کے معاملے میں یہاں کے حکام نے صرف عقلمندی سے کام نہیں لیا۔ اس سے ہمارے کاز کو کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"یس میڈم۔" جیکب نے کہا۔ "نقلی کرنسی پکڑی گئی تو کیا ہوا اس کی جگہ اصلی کرنسی تو دینی پڑی اور کرنسی کا پھیلاؤ تو ہوا۔ اس سے افراطِ زر پیدا کرنے کا مقصد تو پورا ہو ہی جانا چاہیئے۔"

جولیانا بڑی توجہ سے جیکب کی بات کو سن رہی تھی۔ ہلکا سا قہقہہ لگا کر کمرے کے ماحول کو متبسم بنا دیا۔ پھر اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو خیر ہوگا ہی.... یہاں کے صرافے میں کیا حال ہے؟"

"ایک ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ پولیس کو معلوم ہو گیا ہے کہ جو اصل کرنسی بنک سے چوری ہوئی اس کا سونا خریدا گیا ہے زرین کے پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ بیانات لئے جا رہے ہیں۔"

"اور ظاہر ہے سب کا یہی بیان ہوگا کہ رسالپور کی مہارانی نے سونا خریدا۔" جولیانا نے قہقہہ لگایا۔ اب اس کا غصہ کا پہلا موڈ ختم ہو چکا تھا۔

"جی ہاں۔" جیکب نے جواب دیا "صرافوں نے جو حلیہ بیان کیا پولیس نے آرٹسٹوں سے اس کے مطابق خیالی تصویر بنوائی ہے۔"

"اوہ" جولیانا چونکی "لیکن وہ تصویر تو مہارانی کی ہوگی جولیانا کی نہیں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں، میک اپ میں واقعی آپ کو کمال حاصل ہے ــــ لیکن میڈم ایک اور بڑے مزے کی بات ہوئی ہے۔" جیکب نے کہا۔

"وہ کیا؟" جولیانا نے پوچھا۔

"کسی صراف نے یہ نہیں بتایا کہ مہارانی رسالپور نے سونے کے عوض جو نقد کرنسی دی اس میں جعلی کرنسی بھی شامل تھی۔"

جولیانا نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا "وہ کیوں؟"

"شاید اس لئے کہ انہوں نے جو سونا فروخت کیا۔ وہ سب وہائٹ نہیں تھا، بلکہ بلیک کا بھی تھا اور یہ بات وہ بتا نہیں سکتے۔"

"اس لئے وہ جعلی کرنسی کو چھپا کر گھر بیٹھ گئے ہیں۔ ہیں نا۔" جولیانا نے پوچھا۔

"یس میڈم۔ بالکل یہی بات ہے۔ لیکن بات صرف یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔"

"تو پھر کہاں تک پہنچتی ہے۔" جولیانا نے پوچھا۔ "ظاہر ہے پولیس کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ مہارانی رسالپور نے ایک کروڑ روپے کی مالیت کا سونا خریدا ہے۔ لیکن صرف ایک کروڑ روپے کی کرنسی پیش نہ کر سکے ہوں گے اور پولیس مانگ کر رہی ہوگی کہ تمام کرنسی پیش کی جائے۔"

"میڈم کی ذہانت کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔" جیکب نے جواب دیا "بالکل یہی بات ہے پولیس کا خیال ہے کہ صراف بھی غیر قانونی کام کرتے رہے ہیں۔"

"خیر چھوڑو" جولیانا نے کہا "یہ یہاں کی پولیس اور حکومت کا دردِ سر ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں مال روانہ کرنے کے فوراً بعد واپس جانا چاہتی ہوں۔ میرا مقصد پورا ہو چکا ہے کرنسی کا پھیلاؤ اور بلیک منی کے سبب اب یہاں قیمتیں بھی بڑھیں گی اور اس ملک کو اقتصادی امداد کے لئے جھکنا پڑے گا۔"

"ظاہر ہے پڑوسی ملک نے یہی مشن میرے سپرد کیا تھا۔ میں جلد سے جلد اس کام کی قیمت وصول کرنا چاہتی ہوں۔"

ضرغام بڑی توجہ کے ساتھ کمرے میں ہونے والی تمام گفتگو کو سن رہا تھا۔ جولیانا کی باتوں کو سن کر وہ کئی بار چونکا تھا۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔

تو یہ بات ہے، ضرغام نے سوچا اور غصے کی چمک اس کی آنکھوں میں آ گئی "محترمہ میرے ملک کو پڑوسی ملک کا اقتصادی غلام بنانا چاہتی ہیں۔ دیکھا جائے گا۔"

یہ تمام گفتگو جو ضرغام سن رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ریکارڈ بھی ہوتی جا رہی تھی۔

یہ بات ختم کرتے ہی جولیانا نے جو کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اپنی ٹانگیں آگے کی طرف پھیلا دیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر ایک توپ شکن انگڑائی لی۔

"اب اہم ترین کام مال کو حفاظت کے ساتھ اس ملک سے باہر لے جانا ہے۔" جولیانا نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ظاہر ہے یہ کوئی بہت آسان کام نہیں ہے۔"

"لیکن میڈم یہ کام تو ہم یہاں اپنے اسمگلر دوستوں کے ذریعے بھی آسانی سے کر سکتے ہیں۔" رنجیت نے کہا۔

"کر تو سکتے ہیں۔ لیکن میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتی اور نہ تمہارے دوستوں کو شریک کرنے کے حق میں ہوں۔ علاوہ ازیں میں یہ بھی کسی کو نہیں بتانا چاہتی کہ میں کیوں اس ملک میں آئی تھی۔"

"تو پھر میڈم۔ آپ جیسا حکم دیں۔" جیکب نے کہا۔

"پڑوسی ملک کے سفارتخانے نے اطلاع دی ہے کہ کل رات اس کا ایک خاص جہاز روپ نگر کے ہوائی اڈے پر اتر رہا ہے۔ تم لوگوں کو مال صرف سفارتخانے تک پہنچانا ہے۔ وہاں سے وہ ڈپلومیٹک بیگ میں جہاز تک پہنچ جائے گا۔ اور پڑوسی ملک میں ہمیں مل جائے گا۔"

"لیکن میڈم ایک کروڑ روپے کا سونا ہے۔ اگر اس ملک نے بے ایمانی کی تو...." جیکب نے پوچھا۔

جولیانا ہنسی اور اس نے ایک ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ "وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"پھر بھی امکانات کو تو سامنے رکھنا ہی چاہیے۔"

"جیکب تم میرے منہ چڑھے ضرور ہو لیکن یہ مت بھولو کہ اس میدان میں ابھی بچے ہو۔ کیا پڑوسی ملک کی موت آئی ہے جو مجھ سے غداری کرے گا۔" جولیانا نے جواب دیا۔

"تو کیا اس پڑوسی ملک کا بھی کوئی راز..."

جیکب ابھی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ جولیانا نے کہا۔

"ہاں جولیانا رازوں کی تجارت کرتی ہے۔ یہاں کا مشن تو محض ایک چھکلہ تھا۔ پڑوسی ملک مجھے میرا سونا بھی واپس دے گا اور اپنے کام کی قیمت بھی ادا کرے گا۔ لیکن سفارتخانے تک یہ سونا بڑی حفاظت کے ساتھ پہنچانا ہوگا۔"

"ایسا ہی ہوگا مادام۔" رنجیت نے جواب دیا۔

"میں مطمئن نہیں ہوں۔" جولیانا نے کہا "تمہارے فلیٹ کی نگرانی اور پھر اس لڑکی کا میرے فلیٹ میں پکڑا جانا — یہ سب خیریت کی علامت نہیں ہے۔"

"کیا لڑکی کو اب ہوش آگیا ہوگا۔" جولیانا نے پوچھا۔

"جی ہاں میڈم۔ میرا خیال ہے وہ ہوش میں آنے کے بعد دیواروں سے ٹکرا رہی ہوگی۔" رنجیت نے جواب دیا۔

"تو پھر لے لاؤ۔ دیکھیں وہ کون ہے، پولیس کی مخبر ہے یا اسمگلروں کے کسی گروہ کی ممبر۔" جولیانا نے کہا۔

رنجیت جولیانا کی بات سن کر کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور ابھی اس نے دروازے کی طرف ایک قدم بڑھایا تھا کہ جولیانا نے کہا۔

"لیکن ابھی ٹھہرو۔ ابھی مجھے تم لوگوں سے کچھ اور بھی کہنا ہے۔"

جولیانا کی بات سننے کے بعد رنجیت پھر کرسی پر بیٹھ گیا اب وہ چاروں جولیانا کو دیکھ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے آج تم لوگ یہیں قیام کرو۔" ایک وقفہ کی خاموشی کے بعد جولیانا نے کہا۔

جولیانا کی بات سن کر جیکب کے چہرے پر خاص طور پر مسرت کی کرن پھوٹ پڑی تھی۔ دوسرے لوگوں نے جولیانا کے اس فیصلہ کو محض احتیاط ہی سمجھا۔

"میرا خیال ہے اس فلیٹ میں آج کی رات تم لوگوں کے لئے ایک خوشگوار رات ثابت ہوگی۔" جولیانا نے مسکراتے ہوئے رنجیت اور اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے افراد کی طرف دیکھ کر کہا "یہاں برابر کے کمرے میں اعلیٰ درجے کی شراب بھی ہے اور وہ خوبصورت بلا بھی۔"

ضرغام جیسے جولیانا کی بات سن کر بھبھک گیا اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی تھیں اور اس کی مٹھیاں بند ہو گئیں۔ ایک لمحہ کو

اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ جولیانا کو فوراً سزا دے۔ لیکن ضبط اس کے جذبات پر غالب آگیا۔ زہرہ کی شکل اس کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔

جولیانا کی بات سن کر سبھی کے چہروں پر رنگ بکھر گیا تھا اور وہ سبھی اپنی اپنی جگہ پہلو بدلنے لگے تھے۔ جیکب البتہ صرف جولیانا پر نگاہ جمائے ہوئے پرسکون بیٹھا تھا۔

"کل صبح جیکب کے علاوہ تم سبھی لوگ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد یکے بعد دیگرے واپس جاؤ گے۔" جولیانا نے سلسلۂ کلام پھر شروع کیا۔

"میرا مقصد یہ ہے کہ اس طرح یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ فلیٹ کی نگرانی کی جا رہی ہے یا نہیں اور تم لوگ حفاظت کیساتھ باہر جا کر کچھ اہم ذمہ داریاں بھی پوری کر سکو گے۔"

"وہ ذمہ داریاں کیا ہوں گی میڈم؟" رنجیت نے پوچھا۔

"کل رات کو حفاظت کے ساتھ مال یہاں سے لے جانے اور اس خوبصورت بلا کو ٹھکانے لگانے کی ذمہ داریاں۔ بہر حال میں اس سلسلہ میں کل صبح اپنے منصوبوں کی پوری تفصیل تم لوگوں کو سمجھا دوں گی۔" جولیانا نے کہا۔

"تو کیا میں اب اس لڑکی کو لے کر آؤں میڈم۔" رنجیت نے پوچھا۔

"ہاں۔" جولیانا نے جواب دیا "باقی باتیں کل صبح ناشتہ پر ہوں گی۔"

"مادام بہت عظیم ہیں۔" رنجیت نے کہا "غلاموں سے برابر کا سلوک کرتی ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے وہ سامنے کا دروازہ کھول کر ساتھ والے کمرے کی طرف چلا گیا۔

کمرے میں اس وقت خاموشی طاری تھی۔ ضرغام خود اپنی جگہ بہت چوکنا ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رنجیت زہرہ کو لینے کے لئے گیا ہے اور زہرہ کی زبان کھلوانے کیلئے جولیانا اس پر تشدد بھی کر سکتی ہے۔ ضرغام کو معلوم تھا کہ جولیانا ایک چالاک اور ذہین مجرمہ تو ہے ہی وہ لوگوں کی زبانیں کھلوانے کے لئے اُن پر تشدد کے ان تمام طریقوں کو بھی استعمال کرنا جانتی ہے۔ جو کسی زمانے میں چین اور جاپان میں رائج تھے یا جن کا استعمال آج بھی افریقہ کے بعض حصوں میں پایا جاتا ہے۔ ایک مخصوص ساخت کا ریوالور ضرغام کے ہاتھ میں تھا۔ اب اس پر اس کی گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی تھی۔

ضرغام نے زیڈ تھری اور زیڈ فور کو بھی سگنل دے دیا جس کا مقصد تھا کہ وہ کاروائی کے لئے بالکل تیار رہیں اور ان کو یہ بات پہلے ہی سمجھا دی گئی تھی کہ فائرنگ کی آواز سنتے ہی وہ دونوں یکے بعد دیگرے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جائیں۔ یہ دونوں اس وقت ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب ہی پوشیدہ ہو کر کھڑے ہوئے تھے اور چھت پر سے یہاں تک پہنچنے میں انہیں ایک شکار بھی ہاتھ آگیا تھا۔

دراصل یہ وہی آدمی تھا جس نے زہرہ کے سر پہ وار کیا تھا۔ جیسے ہی زیڈ فور اور زیڈ تھری سیڑھیوں سے آہستگی کے ساتھ اُترے زیڈ فور کو وہ آدمی کورٹ یارڈ میں ایک طرف اسٹول پر بیٹھا نظر آگیا تھا۔ اس کا رخ اس وقت اتفاق سے ڈرائنگ روم کی طرف نہیں تھا ورنہ دقت پیش آسکتی تھی۔ زیڈ فور آہستہ آہستہ قدموں کی آواز کئے بغیر اس کی طرف بڑھا اور پھر اچانک اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر دبا کر دبانے لگا۔ وہ آدمی کسی مزاحمت کے بغیر ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ بعد میں زیڈ فور اور زیڈ تھری دونوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کو باندھ دیا تھا اور خود ڈرائنگ روم کے دروازے کے قریب اِدھر اُدھر دروازے میں جا کھڑے ہوتے تھے۔

ڈرائنگ روم میں خاموشی کا یہ وقفہ کچھ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ ضرغام نے دیکھا کہ رنجیت زہرہ کو لے کر ڈرائنگ روم میں آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا بلکہ زہرہ بالکل آزاد تھی یعنی اس کے ہاتھوں کو بھی باندھنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ضرغام، زہرہ کو اس طرح آزاد دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔

زہرہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جولیانا کے بالمقابل آکھڑی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر خوف کا کوئی شائبہ نہیں تھا اور اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ موجود تھی۔ غالباً اس کی وجہ اس کا یہ احساس تھا کہ اس عمارت میں وہ تنہا نہیں ہے وہاں اس کا پیارا بھائی بھی موجود ہے اور تھری زیڈ کے دوسرے ممبران بھی۔

جولیانا نے زہرہ کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور پھر اچانک چونک پڑی۔

"تو یہ تم ہو۔ تم تو اس فلیٹ تک پہلے بھی آچکی ہو۔"

"تو کیا تمہیں وہ بوڑھی عورت تھیں جس کا اس نوجوان سے جھگڑا ہو رہا تھا۔" زہرہ نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"کس نوجوان سے؟" جولیانا نے پوچھا۔

"جو قتل کر دیا گیا۔" زہرہ نے بیباکی کے ساتھ کہا۔

"تو وہ تمہیں تھیں۔" اور پھر وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کر کھڑی

ہوئی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے کھڑی ہوئی تھیں۔

"کون ہو تم۔؟" جولیانا پھنکاری۔

"پہچان تو گئی ہو" زہرہ نے جواب دیا۔

"بکواس بند کرو۔ میں پوچھتی ہوں کون ہو تم ـــ" جولیانا نے پھر پوچھا۔

"ایک لڑکی" زہرہ نے جواب دیا۔

"وہ تو۔ میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ لیکن تم نے میرا پیچھا اس روز کیوں کیا تھا اور آج پھر یہاں تک کیوں پہنچیں؟"

زہرہ نے قدرے توقف کے ساتھ جواب دیا "اس روز کیوں پیچھا کیا تھا۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے اور آج بھی اس سلسلہ میں ادھر آنکلی تھی"

"بکواس۔ سچ بتاؤ ورنہ ایسی سزا دوں گی کہ سننے والے کانپ اٹھیں گے"

"اچھا" زہرہ نے استہزائیہ انداز میں جواب دیا "اور وہ بھی ان ناپاک ہاتھوں سے" مزغام جو تمام گفتگو سن رہا تھا۔ زہرہ کی اس بات پر بے ساختہ مسکرایا۔

جولیانا جیسے آپے سے باہر ہو گئی۔ اس نے رنجیت کو حکم دیا۔

"اس لڑکی کے ہاتھ باندھ دو"

زہرہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی اور اس بات پر خود جولیانا کو بھی حیرت ہوئی۔ وہ مسلسل اور بڑے غور سے زہرہ کو دیکھ رہی تھی۔

یکایک ایک بار وہ پھر چونک پڑی اور جیکب سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"جیکب، دیکھو اس لڑکی میں اور اس آدمی میں جو ہم نے ہوٹل میں دیکھا تھا اور جس کا تم نے تعاقب کیا تھا، کس قدر گہری مشابہت موجود ہے"

"یس میڈم۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں"

"ہوں ـــ" جولیانا نے ہنکارا بھرتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیئے۔ اس وقت تک رنجیت زہرہ کے دونوں ہاتھوں کو باندھ چکا تھا۔

"اب بتاؤ۔ تم کون ہو۔ پولیس کے لئے کام کرتی ہو؟"

"نہیں" زہرہ نے جواب دیا۔

"تو پھر تم کون ہو" جولیانا نے جھلا کر پوچھا۔

"آپ سے ملنے کے لئے جی چاہ رہا تھا" زہرہ نے جواب دیا۔

"تم یوں نہیں مانو گی" جولیانا جیسے بھڑک گئی اور اس نے جیکب کو آواز دی۔

"یس میڈم" جیکب نے جواب دیا۔

"اس کے پاؤں کے انگوٹھوں میں کیلیں ٹھونک دو"

"یس میڈم" جیکب نے جواب دیا اور قریب پڑی میز پر سے کیلوں کا ڈبہ اور پیپر ویٹ اٹھا کر زہرہ کی طرف بڑھا۔

ابھی جیکب نے زہرہ کے پاؤں کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ ایک آہ بھر کر الٹ گیا۔

"تم میں سے کوئی بھی حرکت نہیں کرے گا" مزغام کی آواز ڈرائنگ روم میں گونجی۔ اس اچانک آواز سے وہ سبھی گھبرا گئے تھے۔ جولیانا، اور دوسرے لوگوں نے روشن دان کی طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی ـــ

مزغام کے ہاتھ میں ریوالور کے علاوہ انہیں اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔

جیکب بری طرح زمین پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔

فائر کی آواز سنتے ہی زیڈ تھری اور زیڈ فور دونوں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر پہنچ چکے تھے۔

جولیانا کو اس صورت حال کی توقع نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنی جگہ انتہائی پرسکون کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جیکب کو دیکھا جو شاید اس وقت تک دم توڑ چکا تھا۔

جولیانا نے اطمینان کا سانس لیا۔ کیونکہ کسی حد تک وہی اس کا رازدار بھی تھا۔

"تم سبھی لوگ میرے نشانے پر ہو" مزغام نے پھر کہا "رنجیت تم پستول نیچے پھینک دو۔" اور رنجیت کے سامنے سوائے تعمیل حکم کے اور کچھ نہیں تھا۔

"زیڈ تھری" مزغام کی آواز آئی۔

"یس باس" زیڈ تھری نے جواب دیا۔

"زہرہ کے ہاتھ کھول دو۔ اور زیڈ فور تمہارے پستول کا رخ جولیانا کی طرف ہی رہنا چاہیئے"

"یس باس" زیڈ فور نے جواب دیا اور جولیانا کی سمت پستول کی نال اٹھا دی۔

جولیانا اس وقت ذہنی طور پر کہیں اور تھی شاید فرار کی راہ اختیار کرنے کی بابت سوچ رہی تھی لیکن زیڈ تھری اور زیڈ فور کے الفاظ سنتے ہی وہ چونک پڑی۔ اوہ یہ تو تھری زیڈ والے ہیں۔ اس نے سوچا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس ملک میں تھری زیڈ ایک تنظیم ہے۔ لیکن وہ صرف یہی جانتی تھی کہ یہ تنظیم جرائم پیشہ لوگوں کی ہے۔ یہ بات ذہن میں آتے ہی اس نے منہ روشندان کی سمت کیا اور بولی۔

"تو تم زیڈ ون ہو"

"کیا مجھے زیڈ ون نہیں ہونا چاہیئے" ضرغام نے سن کر جواب دیا۔

"مسٹر زیڈ ون" جولیانا نے کہا "میرے پاس ایک کروڑ کا سونا ہے۔ میں بتیس اس میں سے نصف دے سکتی ہوں"

"لیکن اب مجھے پورا مل رہا ہے" ضرغام نے جواب دیا۔

"اچھا تو سب تم ہی لے لو۔ ہمیں جانے دو" جولیانا نے بالآخر کہا۔

"خواب ہے دیوانے کا" ضرغام نے جواب دیا "اگر تم نے میرے ملک کو دیوالیہ بنانے کی کوشش نہ کی ہوتی تو شاید میں کچھ سوچتا" ضرغام نے جواب دیا "پھر میں اپنے وطن سے باہر آکر عوام اور سرکار کو نقصان پہنچانے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا ہوں"

"زہرہ" ضرغام نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے زہرہ کو پکارا۔

"جی بھائی جان" زہرہ نے جواب دیا۔

"تم پیچھے ہٹ کر دروازے پر آجاؤ" ضرغام نے ہدایت کی۔

"بہت اچھا" زہرہ نے جواب دیا۔

"زیڈ فور" اس بار ضرغام نے دروازے پر تعینات اپنے آدمی سے تخاطب کیا۔

"یس باس"

"ان سب کو باندھ لو" ضرغام نے حکم دیا۔

اور پھر تھری زیڈ نے رنجیت اور دوسرے لوگوں کے ہاتھ باندھنے شروع کر دیے۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ اچانک جیسے طوفان آگیا۔ وہ دراصل جولیانا تھی جس نے زیڈ تھری کے کارکنوں کو مصروف دیکھ کر ڈرائنگ روم سے باہر کورٹ یارڈ کی طرف ایک لمبی زقند لگائی تھی۔ زیڈ فور جو کہ جولیانا کو کور کئے ہوئے تھا فوراً باہر کی طرف دوڑا لیکن جولیانا اس وقت تک کورٹ یارڈ کی دیوار کو بھی پھاند چکی تھی۔

ضرغام نیچے آکر ڈرائنگ روم میں آگیا۔ حبیب کی لاش سامنے پڑی تھی۔ رنجیت اور دوسرے تین آدمیوں کی مشکیں باندھ دی گئی تھیں۔ تلاشی لینے پر وہاں سونے کی اینٹیں رکھی نظر آگئیں۔ ضرغام نے ان میں سے نصف اینٹیں الگ کر دیں اور زیڈ فور سے کہا۔

"اس سونے کو ہیڈ کوارٹر پہنچانا ہے"

اب ضرغام رنجیت اور اس کے ساتھیوں کے قریب جھکا اور ان کی گردنوں کی جانے کونسی رگ دبائی کہ وہ بیہوش ہوتے چلے گئے۔

زیڈ تھری کا پورا قافلہ فلیٹ کے دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد اب ایگل ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

یوں تو انسپکٹر شیکھر اس روز سے پریشان تھا جب سے پولیس کمشنر نے اس کو ڈانٹا تھا۔ لیکن آج تو وہ کچھ زیادہ ہی پریشان اور بے چین تھا۔ اس کی وجہ یہ اطلاع تھی کہ اعلیٰ حکام اس کا تبادلہ کرنے کی فکر میں ہیں اور پولیس کمشنر نے اس سلسلے میں اعلیٰ کمشنر وغیرہ کے ساتھ بھی تبادلہ خیال کیا ہے۔ اطلاع میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اس کو ایک نااہل افسر تصور کیا جا رہا ہے کہ جس کی تمام ذہانت ختم ہو گئی ہے اور محکمہ خفیہ میں کوئی کارآمد مہرہ نہیں رہا ہے۔ تبادلہ اگر معمول کے مطابق ہوتا تو شاید انسپکٹر شیکھر کو اس کی فکر نہ ہوتی۔ لیکن جرائم کی تفتیش میں ناکامی کی بنیاد بنا کر چونکہ تبادلے کی بات سامنے آئی تھی اس لئے وہ کچھ زیادہ پریشان ہو گیا تھا چنانچہ رات کے دو بج چکے تھے اور نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور وہ گاؤن پہنے ہوئے کبھی پلنگ پر بیٹھ جاتا اور کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا تھا۔ اس کی اس پریشانی سے اس کی بیوی بھی خاصی پریشان تھی۔

"جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ پریشان ہونے کا فائدہ کیا ہے" بالآخر اس کی بیوی دینا نے کہا جو کافی دیر سے اس کے آثار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کی بے چینی کو پورے طور پر محسوس کر رہی تھی۔

"میں پوچھتا ہوں کہ آخر وہ کمبخت مر گیا ہے" انسپکٹر شیکھر نے کہا۔

"کون؟" اس کی بیوی نے پوچھا۔

"وہی زیڈ ون" انسپکٹر شیکھر نے کہا "کمبخت نے یقین دلایا تھا کہ قتل اور نقلی نوٹوں کے کیس میں وہ کام کر رہا ہے میں اسی لئے کچھ نہ کر سکا اور اس کے بھروسے پر بیٹھا رہا۔ اگر میرے ہاتھ آجائے تو....."

ابھی وہ اپنی بات پوری نہ کر پایا تھا کہ ٹیلیفون چیخ اٹھا۔ اس کی بیوی نے جو اس کی بات سن کر مسکرانے لگی تھی۔ ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

"ہیلو۔ کون صاحب ہیں" دینا نے پوچھا۔

"ایک بہن کا بھائی" دوسری طرف سے جواب ملا۔ یہ آواز ضرغام کے علاوہ کسی اور کی نہ تھی۔ انسپکٹر شیکھر کی بیوی اس کی آواز سن کر جیسے اچھل پڑی۔

"اوہ آپ ہیں" اس نے اضطراری کیفیت میں کہا۔

"کون ہے" انسپکٹر شیکھر نے غصے سے پوچھا۔

"وہی جس کو ابھی آپ گالیاں دے رہے تھے۔ دینا نے اپنے شوہر کو جواب دیا۔ اس نے ٹیلیفون کے ریسیور پہ ہاتھ نہیں رکھا

تھا۔ اور ضرغام دونوں کی بات صاف طور پر سن رہا تھا۔

"کون گالیاں دے رہا تھا مجھے دینا بہن؟" ضرغام نے پوچھا۔

"وہی اور کون۔" کہہ رہے تھے آپ کے سہارے بیٹھے رہے ورنہ کب تک مجرموں کو پکڑ لیتے۔" دینا نے جواب دیا۔

دینا کی بات سن کر ضرغام نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا "شاید مجھ پر بھاری پڑی ہوگی۔"

"یہ تو معلوم نہیں۔" دینا نے جواب دیا "البتہ کہیں سے اپنے تبادلے کی خبر سن کر آئے ہیں۔"

ضرغام نے جواب میں کیا کہا دینا نہیں سن پائی۔ کیونکہ انسپکٹر شیکھر نے پھرتی کے ساتھ آکر ٹیلیفون کا رسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔

"کہاں مر گئے تھے آخر تم۔" رسیور کان سے لگاتے ہی انسپکٹر شیکھر دہاڑا۔ اس نے یہ بھی نہیں سنا کہ دینا سے کس بات کے جواب میں دوسری طرف سے کیا کہا گیا تھا۔

"آہستہ بولو انسپکٹر۔" ضرغام نے کہا "بیوی کے سامنے رعب جھاڑ رہے ہو۔"

"میرا مطلب یہ تھا کہ تم نے مجھ سے کوئی وعدہ کیا تھا۔" انسپکٹر شیکھر نے کہا۔ اس بار اس کا لہجہ کچھ کمزور سا تھا۔ شاید اس کو خیال آگیا تھا کہ اس وقت وہ ایک غرض مند کی حیثیت سے بات کر رہا ہے۔

"کیا تم نے نہیں سنا۔ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔" ضرغام نے ہنس کر کہا۔ "اور بتاؤ کیا حال چال ہیں۔ کہاں تک پہنچے؟"

"کیا حال چال پوچھنے کے لئے ہی ٹیلیفون کیا ہے۔" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا "معلوم ہے اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔"

"معلوم ہے۔ گالیاں کیوں دے رہے تھے مجھے۔"

"اور نہیں تو پیار کروں۔" انسپکٹر نے غصہ سے کہا "جعلی نوٹوں کا معاملہ اور قتل کا کیس تو تھا ہی۔ اب صرافوں کا قضیہ بھی پیدا ہو گیا۔"

"کیا مطلب۔" ضرغام نے پوچھا۔

"سونا خریدا گیا تھا۔ تمہارا خیال درست نکلا۔ لیکن صراف یہ بتانے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ انہوں نے کل کتنا سونا فروخت کیا۔" انسپکٹر نے کہا۔

"بے کار ہے وہ بتائیں گے بھی نہیں.....۔" ضرغام نے جواب دیا "ایک کروڑ روپے کا سونا خریدا گیا تھا۔ پچاس لاکھ اصل نوٹ جو بینک سے چوری ہوئے یا بدلے گئے اور پچاس لاکھ جعلی نوٹ۔"

"اوہ۔" انسپکٹر شیکھر نے حیرت سے کہا "تمہیں کیسے معلوم؟"

"مجھے کیا معلوم نہیں۔" ضرغام نے کہا "مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے تبادلے کے آرڈر ہو چکے ہیں۔" ضرغام نے جواب دیا۔

"آخر تم ہو کون۔" انسپکٹر شیکھر نے ضرغام کی بات سن کر اضطراری کیفیت کے ساتھ پوچھا۔

"آم کھانے سے کام رکھو انسپکٹر۔" ضرغام نے جواب دیا۔ "یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ مجرم کون ہیں اور سونا کہاں ہے اور میں کون ہوں۔"

"پہلے یہ بتاؤ کہ مجرم اور سونا کہاں ہے۔" انسپکٹر نے عجلت تمام کہا۔ "تمہیں تو پھر بھی دیکھ لوں گا۔"

"اچھا یہ بات ہے تو میں ٹیلیفون بند کرتا ہوں۔" ضرغام نے دھمکی دی۔

"ارے نہیں۔" انسپکٹر نے گھبرا کر کہا "وہ تو میں ایسے ہی کچھ کا کچھ کہہ جاتا ہوں۔"

"اچھی بات ہے تم بھی کیا یاد کرو گے۔" ضرغام نے کہا "جاؤ مجرموں کو پکڑ لو اور سونے پر قبضہ کر لو۔"

"کیا اس وقت؟" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔

"تو کیا کتے نے کاٹا تھا کہ دو بجے رات کو تمہیں ٹیلیفون کرتا۔" ضرغام نے ہنس کر کہا۔

"کہاں جانا ہوگا۔" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا "کتنی فورس کی ضرورت ہوگی۔"

"زیادہ نہیں۔" ضرغام نے کہا "تمہیں وہاں کچھ کرنا نہیں ہے بلکہ صرف مجرموں اور مال کو لانا ہے۔"

"تو کیا مقابلہ کی توقع نہیں ہے۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

"مقابلہ مجھ سے ہو چکا ہے۔" ضرغام نے جواب دیا۔

"کیا مطلب۔" انسپکٹر شیکھر نے پوچھا۔

"تمہیں وہاں ایک لاش ملے گی۔" ضرغام نے انسپکٹر شیکھر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تین دوسرے آدمی بیہوش ملیں گے اور مال بیڈ روم میں۔"

"تو تم نے قتل کیا ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"قاتل کا قتل۔ اور ایک ایسے مجرم کا قتل جس کی دنیا کو تلاش ہے اور جو ایک شریف لڑکی پر ظلم توڑنے لگا تھا۔" ضرغام نے جواب دیا۔ اب وہ سنجیدہ تھا۔ "انسپکٹر یہ مت سمجھو کہ مجرم اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر گرفتاری کے لئے پیش نہیں کرتے ہیں۔"

"لیکن تمہیں خود کارروائی نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"سونے میں سے اپنا خراج بھی وصول کرنا تھا نا۔" ضرغام نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے تم سونے کا کچھ بڑا حصہ اڑا چکے ہو۔" انسپکٹر نے جلدی سے پوچھا۔

"تم جانتے ہو۔ میں اپنا حصہ ضرور وصول کرتا ہوں" ضرغام نے جواب دیا۔ "اگر تمہیں یہ ناگوار لگا ہے تو چھوڑ دو۔ میں فوراً مجرموں کو ٹھکانے لگائے دیتا ہوں۔ اس صورت میں سونا میرا اور تبادلہ تمہارا۔"

"کیا بکتے ہو" انسپکٹر کو غصہ آگیا "بتاؤ۔ کہاں جانا ہے۔"

"اب آگئے راہ پر" ضرغام نے کہا۔ اور انسپکٹر شیکھر کو تفصیل کے ساتھ پتہ بتاتے ہوئے کہا "زیادہ فورس کی ضرورت نہیں ہے۔ اور خود تم جاؤ گے اور ہاں ایک فائر بھی کرو گے۔"

"اس کا کیا فائدہ" انسپکٹر نے پوچھا۔

"واقعی گھامڑ ہو" ضرغام نے ہنس کر کہا "بھلے آدمی آخر کار کبھی تو کچھ دکھاؤ گے۔"

"اوہ ہوں" انسپکٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔

"باقی خیر و عافیت" ضرغام نے کہا "سوائے اس کے کہ گروہ کی لیڈر اور اصل مجرم حبرایا ہاتھ نہیں آسکی۔ کمبخت نے وہ زقندیں لگائیں کہ مزہ آگیا۔"

"یہ تو برا ہوا" انسپکٹر نے کہا۔

"کیا کیا جائے" ضرغام نے جواب دیا "لیکن مطمئن رہو۔ میں اس کی تلاش میں رہوں گا۔ لیکن یتیم خانے کو پانچ ہزار روپے بھجوانا نہ بھولنا۔"

"کیا مطلب" شیکھر نے کہا "میرے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔"

"جھوٹ نہ بولو۔ ابھی گذشتہ روز ہی تو صرافوں سے روپیہ وصول کیا ہے تم نے۔"

"اوہ تم واقعی بڑے مجرم ہو" انسپکٹر شیکھر نے کہا۔ وہ ضرغام کی معلومات پر حیران رہ گیا تھا۔

"اچھا میں اب فون بند کرتا ہوں" ضرغام نے کہا "اور تو کچھ پوچھنا نہیں ہے۔"

"نہیں" انسپکٹر شیکھر نے جواب دیا۔ "میں بھی پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔"

٭ ٭ ٭

اگلے روز روزنامہ برق نے روپ نگر میں خاصی سنسنی پھیلا دی۔ بینک میں روپے جعلی نوٹوں کی تبدیلی، دو آدمیوں کے قتل اور صراف بازار سے سونے کی خریداری کی تفصیلات روزنامہ برق نے اس طرح نمک مرچ لگا کر شائع کیں کہ پڑھنے والے حیران رہ گئے۔ کیس کی تفصیلات میں تھری زیڈ کا خاص طور پر ذکر تھا کہ جس نے مجرموں کو طشت از بام کیا اور پولیس کی مدد کی کہ وہ ان کو گرفتار کر سکے۔ جو ہاتھ کے بارے میں اخبار میں مکمل تفصیلات شائع کی گئی تھیں۔ اس حسین ترین مجرم کی تصویر پہلے صفحہ پر شائع کی گئی۔ جس کے نیچے لکھا تھا کہ کس طرح یہ حسینہ فرار ہونے میں کامیاب ہوئی۔ خبر میں انگوٹھیوں اور ان کے ذریعے گفتگو کرنے کا تذکرہ بڑا سنسنی خیز تھا۔

صبح سویرے پولیس کمشنر نے انسپکٹر شیکھر کو طلب کیا۔ اس وقت تک انسپکٹر شیکھر نے پولیس کمشنر کو مجرموں کی گرفتاری کے بارے میں کوئی رپورٹ نہیں دی تھی۔ پولیس کمشنر کو صرف روزنامہ برق ہی سے تفصیلات ملی تھیں۔ جب انسپکٹر شیکھر پولیس کمشنر کے حضور میں پہنچا تو اس نے کہا۔

"یہ آخر روزنامہ برق میں پولیس کارروائی کی تفصیلات پہلے کیسے چھپ جاتی ہیں؟"

ظاہر ہے انسپکٹر شیکھر کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"اس نے کہا کہ چھاپے کے دوران اس کو کچھ کاغذات بھی ملے ہیں اور کچھ جعلی نوٹ بھی۔ کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ جعلی نوٹ کسی مغربی ملک میں چھپوانے کے بعد یہاں لائے گئے ہیں اور اس تمام معاملے کا تعلق پڑوسی ملک سے ہے۔"

یہ تفصیلات روزنامہ برق میں شائع نہیں ہو سکی تھیں اس لئے پولیس کمشنر اپنے سوالات کو بھول گیا اور اس نے کہا۔

"میں نے تمہارا تبادلہ رکوا دیا ہے۔ اگر مجھے تفتیش سے باخبر رکھتے تو تبادلے کا حکم کیوں ہوتا۔"

انسپکٹر شیکھر نے پولیس کمشنر کو شکریے کے طور پر سیلوٹ مارا اور اس کے آفس سے باہر نکل گیا۔

عمران ڈائجسٹ کی مقبول کہانی
سلاسیہ
مکمل ایک حصے میں
قیمت ۲۰ روپے منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ، ۳۷ اردو بازار کراچی

ولایتی

خشونت سنگھ

دیسی خاندان کا پس منظر رکھنے والا جب ولایتی لباس اوڑھتا ہے تو وہ بہت کچھ فراموش کر بیٹھتا ہے۔ وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ اس کا خاندان اس کی روایات اور سب سے بڑھ کر اس کی زمین کی روایت و تقاضے کیا ہیں۔ ایک ایسے ہی شخص کی روداد جو خاندانی اقدار فراموش کر چکا تھا۔

اپنی اقدار سے کٹ کر بدیسی لبادہ اوڑھنے والے کا قصہ

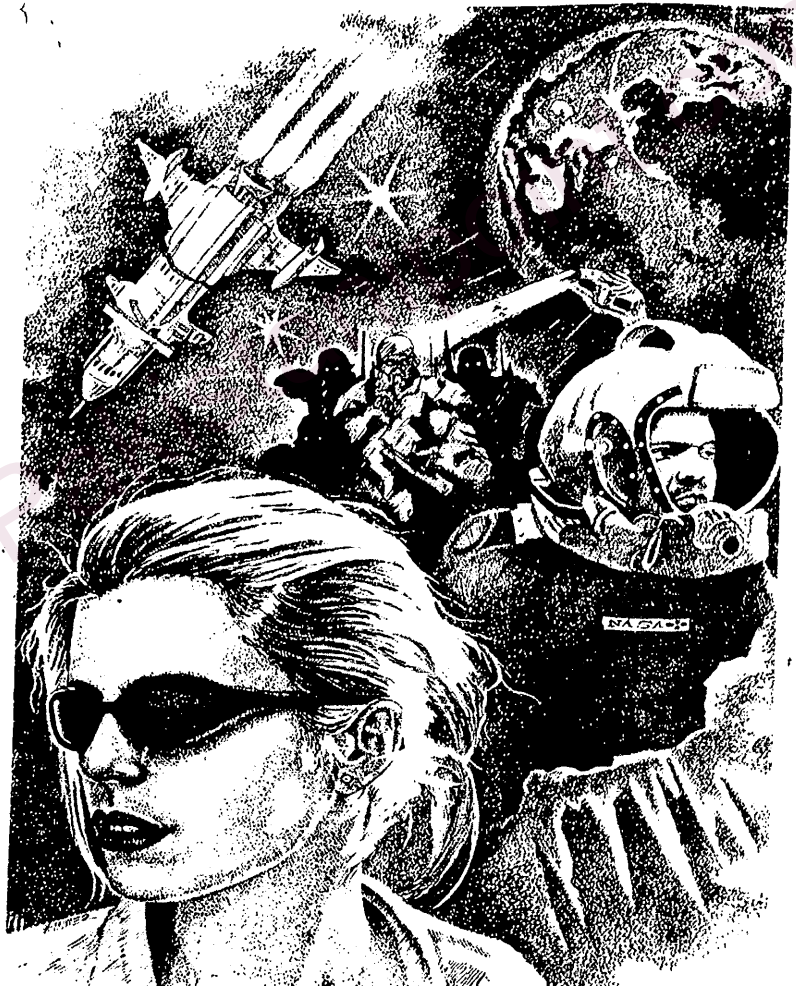

''ہاں تو کہیے! میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' پائپ کی نلی کلینر سے صاف کرتے ہوئے مسٹر سین نے نظریں ملائے بغیر ہی نو واردوں سے پوچھا۔ کریدے ہوئے کوڑے کو وہ پھونک مار کر اڑانے لگے تو لوگوں کے ہاتھوں میں لٹکتے گیندے اور گلاب کے پھولوں کے ہاروں پر ان کی نظر پڑی۔ اچھا، تو انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ آج صبح ہی وہ شادی کے بندھن میں بندھے تھے۔ اپنی طرف سے تو اسے انہوں نے پوری طرح سے خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی، مگر اپنے اس ملک میں بھلا کسی بھی راز کو کبھی چھپایا جا سکتا ہے؟

پائپ کی نلی کو پائپ کے ''باؤل'' سے جوڑ کر انہوں نے اس میں پھونک ماری اور تیکھی نظروں سے ہی دیکھا کہ نو وارد ذرا سے مضطرب ہونے لگے ہیں۔ پلاسٹک کی چھوٹی سی تمباکو کی تھیلی کو کھول کر وہ اپنا پائپ بھرنے میں مصروف رہے۔ نو واردوں میں کچھ دیر پھسپھساہٹ ہوتی رہی، پھر ان میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لیے اپنا گلا صاف کیا۔

''ہاں تو مسٹر بینرجی کیا پریشانی ہے آپ کو؟'' سین صاحب نے اسی بے کیف لہجے میں پوچھا۔

''سر!'' بابو طبقے کے سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔ ''ہم سب آپ کو طویل العمری اور ہمیشہ خوش رہنے کی نیک خواہشات دینے آئے ہیں۔'' اس نے چپڑاسیوں کو حکم دیا کہ صاحب کے گلے میں ہار ڈال دیے جائیں۔

چپڑاسی ہار لے کر آگے بڑھے ہی تھے کہ صاحب نے انہیں عاجزانہ انداز سے روکتے ہوئے حکم دیا ''میز پر رکھ دو'' آن دا ٹیبل۔''

چپڑاسیوں کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے۔ مسکرانا بھول کر وہ اپنی خفت مٹاتے ہوئے ہاروں کو میز پر رکھ کر بابوؤں کی قطار کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔

''بس یہی بات تھی؟'' مسٹر سین اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ''تب کام پر واپس چلا جائے اور ہاں، آپ سب کی نیک خواہشات کے لیے بہت بہت شکریہ۔'' لوگ سمجھ گئے صاحب کا اشارہ رخصت لینے کا ہے۔

''بینرجی، تم ذرا تھوڑی دیر بعد پھر آنا، میں باہر جا رہا ہوں کچھ دنوں کے لیے۔ کام کے ڈسٹری بیوشن کے لیے تم سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔''

''ہاتھ جوڑ کر نمستے کر کے وہ سب آہستہ آہستہ باہر نکل گئے۔

پائپ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے چھلوں کو چھت کی طرف اٹھتے دیکھ دیکھ کر سین پھر خیالوں میں کھونے لگے۔ ان کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا تھا۔ ہندوؤں کے لیے شادی کا یہی مطلب ہے۔ ویدوں کے مطابق زندگی کی چار حالتوں میں سے تیسری حالت، انہیں خود ہی حیرانی ہوئی کہ وہ سوچتے سوچتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ہندوؤں کی زندگی کا کوئی بھی شعبہ دھرم کے لمس سے اچھوتا کیوں نہیں لیکن ان کے والد خیالات کے لحاظ سے کوئی خاص قدامت پسند نہیں تھے۔ ہندو ہوتے ہوئے بھی انہوں نے انہیں اینگلو انڈین اسکول میں داخل کرایا تھا، جہاں لڑکوں نے ان کا نام سنتوش سے بدل کر ''سنی'' رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ ''بے نیل'' چلے گئے۔ آزادی سے پہلے ہی انڈین سول سروس میں لے لیے گئے تھے۔ یہ تو بعد میں آزاد ہندوستان کی سرکار نے قومی جذبات کے تحت ہندی اور ایک مادری زبان کو پڑھنا ضروری کر دیا تھا، لیکن ہندوستانی زبانوں کے بارے میں ان کی لاعلمی ان کے لیے کسی طرح بھی رکاوٹ نہ بنی، بلکہ یوں کہیے کہ وہ اس کی آڑ لے کر دوسروں کو متاثر ہی کرتے تھے۔ اپنے لہجے اور چال ڈھال کے باعث وہ لوگوں میں آسانی سے گھل مل نہیں پاتے تھے، مگر ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا..... وہ ان لوگوں کی طرح حسد، جلن اور چغلی وغیرہ کے رجحان سے بچے ہوئے تھے۔ پھر بھی لوگ ان کا ساتھ پسند کرتے تھے کیونکہ وہ ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ہندوستانیوں کی طرح نہیں تھے۔ وہ تھے ایک براؤن برٹش جنٹلمین!

اپنے ملک سے سین کو اگر کسی وجہ سے کوئی لگاؤ تھا، تو وہ تھا اپنی ماں کے باعث، بے چاری بیوہ تھی۔ روایات کے مطابق اس نے اپنے سر کے بال منڈوا دیے تھے۔ صرف سفید دھوتی پہنتی اور ننگے پاؤں چلتی۔

وہ اس کی اکلوتی اولاد تھے۔ جو بھی بن پاتا، دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کے لیے کرتے تھے۔ ماں ہی ان کا گھر سنبھالتی تھی۔ زیادہ تر وہ بیرے کے بنائے ''لیم چاپس'' اور ''شیفرڈس پائی'' ہی کھاتے تھے، مگر کبھی کبھی ماں کا دل رکھنے کے لیے اس کے ہاتھ کا بنایا بھات، ماچھ اور مسٹی بھی کھا لیتے۔ گھر کے ایک کمرے کو ماں نے مندر میں تبدیل کر رکھا تھا، جہاں وہ دھوپ اگربتی جلا کر گھنٹیوں کی مدھر آواز کے درمیان کالی ماں کی پوجا کیا کرتی تھی، مگر اس نے انہیں کبھی پوجا کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا۔ اس طرح وہ خود ہندوستانی فلمیں دیکھنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے، مگر ماں کو مہینے میں ایک فلم ضرور دکھلاتے تھے۔ ماں بھی شام کو ان کے اسکاچ پینے کا، اپنی موجودگی میں سگریٹ پینے کا برا نہ مانتی تھی اور نہ ہی کبھی پوچھتی کہ وہ کہاں جاتے تھے، کیا کرتے تھے؟ جب تک ماں نے ان کی شادی کی بات نہیں چھیڑی تھی، ان دونوں کی خاصی نبھ رہی تھی۔

پہلے تو وہ مذاق میں بات ٹالتے رہے، مگر آہستہ آہستہ ماں کا اصرار بڑھتا گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اب انہیں اپنی زندگی میں بہتر طور سے مصروف ہو جانا چاہیے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے انہیں کہا کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے پوتے کو گود میں کھلانا چاہتی ہوں۔ آخر کار انہیں ہار ماننا ہی پڑی۔ شادی کا انہیں مطلق کوئی خیال نہیں تھا۔ لڑکی کیسی ہو، یہ بھی انہوں نے نہیں بتایا۔ ملک میں لوٹ آنے کے بعد اس سے برا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اپنی ذات برادری میں شادی کرنا پڑے۔ انہوں نے ماں سے کہا ''ٹھیک ہے ماں، تم میرے لیے بیوی ڈھونڈو۔ جو بھی لڑکی تمہیں پسند ہوگی، میں اس سے شادی کر لوں گا۔''

ماں نے کئی دنوں تک بات نہیں چھیڑی۔ پھر ایک دن اس نے ڈیرہ دون سے اپنے بھائی کو بلایا۔ دونوں نے مل کر ایک شادی کا اشتہار تیار کیا اور ''ہندوستان ٹائمز'' کے دو کالم اتوار کی اشاعت میں چھپنے کے لیے دیا۔ ہندی میں ترجمہ کریں تو اشتہار اس طرح تھا۔

''آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ، فرسٹ کلاس گریجویٹ، سرکاری افسر، تنخواہ ایک ہزار، بنگالی، عمر پچیس برس کے لیے اعلا طبقے، خوشحال خاندان کی گوری، خوب صورت، لڑکی چاہیے۔ ذات اور جہیز کا بندھن نہیں۔ جنم کنڈلی کے ساتھ خط کتاب کریں۔ پوسٹ آفس بکس نمبر ۴۲۰۰۔''

پہلے ہفتے کے اشتہار کے جواب میں تقریباً پچاس خط آئے۔ لڑکیوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ جنم کنڈلیاں بھی تھیں۔ دوسرے ہفتے کے اشتہار کے بعد خطوط کو چھانٹا گیا اور بڑے اشتہار سے سین کی ماں اور ماما نے تقریباً سو فوٹو گراف کھانے کی چوڑی میز پر پھیلا دیے۔ لڑکیاں کنواری تھیں اور امور خانہ داری کی ماہر۔ ماں باپ نے لکھا تھا تو ماننا ہی پڑ رہا تھا، مگر ذات اور جہیز کا بندھن نہ ماننے کے باوجود وہی لڑکیاں پسند کی گئیں جو ان کی ذات کی تھیں اور ان کے والدین نے لمبا چوڑا جہیز دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب فیصلہ ''سنی'' کے ہاتھ میں تھا۔

''سنی'' کو پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ اس کی شادی کے لیے اخبار میں اشتہار دیا گیا تھا۔ وہ بہت مضطرب ہوئے۔ ان کی شرمندگی کا ٹھکانا نہ رہا، جب کلکتہ جیسے دور دراز مقامات سے چل کر لڑکی والے اخبار کے دفتر سے ان کا پتا لے کر دفتر میں ہی ان کو دیکھنے چلے آئے۔ انہوں نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر یہ سب تماشا بند نہ ہوا تو وہ شادی وادی نہ کریں گے، چنانچہ ماں اور ماما نے جلدی جلدی سارا معاملہ نمٹا دیا۔ لڑکی وہ پسند کی گئی جس کے والد نے بھاری بھرکم جہیز دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سگائی میں ہی لڑکی کے والد نے شادی میں دی جانے والی رقم کا ایک بڑا حصہ انہیں تھما دیا۔ طرفین لڑکے لڑکی کی جنم کنڈلیاں لے کر پنڈت کے پاس گئے۔ ہتھیلی گرم ہوتے ہی اس نے اعلان کر دیا کہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے بالکل قابل ہیں۔ طرفین کے لیے باسہولت شبھ تاریخ بھی پنڈت نے نکال دی۔

اس سے زیادہ برداشت کرنا اب ''سنی'' کے بس سے باہر تھا۔ انہوں نے منہ پھٹ ہو کر کہہ دیا کہ وہ شادی کریں گے تو کورٹ میں رجسٹری سے، ورنہ نہیں۔ ماں اور ماما کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا اب مزید کوئی چارہ نہیں تھا۔ لڑکی والوں نے تھوڑی بہت مخالفت کی۔ رسم و

رواج کے مطابق شادی ہو تو برات کی خاطر داری ہوتی ہے۔ دعوتیں جشن ہوتے ہیں۔ یہ بھی کوئی شادی ہوئی بھلا؟ رجسٹری کی فیس پانچ روپے!

مگر ایسی ہی تھی شری سنتوش سین اور کماری کلیانی داس کی یہ شادی۔ کلیانی، شری پروفلو اور پروتھما داس کی پانچ لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ شری داس بھی اپنے داماد سنتوش سین کی طرح ہی ایک فرسٹ کلاس گریجویٹ سرکاری افسر تھے۔

ہنی مون کے نام پر بھی مشکلات آئیں۔ ماں تو شرم سے یوں لال ہوئی جارہی تھی جیسے "سنی" نے پھر نامناسب کہہ دیا ہو۔ داس صاحب اور ان کے گھر والے بھی پریشان تھے کہ لڑکی اکیلی ہی، لڑکے کے ساتھ پندرہ دنوں تک باہر کیسے رہے گی! مگر ہار کر انہوں نے اس کو قسمت کے سہارے چھوڑ دیا۔ اس کا خاوند صاحبوں کی طرح پلا بڑھا تھا، اس لیے اسے بھی اس کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔

سین کی نیند ٹوٹی جب اس کا معاون سنتا سنگھ کمرے میں داخل ہوا، اپنی برادری کی ساکھ کے مطابق یہ سردار جی بھی اونچا بولنے والا اور زرا دھاکڑ قسم کا تھا "ارے بھئی! تم کیا سوچتے ہو کہ بغیر پارٹی وارٹی لیے ہم تمہیں چھوڑیں گے، اپنی بھابھی کے سواگت میں پارٹی لے کر ہی رہیں گے!" داخل ہوتے ہی وہ چلایا۔

سین اٹھا اور سردار جی کو دور ہی رکھنے کی فکر میں میز پر ہاتھ ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ سنتا سنگھ نے اس کی کوششوں کو بغیر دیکھے میز کے پار جا کر دوست کو گلے لگا لیا اور اس کے گالوں کو اپنے مونچھوں والے ہونٹوں سے چوم لیا "بدھائی ہو، بھائی، بدھائی ہو! بھابھی سے کب ملا رہے ہو یار؟"

"بہت جلد....." سین نے اپنے آپ کو اس کے بندھن سے آزاد کر کے اپنے گالوں کو پونچھتے ہوئے کہا مگر جلد ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا "جیسے ہی ہنی مون سے لوٹ کر آتے ہیں، اس سے تمہیں ملائیں گے۔"

"ہنی مون!" سنتا سنگھ نے طنز کرتے ہوئے کہا اور سین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ "ارے بھئی! چنبیلی کے تیل کی مالش والش کروائی ہے کہ نہیں؟ اور زرا دودھ میں بادام ڈال کر پینا۔ اور سب سے بڑی بات کہ بھابھی کو زیادہ۔"

سردار کے بن مانگے مشوروں اور ہدایات کی کوئی حد ہی نہیں تھی کہ کس طرح نئی دلہن کے پاس جانا چاہیے اور جنسی ہیجان کو ابھارنے والی چیزوں کا استعمال کیسے کرنا چاہیے۔ بغیر کوئی رائے دیے سین صاحب عاجزی سے سنتے رہے۔ جب حد ہو گئی تو انہیں ہاتھ بڑھا کر روکنا ہی پڑا۔

"بڑی مہربانی! آپ نے درشن دیے۔ ہنی مون سے لوٹتے ہی ہم دونوں آپ اور مسز سنگھ سے ملنے آئیں گے۔"

سنتا سنگھ کا منہ لٹک گیا۔ سین کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر بولا۔ "گڈ بائی! ہیو اے نائس ٹائم!" سین نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے کسی طرح کی بھی ناشائستگی نہیں کی تھی۔ صرف وہی کیا تھا، جو ایسی صورت حال میں کوئی بھی مہذب انگریز کرتا۔

ایک منٹ کے بعد ہی محکمے کے ڈائریکٹر شری سوامی کو اندر آنے کے لیے چپراسی نے پردہ ہٹایا۔ سین نے دوبارہ نو وارد کو دور رکھنے کی کوشش میں میز سے ہی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ گلے ملنے کا خیال ہی انہیں بے چین کر جاتا تھا۔

"گڈ مارننگ، سر!"

ڈائریکٹر نے منہ سے جواب دیے بغیر ہی اپنا ہاتھ اسے چھوا دیا۔ منہ میں ان کی پیک بھری ہوئی تھی۔ اس نے منہ ادھر کر کے پیک سنبھالی اور چپراسی کو آواز دی۔ "اے، پیک دان لاؤ!"

سین نے چپراسی سے کہہ کر پیک دان اپنے کمرے سے اٹھوایا ہوا تھا، اس لیے باہر سے پیک دان لا کر چپراسی نے ان کے منہ کے نیچے لگا دیا۔ شری سوامی نے پچ سے تھوکا تو سین میز کا دراز کھول کر ماچس ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا، جیسے اس کا تھوکنا انہوں نے دیکھا ہی نہ ہو۔ ڈائریکٹر صاحب آرام سے سامنے والی کرسی میں جم گئے۔

"ایہہ، یو سین، یو آر اے ڈارک ہاؤس۔ بائی گاڈ، اے کیچ بلیک ہارس، آف آئی مے سے سو۔"

شری سوامی کو اپنے انگریزی محاوروں پر بڑا ناز تھا ''تو بھائی، تم چپ چاپ جا کر شادی بنا لیا؟ ہیں؟ اور میرا سٹینو آج سویرے ہی آ کر بولا جے، ہم لوگوں کو صاحب کا میرج کا خوشی میں چھٹی منانا مانگتا'' ہم پوچھا لیکن، کون میرج؟ کس کا شادی؟'' تو اوبولا ''صاحب، سین صاب نے آج سویرے میں شادی بنایا۔'' بائی گاڈ، ہم بولا، پتا لگانے کو ہے کہ سچا بات کیا ہے؟ آئی مسٹ گیٹ داٹرتھ، داہول ٹرتھ اینڈ نتھنگ بٹ داٹرتھ، رائٹ، فرام داہارسس ماؤتھ۔''

''ارے تھینک یو کیا ہے؟ شادی والا دن بھی تم دفتر چلا آیا، دنیا ختم ہو جائے گا نہ کیا، اگر جے تم تھوڑا دن واسطے چھٹی لے لے گا؟ ہم تم کو باس کا روپ میں آرڈر دیتا ہے اجے ابھی گھر چلا جائیو، اپنا وائف کا پاس۔ ہم ابھی ایک ڈیمی آفیشیل میمو کاٹتا ہے۔ دیکھیں تم کیا کرتا ہے تب؟'' ڈائریکٹر نے اپنے آپ سے مطمئن ہو کر ہاتھ سین کی طرف بڑھایا، سین نے باس کی نصیرت کی داد دیتے ہوئے اپنا ہاتھ بھی دوبارہ بڑھا دیا۔

''تھینک یو سر، میں سوچتا ہوں، میں گھر چلا ہی جاؤں گا۔''

''مائی گاڈ، تم تو پورا صاحب ہے! تمہارا وائف بھی تمہارا ماافق میم صاحب تو نہیں ہے نا؟ نہیں تو پورا جوک ہو جائے گا۔'' ڈائریکٹر چلا گیا، لیکن اس کی آخری بات سین کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح بجتی رہی۔ ''تمہاری وائف بھی تمہاری طرح میم صاحب تو نہیں ہے نا؟ آئی ہوپ یور وائف از ناٹ اے میم صاحب، ناٹ اے میم صاحب، ناٹ اے۔''

''میم صاحب۔'' ان کی بیوی؟ لنچ کھانے کے لیے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے سوچنے لگے۔ ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔ کہنے کو تو وہ انگریزی ادب میں ایم اے تھی، مگر وہ اپنے ملک میں ایسے لوگوں سے مل چکے تھے، جو ڈگریوں کی لمبی لائنوں کے باوجود انگریزی ٹھیک سے نہیں بول سکتے تھے۔ زیادہ وور کیا جانا تھا؟ ڈائریکٹر صاحب کو ہی دیکھ لیں؟

☆☆☆

رخصتی کے وقت کافی رونا دھونا ہوتا رہا تھا۔ دلہن تو کار میں بیٹھی دیر تک سسکتی رہی۔ آنکھوں تک گھونگٹ نکلا ہوا تھا اور باقی چہرہ ناک پونچھنے کے لیے لگائے گئے ریشمی رومال سے ڈھکا تھا۔ سین نے پائپ جلایا تو اس نے رومال کو ناک پر اور کس لیا۔ ''تمہیں دھوئیں سے تکلیف تو نہیں؟'' یہی پہلا فقرہ تھا، جو سین نے بیوی سے بولا تھا۔ اس نے انکار میں زوروں سے سر ہلا دیا تھا۔

لنچ کھانے کے لیے سڑک کے کنارے ایک آم کے باغیچے کے پاس انہوں نے موٹر گاڑی روکی۔ ان کی ماں نے دونوں کے لیے الگ الگ لنچ پیکٹ نام لکھ کر دیے تھے۔ جس پر ''سنی'' لکھا تھا، اس میں تھا، بھنا ہوا مرغ اور چیز سینڈوچ، دوسرے میں ابلا ہوا بھات، اچار اور ایک کٹورے میں شوربے والی سبزی، ان کی بیوی نے بھات پر شوربہ انڈیلا اور ہاتھ سے کھانے لگی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے بولے بغیر ہی خاموشی سے کھاتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ان کے چاروں طرف گاؤں کے بچے آ کر جمع ہونے شروع ہو گئے، آتے جاتے راہ گیر بھی رک رک تماش بینوں کی طرح کھڑے ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔ کچھ دیر کے پاس کولہوں پر بیٹھ گئے۔ نو بیاہتا جوڑا تھا سب انہیں تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ سین جانتا تھا، ان دیہاتی لوگوں سے کیسے نپٹنا چاہیے۔ اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''کیا تم لوگ بھوکے ہو؟''

آدمی تو سنتے ہی خاموشی سے کھسک گئے، مگر کچھ شیطان چھوکرے وہیں کے وہیں جمے رہے۔ سین اپنا ہاتھ اٹھا کر گرجا ''بگر آف یو ڈرٹی یاسٹرڈز!'' چھوکروں نے تھوڑی دور پر جا کر سین کی نقل اتارنی شروع کر دی ''بگر آف، بگر آف! ارے ارے، یہ تو صاحب ہیں، بڑا کا صاحب!''

سین نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بیوی سے مسکرا کر کہا۔ ''غیر مہذب زبان کے لیے معاف کرنا۔ ایک سینڈوچ کھا کر دیکھو گی؟ معلوم نہیں تم میٹ کھاتی ہو یا نہیں؟ یہ سلاد اور پنیر والے لے لو۔ بالکل تازے چیڈر چیز کا بنا ہے۔''

مسز سین نے اپنے چکنائی آلود ہاتھوں سے سینڈوچ پکڑ لیا۔ روٹی کی طرح سینڈوچ میں سے

ایک ٹکڑا توڑ کر شوربے میں ڈبویا اور منہ میں ڈالا۔ ایک لقمہ کاٹ کر ہی اس نے چبانا بند کردیا۔ اپنے موٹے چشمے میں سے سین کی طرف ایسے دیکھا، جیسے انہوں نے زہر ہی کھانے کو دے دیا ہو۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ لقمہ اندر نگلا نہ جارہا تھا، اس لیے اس نے باہر تھوک دیا اور دوسری طرف منہ گھما کر اپنا وہی شوربہ بھات کھانے لگی۔

سین نے ہکلاتے ہوئے معافی مانگی ''آئی ایم ڈریڈفلی سوری، چیڈر چیز تمہیں اچھا نہیں لگا۔ مجھے پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا۔''

مسز سین نے اپنا منہ ساڑھی کے پلو سے پونچھا اور پانی مانگا۔ کلی کرکے پانی کے چھینٹے منہ پر بھی مارے۔ منہ کا سارا مزا ہی کرکرا ہوگیا تھا۔ سین نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا ''اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہو تو گاڑی اسٹارٹ کروں؟''

مسز سین نے کٹورے کو کپڑے میں باندھا اور گاڑی کی طرف بڑھیں۔ اندر بیٹھ کر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے چاندی کی ایک ڈبیا نکالی اور پان بنانے لگی۔ ایک پتے میں چونا، کتھا، کٹی سپاری کے کچھ ٹکڑے اور الائچی ڈال کر بیڑہ بنا کر خاوند کی طرف بڑھایا۔

''معاف کرنا، میں پان نہیں کھاتا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اپنا پائپ سلگالوں؟''

مسز سین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بیڑہ اس نے اپنے منہ میں ٹھونس لیا اور مزے سے چبانے لگی۔

وہ وقت پر ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ریسٹ ہاؤس کے بیرے نے سامان سنبھال اور بستر لگا دیا۔ اس نے مسز سین سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔ مسز سین نے اسے صاحب سے پوچھنے کو کہا۔ صاحب نے جواب دیا۔ ''میرے لیے کچھ بھی بنا دو۔ آملیٹ وغیرہ چلے گا۔ میم صاحب سے پوچھ لو وہ کیا پسند کریں گی، تب تک میں ذرا گھوم کر آتا ہوں۔''

''صاحب زیادہ دور مت جایئے گا۔ یہ جنگلی جگہ ہے۔ احتیاط سے گھومیے گا۔ دریا پر جانے کے لیے ایک پگڈنڈی ہے۔ صاحب لوگ مچھلی پکڑنے کے لیے اسی پگڈنڈی کے راستے سے آتے ہیں۔ وہ راستہ صاف ہے۔'' بیرے نے سمجھایا۔

سین نے فوراً خواب گاہ میں جا کر اپنی بیوی سے پوچھنا چاہا کہ کیا وہ اس کے ساتھ ٹہلنے جانا چاہتی ہے۔ دیکھا، وہ اپنا سامان کھول رہی تھی، اس لیے انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ''میں ذرا دریا تک گھومنے جا رہا ہوں۔ بیرے کو بولنا، برآمدے میں سوڈا اور اسکاچ رکھ دے۔ میرے سوٹ کیس میں ایک بوتل رکھی ہے۔ کھانے سے پہلے پی لیں گے۔''

بیوی نے سر ہلا کر ہامی بھر لی۔

مچھیروں کی بستی کو جانے والی پگڈنڈی گھنے درختوں کے درمیان سے ہو کر نکلتی تھی۔ پگڈنڈی دریا کے کنکروں پتھروں سے بھرے کنارے پر جا کر ختم ہوتی تھی، گنگا کا منظر بڑا دلکش تھا۔ دریا کے چوڑے پاٹ پر ٹھنڈا نیلا پانی سورج کی سنہری کرنوں میں چمک رہا تھا۔ مسٹر سین سوچ رہے تھے کہ ایسی پرسکون سنسان جگہ پر کھڑے ہو کر گنگا کی تعریف کرتے ہوئے سادھو سنتوں نے بھی اسے دنیا کے تمام دریاؤں میں سب سے زیادہ پاکیزہ اعلان کیا ہو گا۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ اپنے آریائی آباؤ اجداد کے ساتھ گھل مل گئے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد فطرت کے پجاری تھے۔ وہ سورج کی گرمی کے گیت گاتے تھے۔ پورن چندر کی آرادھنا میں سوم رس پیتے تھے۔ وہ گوشت بھی کھاتے تھے اور پوری جوان کامنیوں کے ساتھ راس رنگ کرتے تھے۔ گنگا تب سے کتنا لمبا سفر کر چکی ہوگی۔ اب تو ہندومت خود ہی گنگا، ندی سا بن گیا ہے، گنگا کے آخری کنارے .....ہگلی دریا سا جس کے کنارے اباد کلکتہ شہر میں ان کا جنم ہوا تھا..... ہردوار، بنارس، الہ آباد، پٹنہ اور ایسے ہی کئی تیرتھ مقامات میں ہزاروں لاکھوں تیرتھ یاتریوں اور دوسرے شہریوں کے ذریعے جلی ہوئی لاشیں وغیرہ پھینکنے کے باعث آلودہ ہوئی گنگا کلکتے تک پہنچتے پہنچتے تو کیچڑ اور گندگی کے ایک ٹھہرا ہوا سا جوہڑ بن کر رہ گئی ہے۔ ہندومت بھی گایوں کے محافظوں، شراب بند کرانے والوں اور پان چبانے والوں کی وراثت بن کر رہ گیا تھا۔ بننے دو، ان کا کیا

جاتا ہے؟ وہ تو سامنے چمکتی اس صاف جل دھارا جیسے قدیم ہندومت کے پجاری تھے۔ اکثریت کا ہندومت تھا بڑی ندی کی طرح..... صدیوں سے چلی آ رہی فرسودہ روایات کی گندگی سے آلودہ۔ وہ پتھریلے راستے پر بڑھتے ہوئے گنگا ندی تک پہنچے۔ ٹھنڈا صاف پانی چلو میں بھرا اور منہ پر چھڑک لیا۔

جنگل کے درختوں کی چھایہ دریا پر لمبی ہو کر پڑنے لگی۔ ٹڈیوں کی آواز سے جنگل گونج رہا تھا۔ سین پیچھے مڑے اور جلدی جلدی اپنے ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھنے لگے۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ شام کو شراب کا وقت ہو چلا تھا۔

برآمدے میں گلاس لگے تھے اور سوڈے کی بوتلیں پاس پڑی تھیں۔ بیرا ہاتھ میں چاپیوں کا گچھا لے کر آیا۔ ''صاحب آپ کا بکس ہم کیسے کھولے گا؟ آپ وہسکی نکال دیجیے صاحب!''

''ارے تم نے میم صاحب کو کیوں نہیں نکالنے کو بولا؟''

بیرے نے گردن جھکالی ''میم صاحب بولا کہ وہ وہسکی کا بوتل چھو نہیں سکتیں۔ ہم کو چابی دے دیا، مگر صاحب آپ کا سامان کو ہم کیسے..... اگر کوئی چیز گم ہو۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، تم ہمارا سوٹ کیس کھولو۔ وہسکی کی بوتل اوپر پڑی ہے لے آؤ اور میم صاحب تیار ہو جائیں، تو ڈنر سرو کر دو۔''

صاف ظاہر تھا کہ بیوی کو اپنے پاس بٹھا کر ساتھ دینے کے لیے کہنا بیکار تھا۔ انہوں نے اپنے لیے اسکاچ کا ایک لمبا پیگ بھرا اور اپنا پائپ سلگا کر بیٹھ گئے۔ ایک بار وہ پھر اپنی زندگی کے اس انوکھے موڑ پر سوچنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ اگر یونیورسٹی کے دنوں میں ملنے والی انگریز لڑکیوں میں سے کسی ایک سے شادی ہو جاتی تو بات کچھ اور ہی ہوتی۔ شادی کے دوران ہی انہوں نے کئی بار ایک دوسرے کو چوما ہوتا۔ شادی کی رات کی تو بات ہی کیا؟ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر جنگل کے بیچوں بیچ بھٹکتے اور دریا کے ساحل پر پریم کرتے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں لیٹتے اور اسکاچ کی چسکیاں لیتے۔ پریم کرتے کرتے وقفے وقفے سے کچھ کھاتے چباتے رہتے۔ اندھیرا ہونے تک پیار کرتے رہتے، تو بھی دل نہ بھرتا۔

وہسکی پینے کے بعد ان کے خون کا دوران بڑھنے لگا۔ تصور طاقت ور ہو اٹھا۔ وہ انگلینڈ میں واپس پہنچنے لگے۔ سامنے پھیلتے اندھیرے اور گھنے جنگل کے سایوں نے ان کی اداسی کو اور بھی گہرا کر دیا۔ اپنے ہی ملک میں وہ اپنی ہی نظروں میں اجنبی سے بن گئی تھے۔

ان کی بیوی آئی اور اپنے بنگالی لہجے میں بولی۔

''یو وانٹ ٹو شٹ آؤٹ شائنڈ؟''

ان کا تصور ٹوٹا اور انہوں نے روکھائی سے پوچھا۔ ''واٹ؟''

''ڈو یو وانٹ ٹو شٹ آؤٹ شائنڈ آر ان شائنڈ؟ داڈ نرز آن دا ٹیبل۔''

ان کا دل پشیمانی سے بھر گیا۔ اگر اس نے ان کے کسی انگریز دوست کے سامنے اس قدر بولا ہوتا، تو وہ کیا سوچتا؟ ''مم وہ، میں ابھی آتا ہوں، تم چلو۔ آئی دل جوائن یو ان اے سیکنڈ۔''

یہ پہلا موقع تھا، جب مسز سین ان سے کچھ بولی تھی۔

ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی ناریل کے تیل کی میٹھی مہک اور گلاب کے پھولوں کی بھینی خوشبو ان کے نتھنوں میں گھسی۔ ان کی بیوی نے سر دھو کر تیل لگایا تھا۔ گھنگھریالے بال اس کی کمر کے نیچے تک لٹک رہے تھے۔ بیاہتا عورت کے سہاگ کی نشانی سیندور مانگ میں بھرا تھا۔ جسم گلاب کے عطر سے مہک رہا تھا۔ ضرور اس کی ماں نے سمجھایا ہوگا۔ میز پر وہ صبر کے ساتھ بیٹھی رہی۔ ہندو عورت تھی، خاوند جب تک نہ کھائے، وہ کیسے کھانا شروع کر سکتی تھی۔

''سوری، تمہیں انتظار کرایا۔ تمہیں کھانا شروع کر دینا چاہیے تھا۔ تمہارا کھانا تو ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔''

اس نے صرف سر ہلا دیا۔ ان دونوں نے کھانا شروع کیا انہوں نے اپنے آملیٹ اور ملھن لگی ڈبل روٹی کو کانٹے چھری سے اور اس نے بھات، دال اور ترکاری کو انگلیوں سے! بات چیت شروع کرنے کے لیے سین نے کئی بار کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا لیکن ہر بار بیوی کے موٹے چشمے کے پیچھے پھیلی خالی نظروں کو دیکھ کر انہیں لگا کہ سب بیکار ہوگا، وہ کچھ سمجھ نہیں پائے گی۔

ان کے دوستوں کو معلوم ہوا تو وہ ان پر ہنسیں گے۔ ''اوہ، سنی سین، ارے وہ اپنی بیوی سے بات کیسے شروع کرے گا؟ کسی نے بیوی کا اس سے تعارف کرایا ہی نہیں۔ بھئی، جانتے نہیں، وہ انگریز ہے۔''

ڈنر خاموشی میں ہی ختم ہو گیا۔ کلیانی سین نے ہلکے سے ڈکار اور اپنا پاندان نکال کر بیٹھ گئی۔ ایک بیڑہ بنایا اور لمحہ بھر کو کچھ سوچا اور بیڑہ منہ میں بھر لیا۔ سنی نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ ہنی مون پر اپنے قیمتی سوانا سگار پئیں گے۔ اپنے لمبے سگاردان میں سے ایک سگار نکال کر انہوں نے اس کی نچلی طرف سے سونے کے کلپ سے چھید کر لیا اور سلگا لیا۔ سگار کے خوشبودار دھوئیں سے کھانے کا کمرہ بھر گیا۔ اب کی بار کلیانی نے منہ پر ساڑھی کا پلو نہیں رکھا۔ بس صرف انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر منہ کے قریب اس طرح رکھیں کہ نتھنوں میں دھوئیں کی بو بھی نہ جائے اور سین صاحب کو برا بھی نہ لگے۔

وہ دونوں میز پر چپ چاپ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ سین کو لگا کہ وہ پان چباتی ہوئی بالکل جگالی کرتی ہوئی گائے کی طرح لگ رہی ہے۔ وہ پھر اپنا سگار پینے میں لگ گئے۔ بڑی مشکل حالت تھی۔ دونوں کے درمیان کی کھائی ناقابل عبور! سین نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''نیوز'' وہ ذرا اونچی آواز میں بولے نیوز مس نہیں کرنا چاہیے۔ وہ خواب گاہ میں جا کر اپنا ٹرانسسٹر لے آئے۔

کمرے میں دو پلنگ لگے تھے، ایک ساتھ ملے ہوئے۔ تکیے تقریباً ایک دوسرے کی ہم آغوشی کرتے ہوئے سے، چادروں پر خس کی خوشبو چھڑکی ہوئی تھی، جیسے انہیں بھی سویرے کامیاب شادی کی تکمیل کو دیکھنے کا انتظار تھا۔ سین سوچ رہے تھے کہ اسے وہ سب تیاری کرنے کا خیال ہی کیونکر آیا، جب کہ ابھی تک ان کا آپس میں تعارف بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہوا ہے۔ بس دو چار معمولی باتیں ہی ہوئی تھیں۔ اپنا ریڈیو اٹھا کر وہ تیزی سے کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

دہلی اسٹیشن لگایا۔ بیرا میز صاف کرتا رہا۔ وہ خبریں سنتے رہے۔

''گڈ نائٹ سر۔'' بیرا سلام کر کے چلا گیا۔

مسز سین بھی اٹھیں۔ اپنا پاندان اٹھایا اور خواب گاہ میں چلی گئیں۔ پندرہ منٹ کی خبروں کے بعد کھیلوں پر کمنٹری شروع ہوئی۔ سین نے آگے پیچھے کبھی نہیں سنی تھی مگر انہیں خوشی تھی کہ انہوں نے کمنٹری سننے کا حوصلہ بنائے رکھا تھا کیونکہ اس کے بعد ہی پروگرام میں کچھ تبدیلی ہونے کا اعلان ہوا تھا، یعنی کہ استاد بڑے غلام علی خان کے سنگیت کی بجائے دہلی سے ''چیک فلہار منک آرکسٹرا'' ریلے ہونے والا تھا۔

بھارتی موسیقی میں غلام علی خاں سب سے بڑا نام تھا، یہاں تک کہ انگریزی شدہ ہندوستانی بھی ان کے سنگیت کی تعریف کرنے کا دم بھرتے تھے۔ غیر ملکی حکمران بھی اس عظیم موسیقار کی محفلوں میں چار چار گھنٹے صبر کے ساتھ بیٹھے رہتے کہ کہیں ان کے ہندوستانی میزبان برا نہ مان لیں، یا دوسرے سفارت خانوں کے سفیروں کے بجائے انہیں کم مہذب نہ سمجھ بیٹھیں۔ ''چیک فلہارمنک'' ہندوستان میں پہلی بار آئے تھے اور دہلی کی ''یورپین میوزک سوسائٹی'' والوں کو ان کے ساتھ پوری کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ کتنے افسوس کی بات تھی، ایسے موقع پر وہ دہلی میں نہیں تھے۔ کھانے کے بعد سنگیت کی محفل کا پروگرام رکھتے۔ وہ سوچنے لگے کہ ایسی پارٹی میں ان کی بیوی بھلا کس طرح جچتی!

ریڈیو پر تالیوں کی گڑگڑاہٹ سنی، اس کے بعد اعلان ہوا کہ، پروگرام کا آغاز ''سمیتانا'' کے داہارڈ برانڈ سے ہوگا۔ سین ''کانونیٹ گارڈن'' اور ''فیسٹیول ہال'' میں گزاری شاندار شاموں کی یادوں میں بھٹکنے لگے۔ ''سمیتانا'' کے بعد باری آئی ''بارتوک'' کی بیچ بیچ میں بجنے والی تالیاں ہی جادو کے اثر کو توڑ جاتیں۔ ان بے چارے اناڑی ہندوستانیوں کو کون سمجھائے کہ تالیاں آخر میں بجائی جاتی ہیں، بیچ بیچ میں نہیں۔

درمیان چھ منٹ کا وقفہ ہوا۔ اختتام ہوا سین کے من پسند ''ڈوارکس سمفونی'' نمبر پانچ سے۔ انہوں نے اپنے لیے وی ایس او پی برانڈی گلاس میں انڈیلی ایک کرسی سامنے کھینچی اور پاؤں پسار کر کرسی میں لیٹ سے گئے۔ ''ڈوارک'' کو اتنی اچھی طرح تو انہوں نے انگلینڈ

میں بھی نہیں سنا تھا۔ منہ میں کیوبن سگار، اتنی بڑھیا ''کاگنگ'' شراب اور دنیا کا سب سے بہترین سنگیت۔ آدمی کو اور کیا چاہیے؟ انہوں نے اپنے سگار کی راکھ جھاڑی اور آرام کرسی میں لیٹے لیٹے مزے کی حالت میں آنکھیں موندے پڑے رہے۔ جلتا ہوا سگار ہونٹوں میں دبائے ہی گہری نیند میں سو گئے۔

نہ تو سنگیت کی محفل کا اختتام اور نہ ہی ریڈیو گڑگڑاہٹ انہیں نیند سے جگا سکی۔ سگار جب انہیں زیادہ گرم لگا تو ان کے ہونٹ کھلے اور وہ ان کی گود میں گر پڑا۔ آہستہ آہستہ جلتے ہوئے سگار سے ان کی پتلون جلنے لگی۔ وہ گھبرا کر جاگے اور انہوں نے سگار کے ٹکڑے کو اٹھا کر جلدی جلدی زمین پر پھینکا۔ ویسے تو پتلون زیادہ نہیں جلی تھی۔ فلائی بٹن کے پاس فقط ایک چھید ہی ہوا تھا، مگر سارے کمرے میں جلے ہوئے کپڑے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سین نے سوچا کہ بال بال بچے۔ ٹرانزسٹر بند کر کے انہوں نے گھڑی دیکھی۔ آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو گیا تھا۔ بتی بجھا کر وہ اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔

پلنگ کے پاس میز پر لیمپ اب بھی جل رہا تھا۔ لگتا تھا ان کی بیوی ان کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے اور نہ زیور اتارے تھے۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ آنسوؤں سے بہہ کر کاجل گالوں تک آ گیا تھا۔ تکیہ بھی کاجل سے آلودہ تھا۔

پاجامہ تبدیل کر کے سین اپنے بستر میں گھس گئے۔ بیوی کے اٹھتے گرتے سینے کی طرف دیکھا، اس کے منہ کی طرف بھی نہیں۔ ان کی ذرا بھی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ انہوں نے لیمپ کی بتی بجھا دی۔ بتی کی زرد لو نیلی ہوئی پھر دو ایک بار پھڑ پھڑا کر اور سارے کمرے کو اندھیرے میں ڈبوتی ہوئی غائب ہو گئی۔

سویرے بیرا چائے کی ٹرے کے ساتھ آیا اور انہیں جگانے لگا ''صاحب، نو بج چکے ہیں۔ میم صاحب کو اٹھے تو چار پانچ گھنٹے ہو گئے۔ وہ نہا چکی ہیں، آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔''

سین نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ دھوپ برآمدے میں سے ہوتی ہوئی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ بیوی نے اپنا بستر گول کر کے اسٹیل کے ٹرنک کے اوپر جما دیا تھا۔ اٹھتے ہوئے وہ بولے۔ ''میری چائے برآمدے میں لے آنا۔'' غسل خانے میں جا کر انہوں نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور باہر نکل آئے۔

''سوری، نو کیپ یو ویٹنگ میں ہمیشہ تمہیں انتظار کراتا رہتا ہوں۔ معاف کرنا۔ مگر تمہیں میری راہ نہیں دیکھنی چاہیے۔'' جمائی لیتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

ابھی وہ چھت کی طرف ہی تک رہے تھے کہ ان کی بیوی اٹھی اور بڑھ کر ان کے پاؤں چھونے لگی۔ وہ اس کے شوہر تھے، سوری! گھبرا کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ گالوں پر آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔ پلکیں اٹھا کر کچھ سوالیہ اور کچھ خوف زدہ آواز میں وہ بولی۔ ''میں آپ کے قابل نہیں!'' اور ان کا جواب سننے سے پہلے ہی ساڑھی کا پلو آنکھوں پر رکھ کر وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔

''یہ بھی کیا بلا ہے۔'' بڑبڑاتے ہوئے سین کرسی میں دھنس گئے۔ سمجھ تو گئے تھے کہ اس کا مقصد کیا ہے! دھوکے میں چمکتے دالان کے خلا میں نظر مرکوز کر کے وہ دیر تک سوچتے رہے۔ تب بھی دل میں خواہش نہ ہوئی کہ اندر جا کر بیوی کو منا لیں۔

بیرا آیا۔ چائے کی ٹرے بغیر چھوئے ہی دیکھ کر اسے اچھا نہیں لگا۔ خیر بتا گیا کہ ناشتا میز پر لگ چکا ہے۔ سین بے دلی سے اٹھے، جانتے تھے کہ وہ کھانے نہیں آئے گی جب تک کہ وہ اسے منا کر نہیں لاتے اور ایسا کرنے کا ان کا قطعی ارادہ نہیں تھا، لیکن وہ غلط ثابت ہوئے۔ وہ تو پہلے سے ہی میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے کترانے لگے۔

''چائے؟'' انہوں نے اس کا کپ بھر دیا، پھر اپنا بھی ایک بار پھر انہوں نے اپنی اپنی طرح کا ناشتا اپنے اپنے طریقے سے بغیر ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی بولے خاموشی سے ختم کر لیا۔ ناشتا ختم ہوتے ہی اس نے اپنا پان لیا اور انہوں نے اپنا پائپ۔ وہ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی اور وہ اپنا ٹرانزسٹر لے کر صبح کی خبریں سننے برآمدے میں۔

دوپہر کو ڈاکیے کو دیکھا تو انہیں ایک ترکیب سوجھی۔ لفافہ دفتر کی طرف سے آیا تھا۔ ان کی پندرہ

دنوں کی چھٹی منظور ہو گئی تھی، مگر سین لفافے کو لے کر بیوی کے پاس آئے۔ لفافے کے اوپر لکھا تھا ''بھارت سرکار کی سیوا میں'' بیوی سے بولے ''ہم لوگوں کو ابھی لوٹنا پڑے گا۔ منسٹری سے ضروری خط آیا ہے۔ پارلیمنٹ میں انہوں نے ہمارے محکمے سے متعلقہ کچھ باتوں کی جواب دہی کرنی ہے۔ میں بیرے کو بھیجتا ہوں کہ سامان باندھنے میں تمہاری مدد کرے۔ تب تک میں کار کو ذرا چیک کرلوں۔'' وہ باہر نکل آئے ''بیرا، بیرا۔''

آدھے گھنٹے کے اندر ہی ان کی کار دہلی جانے والی سڑک پر تھی۔

شام ہونے سے پہلے ہی سین اپنے گھر پورٹیکو میں جا کر رکے۔ ماں اور بیٹے نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور تب الگ ہوئے، جب دلہن ساس کے پاؤں چھونے آگے بڑھی۔ بہو کے کندھوں کو چھوتے ہوئے ساس نے آشیرواد دیا ''بھگوان، سکھی رکھے بیٹی...... مگر اتنی جلدی......!''

بیٹے نے جب سے لفافہ نکال کر دکھایا۔ ''وزیر صاحب نے بلا بھیجا۔ ان لوگوں کو کسی کی ذاتی زندگی کی کیا پروا؟ بس، آنا پڑا۔''

''اچھا، اچھا۔'' آنسو پونچھتے ہوئے ماں بولی۔ ''بہو، تمہارے ماں باپ خوش ہوں گے کہ تم لوگ لوٹ آئے، ایک بار ان کو فون کرلو۔''

تھوڑی ہی دیر میں مسز سین کے ماں باپ ٹیکسی سے پہنچ گئے۔ ملنے پر دوبارہ رونا دھونا پڑا۔ وزیر صاحب کے بلانے کی ایک اور توضیح! مگر انہیں تسلی تھی لڑکی خاوند کے ساتھ ایک رات گزار چکی تھی۔ بیاہ مکمل ہو گیا تھا۔ اب تو کچھ دنوں کے لیے وہ اپنے ماں باپ کے گھر جا سکتی تھی، اس لیے وہ کلیانی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

اگلا دن سین نے کتابوں کی دکانوں اور کافی ہاؤسز میں گھوم پھر کر کاٹا۔ ایسے ہی ہفتہ ختم ہو گیا۔ اتوار کو جب ماں پوجا میں مصروف تھیں، سین نے ڈائریکٹر د نمبر! بابا، بر کام پر لوٹنے کی تاکید کی۔ ''ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے جلد لوٹنا پڑا۔ اتنے دن ان کو اکیلے چھوڑنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔''

وہ جانتے تھے کہ یہی کہہ کر ڈائریکٹر کا تعاون اور منظوری حاصل کی جاسکتی ہے۔ ڈائریکٹر نے ان کے بارے میں ہمدردی ظاہر کی اور بیوہ ماں کے بارے میں ایک ہندو بیٹے کا فرض نبھانے کے لیے ان کی تعریف بھی کی۔ وہ بولے ''اچھا بھئی، جیسے ہی تمہاری ماتا جی ٹھیک ہو جائیں، تمہاری شادی کی دعوت ضرور لیں گے اور تمہاری بیوی سے ملاقات......''

''یس سر، جیسے ہی وہ ٹھیک ہو جاتی ہیں، ہم آپ کو نیوتا دیں گے۔''

ماں کی بیماری کا بہانہ بنا کر سین اپنی چھٹی رد کرنے کی کیفیت دیتے رہے اور اسی طرح پارٹی کو بھی ٹالتے رہے۔ سنتا سنگھ نے سین کے سہارے کافی موج مستی اور اودھم مچانے کی سوچی ہوئی تھی، بے چارہ وہ بھی مایوس ہو گا۔

دن گزرے اور پھر ہفتے۔ کلیانی وقفے وقفے سے اپنا کچھ سامان لینے اپنی ماں کے ساتھ آتی رہی۔ وہ تب ہی آتی، جب سین گھر نہیں ہوتے۔ صرف ساس سے مل کر چلی جاتی۔ مسز سین پر ظاہر کر دیا گیا تھا کہ ایسی حالت میں خاوند ہی بیوی کے ماں باپ سے گھر جا کر اسے واپس لاتا ہے۔ لیکن سین کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹالتے رہے اور ایک دن اچانک ہی جنوبی بھارت کے دورے پر نکل گئے۔ واپس آنے کے پندرہ دنوں تک بھی لڑکی کے ماں باپ کو ان کے لوٹنے کی خبر نہ لگی۔ دونوں خاندانوں کے درمیان تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے گئے۔ کسی نے کچھ صاف صاف تو نہیں کہا مگر لوگوں میں بات پھیلنے لگی کہ سین خاندان کو تو بھاری جہیز کی امید تھی۔ سین کی ماں نے شاید لڑکی کو تنگ کرتی تھی۔ ایک دن سین کو اپنے سسر کا ایک خط ملا۔ زبان نرم تھی، مگر مایوس کن! لگتا تھا کسی وکیل سے مشورہ کر کے ہی خط لکھا گیا ہے۔ ضرورت کے لیے ایک نقل بھی منسلک تھی۔ ساری تفصیل دی گئی تھی کہ کس طرح شادی کے اشتہار کے ذریعے شادی طے ہوئی تھی۔ سگائی اور شادی پر کتنا خرچ آیا اور فاریسٹس ریسٹ ہاؤس میں سہاگ رات منائی گئی۔ سین سے پوچھا گیا تھا کہ وہ اپنی مرضی صاف صاف ظاہر کریں۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

فہرست کتب

عمران ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلے

مہارانی
۴ حصوں پر مشتمل عمران ڈائجسٹ کا ایک مقبول سلسلہ، مہارانی کی ناقابلِ فراموش سچائیاں، چمارن کی داستان
قیمت فی حصہ 75 روپے مکمل سیٹ 225 روپے

نروان کی تلاش
۳ حصوں پر مشتمل ایک قابلِ فراموش اور غضب ڈھانے والا پُراسرار سلسلہ
قیمت فی حصہ 40/- روپے مکمل سیٹ 80/- روپے

کوبرا
۳ حصوں پر مشتمل غضب ڈھانے والا ایک پُراسرار سلسلہ، بمبئی کے فٹ پاتھ سے اُٹھنے والا طوفان کوبرا
فی حصہ 35/- روپے مکمل سیٹ ؟٥/- روپے

طوفان
۲ حصوں پر مشتمل مکمل سلسلہ، وہ طوفان تھا، اس سے مقابلہ کرنے کی ہمت کسی میں نہ تھی، آخر کیوں؟
فی حصہ 30 روپے مکمل سیٹ 60/- روپے

سلابو
۲ حصوں پر مشتمل حیرت انگیز واقعات سے پُر ایک عجیب و غریب سلسلہ
فی حصہ 40/- روپے مکمل سیٹ 80/- روپے

اپسرا
۲ حصوں پر مشتمل مکمل سلسلہ، کیا وہ واقعی اپسرا تھی، آخر کون تھی، کیا تھی جس نے تہلکہ مچا رکھا تھا، اس نے کیا کیا گل کھلائے
فی حصہ 40/- روپے مکمل سیٹ 80/- روپے

پُراسرار علوم کا ماہر
۲ حصوں پر مشتمل پُراسرار شخص کی داستان اس کی اپنی زبان سے،
حصہ اول /- روپے حصہ دوم /- روپے
مکمل سیٹ /- روپے

ایئر ہوسٹس
۲ حصوں پر مشتمل انوکھا سلسلہ، ایک حسین و جمیل فضائی میزبان کی زندگی کو پیش آنے والے انوکھے پُراسرار واقعات، رنگ بدلتے چہروں کی کہانی
فی حصہ /- روپے مکمل سیٹ /- روپے

راجکماری
۴ حصوں پر مشتمل دلفریب سلسلہ، وہ جوان تھی، خوبصورت تھی، رعنائی اور دلربائی اس کے انگ انگ میں رچی ہوئی تھی، اس روپ میں اس کا پیچھا کرنے والا موجود تھا
فی حصہ /- روپے مکمل سیٹ /- روپے

مہاراجہ
وہ شیر سے زیادہ خوفناک تھا، ایک مہاراجہ کی دل ہلا دینے والی حرکتوں کی ایک عبرت ناک داستان
ایک حصہ میں مکمل قیمت /- روپے

چمپا کلی
مہارانی کی طرح چالاک چمپا کلی کی داستان کیا کیا گل کھلائے، ضرور پڑھیے
ایک حصہ میں مکمل قیمت /- روپے

پُراسرار قوتوں کی ماہر
عمران ڈائجسٹ کا وہ مقبول سلسلہ جس کو قارئین کے اصرار پر کتابی شکل میں چھاپا گیا، ایک حصہ میں مکمل
قیمت /- روپے

سلاسیہ
ایک پُراسرار شخص کی عبرت ناک داستان جسے آپ پڑھے بغیر نہ رہ سکیں گے، ایک حصہ میں مکمل
قیمت /- روپے

اُس کا سایہ
پیچھا کرنے والا وہ سایہ کون تھا وہ آخر کس کا سایہ تھا، ایک دن؟
ایک حصہ میں مکمل قیمت /- روپے

وحشی
فریب دینے والوں کے لیے پُر فریب داستان اور عبرتناک انجام، جرم کے انوکھے انداز اس وحشی کا معمول تھا
مکمل ایک حصہ قیمت /- روپے

سیاہ نیولا
وہ سیاہ نیولا جس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی تھیں، ایک دن جب دیواریں ٹکڑوں میں بٹ گئیں
مکمل ایک حصہ قیمت /- روپے

بانگڑو
وہ کیا تھا؟ وہ کون تھا؟ لسے بانگڑو کیوں کہتے تھے، ایک حیرت انگیز کتاب
ایک حصہ میں مکمل قیمت روپے

ترسول کنڈ کی داسی
ترسول کنڈ کیا تھا اور اس کی داسی کی حرکتیں کیا تھیں، حیرت انگیز اور دلچسپ کتاب
قیمت صرف روپے

ماضی کے جزیرے
ناقابلِ فراموش کہانی جس کا ایک ایک لفظ رونگٹے کھڑے کر دے گا یہ کیسا طلسم خانہ تھا جس میں موجود مجسمے زندہ تھے،
ایک حصہ میں مکمل قیمت روپے

صمورالہ
حسین چہرہ شاطر آنکھیں دلفریب انداز اگر کہیں وہ حسین دوشیزہ نظر آجائے تو اسے پانے کی آرزو زندگی میں بے چین رکھے گی
ایک حصہ میں مکمل قیمت روپے

ماضی کی کہر
سازشوں کی داستان، ایک نوجوان نے جب نئی دنیا میں آنکھ کھولی تو حیران رہ گیا
ایک حصہ میں مکمل قیمت روپے

جلاوطن
عمران ڈائجسٹ کی مشہور سلسلہ وار پُراسرار کہانی، اجنبی سیارے سے زمین پر آنے والے ایک فرد کی سرگزشت
ایک حصہ میں مکمل قیمت۔ روپے

نی تیکا
ایک دل ہلا دینے والے سفر کی حیرت انگیز داستان، ایک حساس نوجوان کی آپ بیتی
ایک حصہ میں مکمل قیمت۔ روپے

حیرت انگیز کہانیاں
۵۰ مختصر حیرت انگیز کہانیوں کا زبردست انتخاب، ایک ایک کہانی حیرت میں ڈال دے گی، حیرت انگیز کتاب کی قیمت صرف روپے

سنہری آفت
ایک ایسی کتاب جسے آپ مدتوں فراموش نہ کر سکیں گے، ضرور پڑھیں
قیمت روپے

موت کے پیامبر
جنہیں موت کے پیامبر کہا گیا، وہ کون تھے؟ کیا آپ جانتے ہیں ضرور پڑھیں
قیمت صرف روپے

کٹاری
ایک ایسی شوخ و شنگ اور انگ انگ بھری عورت کی داستان جس کا نام کٹاری تھا، کٹاری کے تیکھے تیکھے نوکیلے واقعات
قیمت روپے

انسانوں کے سوداگر
بین الاقوامی بردہ فروشوں کے ایک گروہ کی ہولناک داستان ضرور پڑھیں
قیمت روپے

شیطانوں کا شہر
قتل در قتل، قدم قدم پر ہنگامے فتنے وہ کوئی شہر تھا، ضرور پڑھیں
قیمت /- روپے

ترکش
ایم اے راحت کا مقبول ترین سلسلہ مکمل چھ حصوں کی قیمت 300/- روپے
فی حصہ 50/- روپے

گوندنی
مہارانی کا دوسرا جنم، گوندنی ایک ایسی معصوم لڑکی کی کہانی جس سے اس کا سب کچھ چھین لیا گیا تھا
ایک حصہ میں مکمل قیمت روپے

پیاسا
ایک ایسے شخص کی آپ بیتی جس نے زندگی کو عجیب انداز سے دیکھا، جو پیاسا تھا، ۲ حصوں میں مکمل
قیمت فی حصہ /- روپے مکمل سیٹ /- روپے

مکتبۂ عمران ڈائجسٹ، ۳۷۔ اُردو بازار کراچی ۷۴۲۰۰

پہلی بار سین کو لگا کہ معاملہ سنجیدہ ہو چلا ہے۔ وہ ماں کی طرف مڑا۔ ماں بیٹے کے تعلق نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔

ماں نے کہا۔ ''یہ ہمارے لیے بڑی شرمناک بات ہے۔ بات کو زیادہ نہیں بڑھانا چاہیے۔ اب تم جا کر اسے لے ہی آؤ۔ میرا کیا، میں کچھ دنوں کے لیے ڈیرہ دون چلی جاؤں گی، بھائی کے پاس۔''

''نہیں نہیں، ماں میں کسی کو تمہارے اوپر انگلی نہیں اٹھانے دوں گا اور تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی۔''

''ارے بیٹا، کسی نے مجھ پر کوئی الزام نہیں لگایا اور نہ ہی میں تمہیں چھوڑ کر کہیں جا رہی ہوں۔ میرا گھر تو یہی ہے۔ اپنے خون کو چھوڑ کر بھلا میں اور کہاں رہ سکتی ہوں! لیکن تم اپنی بیوی کو ضرور لے آؤ۔ اب اس کو مالکن کے حق سے اپنا گھر سنبھالنے دو۔ میں بعد میں آ جاؤں گی۔ خرید و فروخت، نوکر چاکروں کے جھنجٹ سے فارغ ہو کر تب آرام سے رہوں گی۔''

سین تھک کر پھر اپنی کرسی میں سمٹ گئے۔ پیچھے سے آ کر ماں نے ان کا سر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''تم کوئی فکر نہ کرو بیٹا، میں بھائی کو دیکھ کر کہتی ہوں کہ مجھے لے جائے۔ وہی تمہارے سسر جی کے پاس بھی ہو آئے گا اور تمہاری بیوی کو لے آئے گا۔ جانے سے پہلے میں اسے سب کچھ سمجھا دوں گی اور چابیاں بھی سونپ دوں گی۔ نوکروں چاکروں کو بھی بتا دوں گی کہ اب وہی ان کی مالکن ہے۔ جب تم دفتر سے لوٹو گے تو دیکھو گے کہ سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔'' اس نے بیٹے کا سر چوما ''ارے بیٹا، اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا۔ بچی ہی تو ہے ابھی۔ تم کو معلوم نہیں کہ میری کتنی خواہش ہے کہ تمہارے بچوں کو گود میں کھلاؤں۔''

سین کو یہ سب تماشا بالکل پسند نہ آیا۔ انہیں اپنے آپ پر ہی غصہ آیا کہ ایسی نوبت آنے ہی کیوں دی؟ اپنی بیوی پر تو اور بھی زیادہ کہ اسی کی وجہ سے ماں کو یہ شرمندگی اٹھانی پڑ رہی ہے اور اپنا گھر چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔ اگر وہ ماں کو نہیں رکھے گی، تو وہ بھی اس سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ انہوں نے خانساماں کو سمجھا دیا کہ بیڈ روم میں سامان کس طرح لگانا ہے۔ اگر نئی مالکن کچھ پوچھیں تو کہہ دینا کہ صاحب ایسا ہی کرنے کو کہہ کر گئے ہیں۔

سوموار کو صبح جب بیرا چائے لے کر آیا، انہوں نے اسے کہا کہ لنچ کے لیے ان کی راہ نہ دیکھی جائے اور وہ میم صاحب سے کہہ دے کہ رات کو کھانے کے لیے بھی ان کا انتظار نہ کرے، کیونکہ وہ دفتر میں دیر تک بیٹھے کام کرتے رہیں گے۔ ناشتا انہوں نے ماں اور ماما کے ساتھ بیٹھ کر کیا تھا۔ ماں سے وعدہ بھی کیا کہ وہ اسے یہاں کے بارے میں لکھتے رہیں گے۔

ماں نے جانے سے پہلے انہیں جھڑک کر سمجھایا ''تم کو اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی پرورش دوسرے طریقے سے ہوئی ہے، مگر پیار اور حوصلے سے سب کچھ جیتا جا سکتا ہے۔''

سب کے جانے کے بعد بھی سین دفتر میں بیٹھے رہے۔ پھر سیدھے جم خانہ کلب کی طرف چل پڑے۔ گھنٹہ بھر سوئمنگ پول کے پاس بیٹھے بیئر پیتے رہے اور تیرنے والوں کو دیکھتے رہے۔ تیرنے والوں میں یورپین لوگوں کی بیویاں اور بچے تھے۔ پونی ٹیل میں بندھے بالوں اور بکینیوں میں خوب صورت پنجابی لڑکیاں تھیں۔ ڈائیونگ بورڈ سے چھلانگیں لگاتے ٹارزن ایسے جسم والے کالج کے سانولے سلونے جوان چھوکرے تھے۔ کاش ان میں سے کسی لڑکی سے اس کی شادی ہوئی ہوتی! یہ جوامر یکن انداز میں چیں چیں کر کے بول رہی ہے، اسے وہ اچھی طرح انگریزی بولنا سکھاتے۔

تیرا کی بھی گھر چلے گئے۔ سین نے لمبی آہ بھری اور اٹھ کر ''بار'' میں چلے گئے۔ وہاں کتنے ہی پرانے دوستوں نے انہیں گھیر لیا۔ ''ہائے سنی، یو اولڈ باسٹرڈ! یہ کیا سن رہے ہیں تمہارے بارے میں!''

سنی مسکرایا۔ ''اب کیا گلا پھاڑ پھاڑ کر لوگوں کو بتانا ضروری ہے کہ.....''

ان میں سے تین دوست آگے بڑھے۔ ''ہمیں ڈرنک کرانا تمہیں بنتا ہے۔ نہیں تو ابھی ننگا کر کے

تمہیں عورتوں کے سامنے۔''

''اے وہیں ٹھہرو، بیرا، ان بلڈی فولز کو دے دو جو مانگتے ہیں۔'' دوست بہت اونچے اسٹولوں پر بیٹھ کر چیئر کرتے ہوئے ''باس اپ'' کرنے لگے۔

''ارے بیوی کہاں ہے تمہاری؟'' ایک نے پوچھا۔

''یہ تو نہیں کر رہے ہو کہ تم بھی اسے دوسرے ہندوستانیوں کی طرح پردے میں رکھتے ہو۔''

''ارے نہیں، ایسی بات نہیں۔ وہ اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی ہے اور ایک آدھ پیگ لو یار۔''

وہ لوگ ایک کے بعد دوسرا پیگ چڑھاتے گئے، جب تک کہ ''بار'' بند نہیں ہوگئی۔ ان میں سے ایک نے سین کو اپنے گھر کھانے کی دعوت بھی دی۔ سین نے خاموشی سے منظور کر لی۔

رات کو تقریباً ایک بجے سین گھر لوٹے۔ پیے ہوئے ہونے کی آڑ میں کسی بھی طرح کے حالات کا سامنا کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ہال کمرے کی بتی جلائی۔ دیوار کے سہارے بکسوں کی قطار لگی تھی۔ تو ان کی بیوی واپس پہنچ چکی ہے! اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ تو کئی گھنٹے پہلے ہی سو گئی ہوگی۔ ہال کی بتی بند کر کے وہ دبے پاؤں آہستہ آہستہ اپنے سونے کے کمرے میں گئے، ٹیبل لیمپ جلایا، دروازہ اندر سے بند کیا اور گہری نیند میں سو گئے۔

بیرے کے دروازے کھٹکھٹانے پر ان کی نیند کھلی۔ دروازہ کھولنے کے لیے جاتے ہوئے ان کا سر گھومنے لگا۔ بیرا کیا سوچے گا، صاحب اکیلے ہی اندر سے دروازہ بند کیے پڑے تھے اور میم صاحب الگ سو رہی تھیں۔ اب جو سوچتا ہے، سوچنے دو، وہ کیا کریں؟ ابھی تو ان کا سر ویسے ہی گھوم رہا ہے۔

''صاحب میم صاحب کے لیے چائے لے آؤں۔'' بیرے نے پوچھا۔

''وہ بیڈ ٹی نہیں پئیں مگر وہ ابھی تک اٹھیں نہیں کیا؟''

''نہیں جانتا، صاحب، وہ بھی دروازہ اندر سے بند کیے ہیں۔''

سین کو ذرا سی بے چینی لگی۔ چائے کے کپ کے ساتھ ایک دو اسپرین کی گولیاں نگل کر وہ اپنے بستر پر دوبارہ لیٹ گئے۔ اسپرین کو تھوڑا اثر کرنے دو۔ ان کا تصور دور تک دوڑنے لگا۔ نہیں، نہیں، وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔ شاید رات دیر گئے تک ان کا انتظار کرتی رہی ہوگی۔ اکیلے ہونے کے باعث خوف سے دروازہ اندر سے بند کر لیا ہوگا۔ دیر سے سونے کے باعث ہی ابھی تک نہیں اٹھی ہوگی، لیکن وہ اس کے ساتھ کتنی سنگدلی کے ساتھ پیش آتے رہے تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے.....! معلوم تو کرنا چاہیے۔ وہ اٹھے اور اس کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ غسل خانہ کی طرف گئے۔ ادھر بھی وہ نہیں تھی۔ ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ وہ کھڑکی کے پاس گیا اور انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس پر دھکا مارا۔ دروازہ کھل کر دیوار سے جا لگا۔ اس کا شور سن کر بھی وہ نہیں اٹھی۔ انہوں نے اندر جھانک کر دیکھا.....اس کا چشمہ ناک پر ٹکا تھا۔

زور سے چیخ مار کر سین گھر کے اندر بھاگے اور بیرے کو بلانے لگے۔ نوکر اور مالک نے مل کر کندھوں سے دروازے پر زور لگایا اور کنڈی ٹوٹ گئی۔ دروازہ کھلتے ہی دونوں کمرے کے اندر دوڑے۔ بستر پر لیٹی عورت بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کے منہ سے سفید رنگ کا جھاگ بہہ رہا تھا۔ موٹے چشمے میں سے اس کی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ سین نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ پہلی ہی بار وہ اپنی بیوی کو چھو رہے تھے، جبکہ وہ مر چکی تھی۔

اس کے پلنگ کے بغل میں تپائی پر ایک خالی گلاس اور دو لفافے پڑے تھے۔ ایک پر بنگلہ میں اس کی ماں کا نام لکھا تھا اور دوسرے پر ان کا۔ ایک زخمی سی مسکراہٹ ان کے چہرے پر پھیل گئی، جب انہوں نے پڑھا ''خدمت میں.....شری ایس سین صاحب!''

☆☆

مرجان

مس صبا بہار

جہاں دنیا معاشرتی ترقی کے عروج کو چھو رہی ہے وہاں دوسری جانب کچھ معاشرے ایسے ہیں جو اپنے آباؤ اجداد کی چند جاہلانہ رسم و رواج کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ونی بھی اس قسم کی ہی ایک لعنت ہے جو ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔ یہ وہ رسم ہے کہ جس میں عورت ذات کی بطور سزا شادی کردی جاتی ہے۔ یہ سزا اس کو اپنے بھائی، باپ یا خاندان کے کسی اور مرد کے جرم کرنے کی صورت میں ملتی ہے۔ اس سزا کا فیصلہ علاقے کے مقتدر لوگ اپنی خود ساختہ عدالت میں کرتے ہیں۔

ایک معصوم بچی جسے اس ظالمانہ رسم کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ اس کی ماں اپنی معصوم بچی کو اس ظلم سے بچانے کی کوشش کرتی ہے لیکن اسے بے دردی سے قتل کردیا جاتا ہے۔ پھر مردوں کے اس بے رحم معاشرے میں ایک کمزور، اکیلی اور تنہا عورت کی جنگ شروع ہوتی ہے جو وہ جیتتی ہے یا ہارتی ہے اس کا فیصلہ آپ کہانی پڑھ کر خود ہی کریں گے۔

"مرجان" اس انمول خزینہ، معصومیت کے نام جو ہر انسان کے پاس ہوتا ہے۔
مگر یہ بے رحم راہزن دنیا اسے بے دردی سے چھین لیتی ہے۔

چوتھی اور آخری قسط

سال بھر کا سکھ نصیب ہوا، خلیل اللہ کما رہا تھا، خوب کما رہا تھا۔ اس طرف سے تو سکھ تھا مگر..... مرجان کا دل کچھ مطمئن نہ تھا مگر..... مرجان کی چھٹی حس اسے آنے والے خطرے سے آگاہ کر رہی تھی، عجب سی بے سکونی تھی، جاننا چاہتی تھی..... پوچھتی تھی مگر..... خلیل اللہ کا تلخ لہجہ اور گالی گلوچ اس کا منہ بند کر دیتا۔

یوں تو وقت کے ساتھ انسان بدل ہی جاتا ہے مگر..... خلیل اللہ کا بدلتا روپ ناقابل برداشت تھا۔ اب گھر کا ماحول ایسا تھا، کھانے پینے کو خوب تھا۔ وہ فاقے نہ رہے تھے اب تو وہ اتنا کماتا تھا کہ تقریباً روزانہ ہی ناہید اور ساتھ والی رخسانہ کے گھر بھی پلیٹ دو پلیٹ سالن بھیج دیتی، کوئی دروازے تک سوالی آتا تو اس کے ہاتھ میں بھی کچھ نہ کچھ رکھ دیتی۔ گھر میں کھانے کو تھا مگر پھر بھی یہ گھر کھانے کو دوڑتا تھا..... سکون جو نہ تھا، بات بات پہ جھگڑا، لڑائی، روز، روز مار کٹائی، دائی اماں صحیح ہی کہتی تھی مرد کا ہاتھ ایک دفعہ کھل جائے تو پھر عورت کے سفید بالوں اور جھکی کمر کا لحاظ بھی بھول جاتا ہے۔ ساری زندگی، بے چاری کو شوہر کا سخت رویہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر..... یہ تبدیلی صرف اس کے رویے تک محدود نہ تھی۔

اب وہ کچھ زیادہ ہی عجیب اور مشکوک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خلیل اللہ کبھی ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ اس نے سگریٹ پینا شروع کر دیے تھے۔ عجیب و غریب دوست بنا لیے تھے۔ رات، رات بھر غائب رہتا، بات، بات پہ گالی، نہ بیوی کے ساتھ اچھا رویہ، نہ بچوں کے خبر، کچھ سست اور کاہل بھی ہو گیا تھا۔ اکثر دن چڑھے سو یا رہتا، آنکھیں سرخ اور چہرہ بھی عجیب ہو گیا تھا۔

''کہیں تمہارے شوہر نے نشہ تو نہیں شروع کر دیا۔'' محلے کی عورتیں کہتیں۔

''اللہ نہ کرے وہ ایسا نہیں ہے۔''

''رہنے دو، اس مرد ذات کا کیا اعتبار؟'' ناہید کہتی۔

''اللہ بخشے، میری آپا کہتی تھی۔ یہ مرد ذات تو وہ پہیلی ہے جسے نہ کوئی عورت سمجھ سکی ہے نہ سمجھ سکے گی۔''

خالہ برکت کا اکثر یہی جواب ہوتا وہ سوچ میں پڑ جاتی۔

''ویسے وہ آج کل کرتا کیا ہے۔''

''شاید..... مزدوری۔''

''کیسی مزدوری؟ دن چڑھے تو سویا رہتا ہے۔'' ناہید کہتی۔

''ارے بہن ہمارے باپ، بھائی، شوہر سارے ہی مزدوری کرتے ہیں۔ مزدوری میں تو صبح سے شام جان مار، مار کر دو، وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی۔ یہ کیسی مزدوری ہے؟ جس میں سوئے سوئے اتنا کما لیتا ہے۔'' رخسانہ کہتی۔

''تم پوچھتی کیوں نہیں اپنے شوہر سے..... کہیں غلط لوگوں میں تو اٹھنا بیٹھنا شروع نہ کر دیا ہو۔''

''اپنے شوہر کی خیر خبر رکھو، اسے سمجھاؤ۔ اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔'' خالہ برکت نے ایک جملے میں اسے آنے والے وقت کی مصیبت سے متعلق آگاہ کیا۔ مگر وہ بے چاری کیا کرے؟ خلیل اللہ اسے اہمیت نہیں دیتا تھا تو اس کی بات کی کیا اہمیت۔

☆☆☆

ماں کی شدید یاد آئی تو..... ایک دن مرجان نے اپنی پوٹلی کھولی، تو گھر میں کہرام مچ گیا۔

''خلیل اللہ، سچ بتاؤ، کہاں ہیں اماری مورے کے کنگن؟''

''کون سے کنگن؟''

''تم اچھی طرح جانتا ہے کون سے؟'' غم اور غصے سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم نے ہی نکالے ہیں۔ تمہارے سوا، کوئی نہیں کر سکتا ایسی حرکت۔''

''ہمیں تو پتا ہی نہیں کہ تمہارے پاس کوئی کنگن تھے، ہمیں نہیں معلوم۔''

''ڈھیٹ مت بنو، جھوٹ مت بولو، تم نے ہی چوری کیے ہیں۔''

''کمینی، گھٹیا عورت، ہمیں چور کہتا ہے، ہاں لیے ہم نے، ہمیں ضرورت تھے۔'' وہ واقعی ڈھیٹ بن چکا تھا۔ ''مال خریدنے کے لیے پیسہ چاہیے تھا تم

سے تو کھوکھا خریدنے کے لیے پیسہ مانگا تو ہمیں جھنڈی دکھا دیا۔ ہمیں ضرورت تھے ہم نے لے لیے۔''

''کیا؟ مرجان کو اپنے کانوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔''

''وہ صرف سونے کی چوڑیاں نہیں تھیں، میری ماں کی نشانی تھیں۔'' مرجان نے سر پیٹ لیا۔

''کبھی نہیں بخشے گا تمہیں، کبھی معاف نہیں کرے گا، ہمیں بتاؤ کہاں بیچے تم نے۔''

''بیچے نہیں، جس سے مال لیتا تھا اس کو مال کے بدلے دیے۔ اب وہ واپس نہیں مل سکتے۔ تمہیں ہم اور بنا دے گا دعا کرو، اللہ برکت دے امارے کاروبار میں۔''

''اللہ تم جیسوں کو ہدایت ہی دے۔ خدا کی لعنت ہو تم جیسوں پہ.....''

''کیا کہا، رذیل کمینی ..... لعنتی عورت۔'' خلیل اللہ نے طیش میں آ کر اسے مارا، خوب مارا، کیوں نہ مارتا۔ مرجان نے اسے چور، جھوٹا اور لعنتی کہا تھا۔ آخر وہ شوہر تھا۔ شوہر کی عزت، مقام ہوتا ہے۔ عزت بس نہیں ہوتی تو، بے چاری بیوی کی نہیں ہوتی۔ اس قدر مارا، اس کمزور جان کو، منہ پہ نیل ڈال دیے۔ بازو سوج گیا۔ ہاتھ کے انگوٹھے میں فریکچر ہو گیا۔ ہائے بے چاری مرجان۔

☆☆☆

''تم منشیات بیچتا ہے؟'' مرجان کو شک تھا آج اسے یقین آ گیا جب وہ اپنے صندوق سے چیزیں نکال رہا تھا تو وہ جان بوجھ کر کمرے میں آ گئی۔ اس کے پاس عجیب وغریب چیزیں پڑی دیکھیں تو سمجھ گئی۔

''نہیں.....''

''اچھا! تو یہ کیا ہے؟ یقیناً حلوہ تو نہیں۔'' اس نے قلعی میں لپٹی چرس اور پاؤڈر کے لفافوں کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہیں کیا معلوم، یہ کیا ہے؟''

''اب ہم اتنا بیوقوف اور بچہ نہیں، تم نے خود بھی سگریٹ پینا شروع کر دیے۔ کبھی تم ان سب چیزوں سے نفرت کرتا تھا۔ ایک دفعہ، بس میں تمہارا ایک آدمی سے منہ ماری بھی ہو گیا تھا۔ اس قدر ناپسند تھا تمہیں سگریٹ کا بدبو..... اور اب.....''

''وہ پرانی بات تھی۔'' اس نے طنزاً کہا۔

''ہاں مگر..... نئی بات کیا ہے وہ بھی نظر آ رہا ہے۔'' جواباً طنز ہی تھا۔

''امارا مغز مت خراب کرو، دفع ہو جاؤں یہاں سے۔''

''دیکھو خلیل اللہ ہم تمہارا بیوی ہے۔ امارے ساتھ ایسے بات مت کرو۔''

''ہاں! بیوی ہو تو بیوی بن کر رہو تھانیداری کیوں بنتا ہے؟''

''اگر تم نے یہ حرکتیں نہ چھوڑیں تو تھانے کا منہ بھی دیکھ لے گا تم اک دن۔''

''تم جیسی منحوس عورت کے منہ سے کبھی اچھا بات بھی نکل سکتا ہے۔''

''تم اچھا کام نہ کرے تو ہم اچھا بات کیسے کرے۔'' وہ سمجھا سمجھا کر تھک گئی۔ اکثر اس بات/ بحث سے لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا جو مار کٹائی پہ ختم ہوتا۔

''چھوڑو دفعہ کرو، اگر وہ تمہاری بات نہیں سنتا تو خود کو تکلیف مت دو اور اذیت میں مت ڈالو، گھر کا ماحول خراب مت کرو۔'' ناہید جو اکثر ان کی لڑائیاں سنتی رہتی اسے سمجھاتی اور پھر..... مرجان نے ہار مان لی اور..... اس سے بحث کرنا اور سمجھانا چھوڑ دیا۔

☆☆☆

''کہاں سے لاتا ہے تم یہ.....''

''یہ..... یہ تو بہت بڑا کاروبار ہے۔ بہت سا لوگ مل کر کرتا ہے۔ کہیں تو یہ بڑا بڑا شریف لوگ اور پولیس خود بھی ملوث ہوتا ہے۔''

''اچھا، واقعی۔''

''گھر کے بھیدی کے بغیر ایسا کام نہیں ہو سکتا، یہاں تو جو پتھر اٹھاؤ، نیچے سے سانپ نکلتا ہے۔ اچھے لوگ تو ناپید ہو گئے ہیں اس دنیا میں۔ منافق، لالچی، پیسے کے بھوکے ہیں سارے.....''

''پولیس، خود ملوث ہوتا ہے اس کام میں..... اس۔'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں اور کیا..... تمہارا کیا خیال ہے یہ کام کوئی

ایک دو بندے کا ہوتا ہے۔ پورا نیٹ ورک ہوتا ہے .....نیٹ ورک۔"

"یہ کیا ہوتا ہے؟ نیٹ ورک؟"

"ہاہاہا، کچھ نہیں، جاہل عورت....."

"ہاں، اب تم جو بہت سمجھ دار اور پڑھے لکھے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے لگا ہے۔ ہم تو جاہل ہی لگے گا۔ ویسے ایک بات پوچھے۔"

"اتنی دیر سے تو امارا مغز کھا رہا ہے اور کیا پوچھتا ہے؟"

"یہ اتنا سارا..... اور اتنا مہنگا اسے خریدتا کون ہے؟ میرا مطلب ہے یہ گلی محلے کا غریب، نشئی لوگ، ان کی حالت سے تو نہیں لگتا کہ وہ..... اتنا مہنگا خرید سکتا ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے یہ صرف ان غریب محلوں اور تنگ گلیوں میں لوگ خریدتا ہے اسے، ایسا بالکل نہیں ہے..... ان تاریک، تنگ گلیوں میں تو کچھ غلاظت نہیں جتنے یہ شریف اور مہذب دیکھنے والے لوگ..... استغفار اللہ جتنی یہ غلاظت اپنے دامن میں چھپائے پھرتے ہیں۔"

مرجان کو تو جیسے خلیل اللہ کی باتوں کا یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ حیران ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ "ہاں..... یہ بڑا بڑا، امیر لوگ، بڑی بڑی گاڑیوں والا ..... بڑا بڑا، افسر لوگ، یہ تو سب سے زیادہ خریدتا ہے۔"

"استغفار، کیا وہ پڑھا لکھا نہیں۔"

"ہا، ہا، ہا..... کیسی بات کرتا ہے تم مرجان..... خیر تم بھی تو کنوئیں کا مینڈکی ہے۔ تم کو کیا پتا۔ اس باہر کی دنیا گا کیا کیا روپ ہے۔ کتنا کتنا چہرہ..... کیا کیا رنگ یہاں تو سب سے زیادہ منشیات کا دھندہ ہوتا ہے..... بڑے بڑے مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں ..... یہ طالب علم لوگ اور یہ پڑھے لکھے افسر، یہ تو سب سے زیادہ نشہ کرتے ہیں۔

"یہ جو بڑے بڑے مدرسوں اور کالجوں کے بچے وہ، وہ بھی۔" مرجان پریشان ہو گئی۔

"تم کیوں پریشان ہوتا ہے؟"

"بات تو پریشانی کا ہے، ماں باپ، کتنی مشکل سے اولاد پیدا کرتا ہے۔ پالتا پوستا ہے، وہ بے چارے تو، پڑھنے کے لیے اپنے بچوں کو ان کالجوں میں بھیجتے ہیں اور یہ کوئی خوف نہیں، خوف خدا نہیں۔"

"تم کس لیے دل جلاتا ہے۔"

"دل تو جلتا ہے ..... جب عمر بھر کا محنت ..... زندگی بھر کا سرمایہ..... یوں، آگ لگے گا..... دل تو جلے گا ناں، اب امارے یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہم انہیں دیکھ کر یہی سوچتا ہے کہ کب یہ بڑا ہو گا، ہمیں سنبھالے گا، امارا خیال کرے گا۔ ہم تو روز بند آنکھوں سے یہ تصور کرتا ہے۔ جب ہم بوڑھا اور کمزور ہو گا تو یہ امارا سہارا بنے گا۔ اللہ معاف کرے، اگر کل بڑا ہو کر یہ بھی ان کاموں میں پڑ جائے تو امارا تو کل زندگی کا محنت، غارت ہو جائے گا۔" زندگی بھر کی مشقت اور انتظار اتنی محنت، اتنی سخت محنت، کیا فائدہ کیا رہ جائے گا امارے ہاتھ میں۔ خدا کے لیے خلیل اللہ! تم..... تم یہ کام چھوڑ دو، ہم نے تو قسم کھایا تھا کہ کبھی تم سے بحث نہیں کرے گا، تمہارے کام میں دخل نہیں دے گا مگر..... اب، یہ سب سن کر ہم واقعی ڈر گیا ہے خلیل اللہ یہ غلط ہے..... بہت غلط۔"

"تم پاگل عورت، پھر شروع ہو گیا۔" اس نے غصے سے دیکھا۔

"ہم تمہارا بیوی ہے کوئی دشمن تو نہیں، تم کیوں، امارا بات نہیں مانتا۔"

"تمہاری خاطر ہی تو کرتا ہے یہ کام۔"

"امارا خاطر..... اب تم..... اب تم اس گناہ کا بوجھ بھی، امارے سر لادو گے۔ ہمیں نہیں چاہیے، بالکل نہیں چاہیے ہم صاف، صاف کہتا ہے۔ تم ہمیں صرف دو وقت کی روٹی لا دو..... امارے لیے کافی ہے تمہاری وہ محنت مزدوری کی روٹی ..... کم از کم عزت اور سکون تو ہے..... ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا تم سے۔"

"مزدوری، مزدوری ..... یہ مزدوری کرنا آسان ہے کیا، کبھی باہر جا کر کمائی ہے تم نے یہ خواری، محنت، مزدوری، عزت، پھر بکواس شروع ہو جاتا ہے

تمہارا، تمہاری انہی باتوں سے ہم تنگ پڑتا ہے۔''

بات اکثر یہیں ختم ہوتی اور وہ ..... غصے سے باہر نکل جاتا۔

☆☆☆

کافی عرصہ خاموشی رہی۔ یونہی گھر کا نظام چلتا رہا۔ زندگی کے دن کٹ تو رہے تھے مگر، آنے والے دنوں کا خوف..... اس کے دل کی بے سکونی، خاموش سی گھٹن اسے آگاہ کر رہی تھی ..... جیسے بند، بند ہوائیں۔ آسمان کا بدلتا رنگ، آنے والے طوفان کی خبر دیتے ہیں۔ اس کا دل بھی اسے خبردار کر رہا تھا۔ ایک دن وہ ہانپتا کانپتا گھر میں داخل ہوا ..... بہت متفکر، پریشان ..... اس نے پوچھا مگر، خلیل اللہ نے اسے جھاڑ پلا دی، پھر دو دن گھر سے باہر ہی نہیں نکلا، تو کسی نے شام کے وقت گھر کا دروازہ کھٹکایا۔ خلیل اللہ کا کوئی جاننے والا تھا وہ بات کر کے اندر آ گیا۔ اب وہ کچھ زیادہ پریشان ہو گیا تھا۔

''آخر بات کیا ہے؟ تم اتنا پریشان کیوں ہے؟ کھانا بھی نہیں کھاتا۔''

''مرجان۔''

''ہاں۔''

''وہ..... ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

''کیسا مسئلہ۔''

''وہ جن بندوں کو ہم مال دیتا تھا..... وہ ان کو پولیس نے دھر لیا۔''

''کیا؟''

''ہم بھی پکڑا جاتا، مگر..... ہم بچ کر بھاگ نکلا۔''

''شکر ہے، تم پکڑا نہیں گیا، اگر تم پکڑا جاتا تو..... ہم کیا کرتا۔''

''تکبر مت مناؤ، خطرہ ٹلا نہیں ..... وہ کسی بھی وقت امارا نام لے سکتا ہے۔ پولیس کسی بھی وقت گھر کے دروازے تک آ سکتا ہے۔''

''پولیس ..... یہاں اللہ نہ کرے، تم کیسی بات کرتا ہے۔'' مرجان شدید پریشان ہو گئی۔

''اگر پولیس یہاں آ گئی تو پورے محلے میں ہم کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہے گا۔ امارا پانچ، چھ سال کا بنا بنایا عزت تو خاک میں مل جائے گا۔ لوگ..... لوگ تو طرح، طرح کی باتیں بنائے گا۔''

''تمہیں لوگوں کی پڑی ہے۔'' خلیل اللہ نے غصے میں کہا۔

''بھاڑ میں گئے لوگ یہ غریب محلے والے اور رہی بات عزت کی تو عزت، عزت یہاں انسان کی نہیں پیسے کی ہوتی ہے..... جس کے پاس جتنا مال وہ اتنا عزت دار۔''

''ہم نے تمہارا منت کیا تھا، کتنا سمجھایا تھا کہ چھوڑ دو..... خدا کے لیے چھوڑ دو یہ کام۔''

''ہاں، تو چھوڑ دے گا، ہم کون سا، ساری زندگی اسی کام میں پڑا رہے گا۔ ہم تو بس تمہارے اور اپنے ان بچوں کے لیے گھر بنانا چاہتا ہے۔ اب ساری زندگی تو اس کرائے کے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ ہر دو، تین ماہ بعد، مالک مکان مہنگائی کا کہہ کر کرایہ بڑھا دیتا ہے۔ اب ایسے تو گزارا ممکن نہیں۔''

''یہاں تو سارے مہنگائی کا رونا، رو رہے ہیں تو کیا ہر کوئی اٹھ کر یہ غلط کام ..... کرنا شروع کر دے۔'' اللہ کبھی ایسے کاموں میں برکت نہیں ڈالتا، تم یہ مت کرو، امارے جو نصیب میں ہو گا ہمیں مل جائے گا۔''

''بیوقوف عورت، نصیب بنانا پڑتا ہے۔ ہم پیسے جمع کر کے کوئی بھی اپنا اچھا اور عزت والا کاروبار شروع کرے گا۔ ہمیں قسم ہے اپنے بچوں کے سر کی، پھر آئندہ اس گندے کام میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ بس توبہ کرے گا۔''

☆☆☆

بس، توبہ کرنے میں دیر ہو گئی۔ جس کا ڈر تھا وہی ہوا ..... خلیل اللہ پکڑا گیا۔ پولیس تلاشی کے لیے گھر کے دروازے کے اندر داخل ہو گئی، اور بنی بنائی عزت ..... دروازے سے باہر نکل گئی۔ وہ روئی، بہت روئی مگر اب تو یہ عمر بھر کا رونا تھا۔

گھر میں دو معصوم بچے اور کمزور، اکیلی عورت ..... اوپر سے دہرا عذاب یہ جوانی اور خوب صورتی ..... خلیل اللہ تو جیل کی چار دیواری کے پیچھے چلا گیا۔ بے چاری مرجان اس کی چار دیواری دن بہ دن

اس کے لیے زیادہ غیر محفوظ ہونے لگی۔ اس کے دن کا سکون، راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ پہلے محلے والے لوگوں کی باتیں..... کیا دل جلانے کے لیے کافی نہ تھیں۔ اب لوگ اسے نشئی کی بیوی، منشیات فروش کی بیوی، مجرم کی بیوی، جرسی کے بچے، لوگ باتیں کرتے، نفرت کرتے، ذلیل کرتے، اور وہ سر جھکا کر سن لیتی۔

اوپر سے مالک مکان کرائے کے بہانے..... گھر کے دروازے کے اندر، داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا، اس کی چبھتی نظریں..... مرجان کا دل اور ڈرنے لگا، بچوں کے دودھ کی خاطر، گھر کی دال سبزی کی خاطر، باہر نکلنا، دوسروں کے منہ لگنا مجبوری تھا، ہر کوئی اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھانے لگا۔ اب کوئی نام نہاد شریف اس سے کوئی میل میلاپ رکھنا، بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا تھا مگر..... طنز کرنا اپنا اولین فرض سمجھتا تھا۔

مگر، ایسے لوگوں کے اس دوغلے رویے کی پریشانی بھی کم تھی، زیادہ پریشانی تو تیزی سے خراب ہوتے حالات کی تھی کوئی ذرائع آمدن نہ تھا، گھر میں فاقے آ گئے، وہ مجبوراً دو پیسے کمانے کی خاطر گھر سے باہر نکلی، خالہ برکت کے سامنے روئی اب کیونکہ وہ ایک مجرم اور نشئی کی بیوی تھی لہٰذا کوئی کام دینے پہ راضی کیا ہوتا، گھر گھسنے کی اجازت تک دینے پہ راضی نہ تھا، خالہ برکت نے معذرت کر لی۔ شادی بیاہ پر تو برتن دھونے کا کام ملنے سے رہا۔ ایک دن خالہ برکت نے اپنے ہی کسی رشتہ دار کے گھر مہندی پہ برتن دھونے کا کام منت سماجت کر کے اس کے لیے حاصل کر ہی لیا..... اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے، دو روپے آمدنی کا کچھ تو وسیلہ بنا، صبح سے شام تک اس نے بہت محنت سے کام کیا۔ شام کو اچانک شور مچ گیا دولہے کی ماں کی سونے کی انگوٹھی..... سنگار میز کے سامنے رکھی، رکھی غائب۔ آہ، یہ قسمت اس نے یہ دن بھی دیکھا دیا۔ کہنے والوں نے اس بے چاری کو چور تک کہہ دیا۔ دولہے کی بہن، شاہدہ، وہ تو مرجان کی جان کو آ گئی۔

''یہی چور ہے اسی نے اٹھائی ہے۔'' وہ ماننے کو تیار ہی نہ تھی۔ ادھر خالہ برکت قسمیں کھاتی جاتیں، کہ میں جانتی ہوں اچھی طرح، بڑی شریف عورت ہے یہ ایسی حرکت نہیں کر سکتی..... کسی اور کا کام ہوگا۔

مرجان بے چاری کا چہرہ سرخ، ٹانگیں کانپ رہیں۔ اپنے بچوں کے سر پہ ہاتھ رکھ، رکھ قسمیں کھاتی جاتی..... روتی جاتی..... اس دن اس نے کیا کچھ نہ سنا ان لوگوں کے منہ سے، ایک کے بعد ایک قیامت گویا اسی کے سر پہ ٹوٹتی تھی۔

''ارے کون کہتا ہے۔ آخر یہ وہی ہے ناں، جس کا شوہر جیل میں منشیات فروشی کی سزا کاٹ رہا ہے۔ نشئی کہیں کا، تو یہ کہاں سے اتنی سچی ساوتری آ گئی۔ یہی چور ہے۔'' ایک شخص نے بڑے وثوق کے ساتھ اسے مجرم کہہ دیا۔

مرجان، دل ہی دل میں اللہ کے آگے گڑگڑانے لگی، نبی پاکؐ کے واسطے دینے لگی۔ کوئی چار گھنٹے بعد سنگار میز کے پاس سے ہی انگوٹھی پڑی مل گئی تو اس کی کوئی جان خلاصی ہوئی۔ انگوٹھی تو مل گئی مگر..... لوگوں کو باتیں بنانے کا ایک اور موقع مل گیا۔

کچھ دن تو ایسے ہی گزر گئے۔ اب گھر کے حالات اس قدر برے ہو گئے تھے کہ پینے کے پانی کے سوا، گھر میں کچھ نہ تھا۔ اپنی بھوک تو برداشت ہو جاتی ہے مگر یہ..... بچے، ان کی بھوک قسمت کسی کو اس مقام پہ نہ لائے مرجان کو لگا، وہ اب زندگی کے سب سے مشکل اور کڑے امتحان میں آ پھنسی ہے۔ بچے روتے..... دودھ مانگتے، کھانے کو مانگتے، آوازیں باہر تک جاتیں مگر کسی کو رحم نہ آتا، ایک دن بچوں کی بھوک سے مجبور ہو کر، ساری غیرت پہ پاؤں رکھا اور..... دیوار سے ناہید کو آواز دی اور کھانے کے لیے کچھ مانگا تو، اس کی ساس اور شوہر نے ٹکا سا جواب دے دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ آئندہ آواز نہ دے۔ وہ پلٹ آئی، اسے یاد آیا، وہ اپنے بھلے وقت میں کس قدر خیال رکھتی تھی ناہید کا۔ کچھ بھی پکاتی تو ضرور بھیجتی، آج مشکل وقت کیا آ گیا..... خیر ناہید بے چاری بھی کیا کرے اپنے شوہر کے سامنے بول کر مار تو نہیں کھا سکتی تھی۔

عثمان بھوک سے چیخنے لگا۔ وہ چپ کرواتی

رہی۔ یونہی پانی نیم گرم کیا۔ بہت مشکل سے گھر کے کسی پرانے ڈبے سے تھوڑی سی شکر ملی تو، گھول کر اسے دے دی۔ بچہ تھا رو، رو کر چڑ گیا تھا ہاتھ مار کر کٹورا، گرا دیا مرجان نے غصے میں آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جوتا اٹھایا اور مار، مار کر بے چارے معصوم بچے کی کمر اور منہ کو لال کر دیا۔ وہ بے سدھ ہو کر گر گیا اور سسکیاں لینے لگا۔ حفظہ بھی بے تحاشا رو رہی تھی کچھ بھوک کی وجہ سے کوئی بھائی کی اس حالت پہ سہم گئی۔ اور اب..... مرجان نے بھی ضبط کے سارے بند توڑ دیے۔ وہ بچوں سے بھی زیادہ رونے لگی۔

''یہ تم نے کیا کر دیا خلیل اللہ ہمارے ساتھ..... تم نے تو وعدہ کیا تھا ہمیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گا۔ صرف دو وقت کا روٹی ہی تو مانگا تھا تم سے زیادہ کی لالچ میں تم تو تھوڑے سے بھی گیا اور عزت کہاں کی عزت اب تو جس کا جو دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر کہہ جاتا ہے۔ خلیل اللہ عزت وہ تو ایسی خاک میں ملی کہ ساری زندگی چھان چھان کر بھی نہ نکال سکو گے۔ اب تو اس دنیا کی نظر میں ہم چور بھی ہو گیا۔''

''وہ بین کر کے رونے لگی، اس دنیا کی مصیبتیں بھی تو دلدل کی طرح ہوتی ہیں انسان ایک دفعہ اس میں پھنس جائے تو پھر سر تک دھنس جاتا ہے پھر تو کوئی معجزہ ہی بچائے تو بچائے، مگر غریبوں کی زندگی میں کہاں معجزہ ..... دائی اماں کا چکر لگا، اس کی حالت دیکھی تو اس پہ بہت ترس آیا۔ بہت کوشش سے اچھی خبر لے ہی آئیں ایک سرکاری سکول ٹیچر کے گھر برتن دھونے کا کام مل گیا۔ تین ہزار ماہانہ چلو، رزق کا کچھ تو وسیلہ بنا۔ وہ بہت محنت سے کام کرنے لگی مگر، ساتھ میں یہ بچے گھر چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتی..... ساتھ لے کر جاتی تو کام کرنا مشکل تھا مرتی کیا نہ کرتی ایک دن عثمان نے بیگم صاحبہ کا گملا توڑ دیا۔ وہ بچوں کو پکڑ، پکڑ کر بٹھاتی مگر یہ بچے..... یہاں کہاں بیٹھتے ہیں۔ باورچی خانے میں برتن دھو رہی تھی اسے خبر ہی نہ ہوئی جانے کب عثمان پیچھے آ گیا، چائے کی سیٹ کی پیالی توڑ دی۔ بہت شرمندہ ہوئی۔ عثمان کو مارا پیٹا بھی مگر یہ شرمندگی اور مار کٹائی اس سے تھوڑا ہی بیگم صاحبہ کا نقصان پورا ہو سکتا تھا۔ پھر ایک دن بیگم صاحبہ کے چھوٹے بیٹے نے جو عثمان سے سال بھر ہی بڑا تھا، حفظہ کے منہ پہ گیند مار کر اس کی آنکھ سوجھا دی۔''

''آخر تم ان بچوں کو ساتھ کیوں لاتی ہو کتنی دفعہ منع کیا ہے۔''

''وہ..... گھر پہ کوئی نہیں..... کس کے پاس چھوڑے؟''

''تو، یہ تو ہمارا مسئلہ نہیں۔ دیکھو بچوں کا کوئی اور بندوبست کرو، ورنہ ہمیں کام کے لیے دوسری عورت دیکھنی پڑے گی۔''

''کیا بندوبست کرے؟''

''یہ تمہارا بڑا بچہ کتنے سال کا ہو گا؟''

''پانچ سال کا ہونے والا ہے۔''

''تو، تم اسے اسکول ڈال دو۔ اور اس ٹائم یہ کام کر جایا کرو۔''

''اسکول؟''

''ہاں، اب اس کی عمر تو ہے اسکول جانے کی۔''

''ڈال تو دے مگر..... اسکول کا خرچہ بستہ، کتابیں، فیس۔''

''سرکاری سکول میں ڈال دو۔ سرکاری کی فیس تو بہت تھوڑی ہوتی ہے۔''

''بہت تھوڑا بھی کہاں ہے ہمارے پاس۔''

''اچھا تو سامنے بڑی گلی میں مدرسہ ہے، وہاں ڈال دو۔''

''ہاں، یہ اچھا ہے کچھ نماز، قرآن بھی سیکھ لے گا۔ دین کی دو چار باتیں اور اگر حافظ قرآن بن جائے تو بہت ہی اچھا۔'' مرجان کو یہ صلاح اچھی لگی۔

☆☆☆

مدرسے کا کرتا دھرتا، مولوی کوئی مولانا عبید اللہ تھا۔ سانولا رنگ بڑا سا پیٹ۔ سر پہ بڑی سی پگڑی، ہاتھ میں تسبیح..... لمبی سی مہندی لگی داڑھی اور مونچھیں صاف، مرجان نے اپنے لختِ جگر کو بھروسا کر کے کس درندے کے حوالے کر دیا اسے اندازہ ہی نہ تھا۔

کچھ دن تو آرام سے گزر گئے۔ وہ بیگم صاحبہ کے

گھر اب ذرا اطمینان سے برتن اور کپڑے دھونے کا کام کرنے لگی۔ عثمان بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہو گیا یا معلوم نہیں کچھ اور مسئلہ تھا وہ مدرسے کے نام پہ رونے چیخنے لگتا۔ ''بچوں کا تو کام ہی یہی ہوتا ہے۔ پڑھنے پڑھانے سے کون سا بچہ نہیں بھاگتا۔ بچے تو بس چاہتے ہیں بس کھیلتے کودتے رہیں۔'' بیگم صاحبہ، پڑھی لکھی، دنیا دار عورت ہیں صحیح ہی کہہ رہی ہوں گی۔ وہ عثمان کو زبردستی ،مولوی صاحب کے حوالے کر کے آجاتی۔

ایک دن جمعہ کا روز تھا۔ عثمان گھر نہ آیا۔ وہ خود مدرسے لینے گئی تو پتا چلا، وقت پہ گھر چلا گیا تھا۔ خیر گھر کہاں دور تھا وہ گھر تک ڈھونڈتی آئی۔ عثمان نہ ملا، شدید پریشانی میں ہر گلی، ہر سڑک، ہر راستے پہ ماری، ماری پھرنے لگی آخر اسے ایک بند گلی کے بڑے سے، کوڑے کے ڈرم کے پاس کچھ لوگ کھڑے ملے۔ کوئی بچہ تھا ''بچے'' کا سن کر ہاتھ بے اختیار دل تک آیا۔ بھاگی پاگلوں کی طرح بھاگی ..... دیکھا ..... دیکھا تو وہ بچہ کوئی اور نہیں، اس کا معصوم، لخت جگر، عثمان تھا۔ وہ اٹھا کر بھاگی، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، عقل جیسے کام ہی نہیں کر رہی تھی۔ وہ بہت مشکل سے قریب کے سرکاری ہسپتال اسے لے گئی۔ عثمان کی حالت بہت غیر تھی ..... اس کے چہرے کی طرف دیکھتی تو جیسے کلیجہ پھٹتا، اللہ کسی دشمن کو بھی اولاد کا غم نہ دکھائے، یا اللہ رحم ..... پولیس کیس ہے۔ بچے کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ کنڈیشن بہت سیریس ہے۔ آپ شکر کریں یہ زندہ بچ گیا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''تم یہ دوائیاں فوراً سے لے آؤ، پاس ہی میڈیکل سٹور ہے۔ جاؤ جلدی کرو۔'' اس میں کہاں ہمت تھی کہ ایک قدم بھی اٹھا پاتی، ننھی حفظہ کو گود میں اٹھائے جانے کون سے غم کے پہاڑ عبور کرتی وہ میڈیکل سٹور ڈھونڈتی، ڈھونڈتی پہنچی۔

''جی، آٹھ سو۔'' میڈیکل سٹور والے نے کہا۔

''آٹھ سو..... آٹھ سو اس کے پاس تو صرف دو سو تھے۔ اس نے میڈیکل سٹور والے کے سامنے وہی دو سو نکال کر رکھ دیے مگر اس نے معذرت کر لی۔''

''بی بی یہ میری دکان نہیں ہے میں تو صرف سیلر ہوں۔''

''بھائی..... کوئی ادھار شدھار۔''

''ادھار کا سوال ہی نہیں دکان کا مالک مجھ پہ غصے ہوگا۔''

مرجان، باہر آگئی، کچھ سمجھ نہ آیا کیا کرے۔ مورے کے سونے کے کنگن یاد آئے کاش آج ہوتے۔ تو وہ ضرور بیچ کر عثمان کے لیے دوائی خرید لیتی۔ اللہ بھلا کرے اس خلیل اللہ کا..... کیا کیا دن نہ دیکھا کچھ اس کی مہربانی کچھ اپنے نصیب کی..... کیسا خود غرض نکلا اس کے کنگن نکال کر بیچ دیے، پوچھنا تو کیا بتانا بھی ضروری نہ سمجھا اور اوپر سے جانوروں کی طرح بے چاری کو مارا پیٹا وہ دماغ کھپا کھپا کر تھک گئی۔ کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے بیچ کر ہی۔ اس مصیبت کی گھڑی کو کاٹ لیتی۔ اس وقت اسے خود کو بے بس محسوس کیا۔ بہت بے بس، سڑک پہ چلتے، چلتے اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔

''تمہیں ہم نظر نہیں آرہا یا ہماری مصیبت، کیوں تمہیں امارے یہ آنسو نظر نہیں آتے، یہ دنیا رحم نہیں کرتی ہم غریبوں پہ، تو ہی کچھ رحم کر عثمان آہ عثمان میرا عثمان۔'' اتنے میں ایک مانگنے والی بوڑھی عورت اس کے پاس آئی۔

''میری مدد کرو، میری بچی ہسپتال میں داخل ہے۔''

''وہ پتھرائی نظروں اور ساکت چہرے سے اسے دیکھتی رہی اور خاموشی سے آگے چلی آئی اس نے برقعہ اپنے چہرے پہ گرایا، خود کو اچھی طرح ڈھانپا، کچھ آگے پینٹ شرٹ پہنے، بالوٹائپ تین چار مرد کھڑے تھے اور گئی اور ہمت کر کے کہا۔''

''میری مدد کرو، میرا بچہ ہسپتال داخل ہے۔ میرے پاس دوائی کے پیسے نہیں۔''

اور..... پھر..... یہ بھی ہو گیا۔ جو بھی تھا، جتنا بھی مشکل تھا، عثمان کی دوائی کے پیسے اکٹھے ہو گئے اور اوپر بھی ڈیڑھ سو روپیہ۔

لوگوں نے مدد بھی کی۔ دھتکارا بھی گالی بھی دی رحم بھی کھایا۔ رال ٹپکانے والے مردوں کی وہ کھا جانے والی گھٹیا نظریں، سب سے مشکل تو یہ تھا مگر وہ

عورت ہونے سے پہلے ماں تھی یہ اس کی ممتا ہی تھی کہ اس نے عزت، انا سمیت ہر چیز پہ پاؤں رکھ دیا۔ ہاتھ پھیلایا، مانگا صرف اپنے بچے کی خاطر، اپنے عثمان کی خاطر، دوائیاں لانے سے اسے پانچ سے چھ گھنٹے لگ گئے۔ مگر ذہن خیال صرف عثمان میں ہی ٹکا ہوا تھا۔ دیر تو ہوئی مگر شکر ہے دوائیاں آ گئیں۔

شام کو بڑے ڈاکٹر نے چیک کیا۔ عثمان کچھ اور دن ہسپتال داخل رہے گا۔ حالت بہت غیر ہے، بڑی آنت پہ شدید زخم ہے اسے انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہے۔ میڈیکل رپورٹ فائنل ہوگئی ہے ایک کاپی پولیس کے حوالے کر دو ڈی این اے کے سیمپل بھی لے لیے ہیں۔'' انہوں نے جونیئر ڈاکٹرز کے پینل سے کیس ڈسکس کیا۔ پولیس نے ایف آئی آر درج کر لی تھی۔ میڈیکل رپورٹ بھی لے لی۔ تحقیقات کا آغاز ہوگیا تھا۔ مرجان کو جلد مجرم اور قصوروار کو پکڑنے کی یاد دہانی بھی دلا دی تھی۔

وہ ہسپتال سے گھر لوٹی تو اسے کافی عرصے بعد دائی اماں دکھائی دیں اس کے گھر کے باہر وہ اسی کی طرح آئی تھیں۔ اس سے ملنے دروازے کے باہر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

''مرجان! مرجان بچے کیا ہوا؟'' انہوں نے متفکر انداز میں پوچھا۔

مرجان نے دروازے کا تالا کھولا اور اندر آ گئی۔ دائی اماں نے دوبارہ پوچھا تو ان کے گلے لگ کر روئی اور بہت روئی۔ دائی اماں نے تسلی دی۔ عثمان کا پوچھا۔

''عثمان کا حالت بہت برا ہے۔ ہم سے تو، دیکھا نہیں جاتا۔ کیسا ظالم، ناپاک لوگ ہے اس دنیا کا..... عثمان تو بچہ، معصوم سا چھوٹا سا بچہ، انسان تو جانور کے بچے پہ بھی رحم کھاتا ہے معلوم نہیں کون تھا وہ درندہ۔''

''پولیس نے کچھ بتایا۔''

''کہہ تو رہا تھا کہ جلد پکڑ لے گا مجرم کو..... وہ مولانا عبیداللہ وہ بھی کہہ رہا تھا کہ جلد پتا چلا لے گا، چھوڑے گا نہیں۔''

''کیا؟ وہ بڑی مسجد کا امام..... وہ مولوی عبید۔''

''ہاں۔''

''اچھا تو تم نے وہاں ڈالا تھا حفظ کی خاطر..... اس معصوم بچے کو۔''

''جی۔''

''ہائے وہ بڑی توند والا، وہ خبیث مولوی..... مرجان تم نے ہم سے پوچھا کیوں نہیں بات کیوں نہیں کی۔''

''کیا بات؟''

''وہ درندہ کوئی اور نہیں..... وہ خود ہی خبیث ہے۔''

''آپ..... آپ کیا بات کر رہے ہو دائی اماں..... اگر دائی اماں کے سوا کوئی اور کہتا تو شاید وہ یقین ہی نہ کرتی۔''

''صحیح کہہ رہی ہوں، یہ اس علاقے میں ہونے والا کوئی پہلا واقعہ تو نہیں۔'' دائی اماں کی اس بات سے مرجان کو یاد آیا کہ کیسے معصوم عثمان، مدرسے کے نام پہ سہم جاتا تھا۔ کتنا روتا تھا مگر..... ہائے کاش اس نے سر پکڑ لیا کاش وہ اسے زبردستی مولوی کے حوالے نہ کر کے آتی۔ کاش اپنے بچے کی ضد کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔ وہ پچھتا رہی تھی..... بہت پچھتا رہی تھی مگر..... اب پچھتاوے سے کیا ہوتا..... اس وقت تو اس کے دماغ میں صرف بھوک سوار تھی۔ بچوں کی بھوک، اگر واقعی بیگم صاحبہ نے جواب دے دیا تو بچوں کو کہاں سے کھلائے گی۔ یہ بھوک، کمبخت ایسی ظالم چیز ہے کسی اور طرف دھیان ہی نہ گیا۔

''تو، آپ جانتی تھیں۔''

''میں کیا..... آدھا علاقہ جانتا ہے۔''

''تو، کچھ کیا کیوں نہیں۔''

''کون کرے؟ اس بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ یہاں تو ہر کوئی دوسرے طرف دیکھتا ہے کہ وہ کرے..... کرنے کی ہمت کوئی نہیں کرتا۔ یہ کمزور اور بزدل لوگوں کی بستی ہے۔ یہاں کسی کے گھر کو لگی آگ کو دیکھ کر یہ ناپتے ہیں کہ شعلے کتنے اونچے

ہیں..... بجھانے کی ہمت کوئی نہیں کرتا۔ عجیب منافق لوگ ہیں۔''

''مرجان بیٹھ کر رونے لگی۔ مت رو میری بچی۔'' دائی اماں نے اپنی چادر سے اس کے آنسو صاف کیے۔'' یہاں اپنی عزت بچانا مشکل ہے دوسرے کی طرف کون زبان کھولے، پچھلی گلی میں سبزی فروش، وہ محمد رفیق اس کے چھ سالہ بیٹے کے ساتھ جو اس گھٹیا مولوی نے کیا۔ وہ بھی تو اسی مدرسے میں پڑھتا تھا۔ یہی سات، آٹھ ماہ پہلے کی بات ہے۔

''پتا نہیں، ہم نے نہیں سنا۔''

''ہاں، سنتی بھی کیسے؟ یہاں تو ایسی باتوں پہ منوں مٹی ڈال دی جاتی ہے، جیسے مردوں پر..... دراصل یہ مولوی عبیداللہ ذرا اتھ نچے والا بندہ ہے اور اوپر سے محلے کے نام نہاد یہ معزز لوگ..... اس کے طرفدار..... ظاہر ہے غریب کے ساتھ کون کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تو ماننے کو تیار ہی نہیں اس متقی پرہیزگار کے خلاف کوئی بات ہی نہیں سنتے۔ وہ سبزی فروش..... محمد رفیق وہ بے چارہ بھی چپ ہو کر بیٹھ گیا ہے، ہاں بھئی، کیا کرے؟ بے چارے کی بیوی کو مرے کوئی ایک ڈیڑھ سال ہی ہوا ہے۔ پانچ بچے ہیں۔ گھر دیکھے، بچے سنبھالے، سبزی بیچے، روزی روٹی کمائے یا انصاف کے لیے گھر گھر کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ یہ مولوی بڑا ابلیس، حد درجہ خبیث ہے۔ یہ ان جیسے گھٹیا لوگ، مذہب اور دین کی پاک پوشاک کے پیچھے ہی اپنی غلاظت چھپاتے ہیں۔ یہ شاطر شیطان ایسے ہی مہذب بن کے لوگوں کے درمیان بیٹھ جاتے ہیں، چور اچکوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ چور کو پکڑ کر بندہ جوتے لگا لیتا ہے مگر ان بھیڑیوں کے خلاف زبان کھولنا آسان نہیں ہوتا۔ بڑا ہی خبیث مولوی ہے۔ بڑا دیکھ بھال کر کام کرتا ہے۔'' اسی گھر کو نشانہ بناتا ہے جہاں اسے یقین ہو کہ کوئی پیچھے آئے گا اور نہ بولنے کی ہمت کرے گا۔

''ہم تب بھی بولے گا۔ ہم کرے گا ہمت۔''

''خواہ مخواہ خود کو اور پریشانیوں اور تکلیف میں مت ڈالو مرجان۔''

''تو جو کچھ ہمارے معصوم بچے کے ساتھ ہوا..... اس سے بڑھ کر کیا تکلیف ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہماری زندگی کا سب سے بڑا تکلیف ہے دائی اماں وہ پھر رونے لگی، آنکھیں اور منہ سرخ ہو گیا ہچکی بندھ گئی مگر صبر تھا کہ آتا ہی نہ تھا۔''

''ہمیں تو لگتا ہے اللہ نے ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا، دنیا بھر کی تکلیفیں، مصیبتیں دکھ، ہمارے ہی سر ڈال دیے۔ کیوں کیا اس نے ہمارے ساتھ ایسا اور بھی تو دنیا ہے۔ کیسی آباد، خوش، مطمئن، لوگوں کو ہاتھوں سے نوازا ہے۔ اور ہمارے دونوں ہاتھوں میں۔'' اس نے اپنے ہاتھ دائی اماں کی طرف پھیلائے۔

''دیکھو تو اماں لگتا ہے غم کے انگارے اٹھا، اٹھا کر جل گئے ہیں، ہمارا دل غم کی آگ میں جل رہا ہے۔ ہمارے دل سے اور یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتا۔''

''مت شکوہ کرو اللہ سے، یہ تو صرف امتحان ہے بچے، امتحان پہ صبر کرتے ہیں شکوہ نہیں۔''

''ہاں، ہم بھی یہی سمجھتا تھا مگر اب..... کرے گا شکوہ ..... کرے گا گلہ..... ہم ہی ملا ہے اسے امتحانوں کے لیے ..... ہمارا دل دکھ سے بھر گیا ہے، زخمی ہو گیا ہے۔''

''آہ، بچے۔ تم صرف اپنے امتحان اور دکھ دیکھ رہی ہو لیکن سچ تو یہ ہے۔ کوئی دل ایسا نہیں جو اس دنیا سے سلامت گیا ہو۔ کیا بادشاہ، کیا فقیر سب کے لیے ہی زندگی کی آزمائش سخت ہے۔ نہیں بچے۔ اللہ کی ذات سے شکوہ نہیں کرتے، میں تمہاری حالت کو سمجھ سکتی ہوں یہ دنیا تو وہ بھٹی ہے جس میں آنے والا ہر دل جل ہی جاتا ہے۔''

''اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں، کبھی، میرا بھی یہی حال تھا۔ میں بھی ایسے ہی ٹوٹ گئی تھی۔ اللہ بخشے میرے ابو کو انہوں نے مجھے ایسے ہی تسلی دی تھی جسے آج میں تمہیں دے رہی ہوں۔'' دائی اماں مرجان کو مزید ٹوٹنے سے بچانا چاہتی تھیں۔ اس لیے اس نے سمجھانے لگیں۔ اس دنیا میں اگر کچھ نہیں بچتا تو کم از کم اپنا ایمان ہی بچا لو۔ مرجان دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایک دن پریشانیوں سے تنگ آ کر میں بھی

اپنے ابو کے سامنے یونہی شکوہ شکایتیں لے کر بیٹھ گئی، اللہ مجھے معاف کرے..... مجھے میرے کمزور ایمان کی پکڑ میں پکڑے..... میرے مرحوم والد نے مجھے اس وقت اس بزرگ کے بارے میں بتایا جب اس کے پاس ہم جیسا ہی ایک کمزور ایمان کا، دنیا کا ستایا ہوا بندہ آیا اور بزرگ کے سامنے بیٹھ کر استغفار اللہ..... اللہ کی ذات پہ سوال کرنے لگا، کہ اس کی ساری آزمائشیں سن کر بزرگ نے اس سے کہا کہ تم گھر جاؤ اور جا کر حلوہ بناؤ خوب میٹھا اور میوے ڈال کر، مزیدار سا حلوہ..... اور، وہ حلوہ تم اس بندے کو، اس دنیا میں ڈھونڈ کر کھلا دو۔ جو کہے کہ وہ بہت خوش و خرم ہے اور دنیا کا کوئی غم اس کے دل کو نہیں..... اگر اس نے یہ حلوہ کسی ایسے بندے کو ڈھونڈ کر کھلا دیا تو اسی وقت اس کے دکھ اور پریشانیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔'' وہ گھر لوٹا اس نے حلوہ بنایا۔

''پھر.....''

پھر کیا حلوہ اٹھائے صبح سے شام تک خوار ہوتا رہا مگر اس بھری پری دنیا میں اسے کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہ ملا جو اس کا حلوہ کھاتا۔

مرجان بچے چاہے اس دنیا کا سامنا کر کے اس سے لڑ کر جیو، چاہے کسی کونے میں سر چھپا کر..... مگر اس کی ذات سے شکوہ مت کرو۔ میرے بال سفید ہو گئے مجھے تو اپنے ابو کی ایک ہی بات سمجھ میں آئی ہے کہ شکوہ کر کے ایمان کمزور نہ کرو..... دنیا خراب ہے تو آخرت خراب مت کرو۔

''دائی اماں، تم ہماری ماں جیسا ہے۔ اللہ تم جیسی ماؤں کو ہمیشہ سلامت رکھے اگر اس وقت تم نہ ہوتا تو..... غم سے ہمارا دل پھٹ جاتا۔ تمہارے سوا کوئی ہے ہمارا..... کوئی دو لفظ تسلی کے کہنے والا بھی نہیں۔''

''یہ بھی اس کی ذات کا کرم ہے، بندہ ہی بندے کا سہارا ہوتا ہے۔''

''لیکن ہم قسم کھاتا ہے دائی اماں، چپ نہیں بیٹھے گا، انصاف کے لیے سر بھی پھوڑنا پڑا تو پھوڑے گا۔ دنیا کا سامنا کرے گا، لڑ کر جیے گا۔ ہم کیوں منہ چھپائے۔ منہ تو وہ چھپائے جس نے گناہ کیا ہے۔ اگر ہم چپ بیٹھے گا تو وہ اور گناہ کرے گا اور معصوموں کی زندگی تباہ کرے گا۔ ہم ہرگز..... چپ نہیں بیٹھے گا۔''

☆☆☆

مرجان نے سچ کہا تھا۔ اب وہ چپ بیٹھنے والی نہ تھی۔ مرجان اب وہ پہلے والی مرجان نہ رہی تھی۔ اب وہ ایک ماں تھی۔ صرف ایک ماں اس نے ہمت کی محلے کے ایک ایک معزز بزرگ کے پاس گئی۔ ایک، ایک دروازہ کھٹکایا۔ ایک ایک سے بات کی، ایک، ایک کی منت کی۔ مرجان کی بھی غلطی تھی۔ خوامخواہ تردد ہی کیا بھلا غیرت اور ایمان یہ بھی کوئی بات سن سکتا ہے۔ الٹا سب اسی کے گلے پڑے۔ اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ تھانے کے چکر لگاتی رہی۔ محلے کی عورتوں کو روک، روک کر اس مولوی عبید اللہ کا اصل چہرہ اور کردار دیکھانے کی کوشش کرنے لگی۔ ماؤں کو روکنے لگی کہ وہ اس مولوی کے مدرسے اپنے معصوم بچوں کو نہ بھیجیں۔ خیر سچ تو بیشتر کو معلوم ہی تھا۔ مگر یہ مصلحت پسند لوگ ذرا نظریں چرا لیتے۔ وہ اس سبزی فروش محمد رفیق کے پاس بھی گئی۔ اس نے بھی معذرت کر لی۔ کوئی فائدہ نہیں یہ کھائی کھودنے کا۔ میں نے تو اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ تم بھی صبر کر کے بیٹھ جاؤ اللہ کی ذات انصاف کرنے والی ہے ایک دن ضرور انصاف ہو گا۔ بس صبر، مگر مرجان کو صبر کیسے آ سکتا تھا۔ اپنے معصوم بچے کو دیکھتی تو کلیجہ منہ کو آتا۔ ایک دن سب سے مایوس ہو کر مدرسے کے دروازے تک چلی گئی۔ اندر تو کسی نے گھسنے نہ دیا اور نہ ہی وہ اندر جانا چاہتی تھی۔ بس باہر سے ہی مولوی عبید اللہ کو دھکایا، گالی گلوچ کیا۔ دو چار پتھر اٹھا کر مدرسے کے دروازے پہ مارے اور ہانپتی کانپتی گھر آ گئی۔

دو دن نہیں گزرے تو ایک قیامت برپا ہوئی۔ ناہید کا شوہر ایک رات دیوار پھلانگ کر اس کے گھر گھس آیا۔ ارادہ تو خطرناک تھا، عزت پہ ہاتھ ڈالنا چاہا۔ وہ بھی زخمی شیرنی کی طرح غرائی۔ پودینے کا گملا اس کے سر پہ توڑ دیا۔ وہ شور و غل، گالی گلوچ کے رہے نام اللہ کا.....

صبح ہوئی وہ بھی کیا صبح تھی۔ عجب منافق لوگ تھے۔ ایک شریف باکردار عورت کو بے غیرت،

بدکردار کہہ دیا۔ اور ایک غلیظ، بدقماش، بدکردار مولوی کو معزز چند لوگوں کی غیرت نے بہت جوش مارا تو پتھر اٹھا کر اس کے ٹین سے بنے پرانے دروازے پہ دے مارے، دو چار پتھر صحن میں بھی آ گئے۔ معصوم حفظہ، بال، بال بچی..... آخر مولوی عبید کا بدلہ بھی پورا ہونا تھا۔ منہ کھولنے کی سزا..... گھر کے دروازے پہ پتھر۔ یا نصیبا۔ یہ وقت بھی دیکھنا تھا۔

''میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا مرجان..... آخر تم نے میری بات کیوں نہیں سنی۔'' اس واقعہ کے بعد صرف دائی اماں ہی تو اس کے پاس آئیں۔

''تو..... کیا کرتی۔''

''صبر۔''

''بہت کیا، اب نہیں ہوتا صبر۔''

''اب کیا ہوگا، کیا کروگی۔ یہ خبیث، ناہید کا شوہر۔ ایسا تو نہ لگتا تھا۔ جیسے میں جانتی تھی یہ اس مولوی عبید کی ہی شیطانی ہے۔ گھر کی عزت اور چار دیواری تک بات آئے گی تو لوگ کیوں کھڑے ہو کر تمہاری بات سنیں گے اس کے پیچھے اسی ابلیس کا ہاتھ ہے۔''

مصیبت تھی کہ ایک کے بعد ایک اولے کی طرح اس کی چھت پہ برس رہی تھی۔ اب تو لوگ کھل کر اسے بدکردار عورت کہنے لگے۔

''کیوں بھئی، یہ ناہید کا شوہر، خرم اسی محلے میں پیدا ہوا۔ پلا بڑھا سب اس کی شرافت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ عورت خود ہی صحیح نہیں ہے۔ اس نے خود دعوت گناہ دی ہوگی۔ لین دین پہ بات نہ بنی ہوگی تو گالی گلوچ شروع کر دیا ہوگا۔ ان عورتوں کا تو یہی کام ہوتا ہے۔ اور کیا؟''

''ارے، خرم کا کیا قصور وہ تو مرد ذات ہے۔ مرد تو بہک ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ایسی عورتوں کے لیے تو یہ بائیں ہاتھ کا کام ہے۔''

''یہ غلط قسم کی عورت ہے۔ ویسے ہی شریف بنی پھرتی ہے..... خرم کو اس نے خود ہی بلایا ہوگا۔ سوچنے کی بات ہے بھئی اس نے اسی عورت کی دیوار کیوں پھلانگی۔ وہ متقی، پرہیزگار، پانچ وقت کا نمازی، حافظ قرآن اس شخص تک کو نہ چھوڑا۔ اللہ توبہ، کیسے کیسے گھٹیا الزامات لگائے اس امام مسجد پر۔''

''ارے اس کا شوہر بھی، عادی مجرم اور یہ بھی۔''

یہ صرف لوگوں کی زبان سے نکلے لفظ نہ تھے، پتھر تھے جو اسے زخمی کر رہے تھے۔ اس کی روح تک لہولہان ہوگئی تھی۔

''اسے تو نکال باہر کرو اس محلے سے یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ اس بدذات کا یہاں کیا کام.....''

''کچھ تو خوف خدا کرو۔ اس بے چاری پہ ترس نہیں کھاتے تو خود پہ کھا لو۔ تم سے پہلے لوگ بھی خود کو دنیا کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے۔ یہی غرور اکڑ یہی خودغرضی آج کہاں ہیں، کچھ خبر نہیں۔'' دائی اماں بس اتنا کہتیں مگر سمجھنے والا کون تھا۔''

☆☆☆

اس نے اپنے معصوم بچوں کو دیکھا جو بے خبر، بے فکر سو رہے تھے۔

''یہ بچپن بھی کتنی قیمتی، کتنی انمول چیز ہے۔ اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جانے کہاں گیا وہ بچپن، نہ بچپن رہا، نہ گھر رہا، نہ کوئی اپنا..... اس قدر اکیلا پن، اس قدر لاچاری، اس قدر تنہائی، صبر کا یہ امتحان تو قبر بھی ہلا دے۔ دور دور تک کوئی اپنا کوئی ہمدرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نظریں کوئی سہارا، کوئی مسیحا ڈھونڈتیں مگر..... مایوس لوٹ آتیں۔''

زمین والوں سے بے زار ہو کر اس نے آسمان والے کی طرف نظریں اٹھائیں۔

یا اللہ، تو ہی فرماتا ہے۔ نعز و من تشاء، اگر یہ تیری منشا ہے تو، مرجان اس میں راضی ہے ہم تیری رضا میں راضی ہے، تو جس حال میں رکھے ہم اسی حال میں خوش ہے بس ہمیں صبر دے اور استقامت دے کہیں ایسا نہ ہو کہ مرجان کی طرح اس کا ایمان بھی کمزور ہو جائے۔ مرجان کی دنیا چاہے برباد ہو جائے میرے اللہ، میرے پروردگار، اس کی آخرت برباد نہ ہونے دے۔ اس کی آخرت بچا لے۔''

اس نے معصوم عثمان کے سر سے اپنا ہاتھ اٹھایا

اور دونوں ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا کر دیکھتے ہوئے کچھ اور دل برداشتہ ہوگئی اور ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

''تو گواہ ہے، مرجان نے ہر غم، ہر دکھ، ہر نقصان پہ صبر کیا آج تو عزت کا جنازہ بھی دروازے سے نکل گیا، ہم اس پہ بھی فاتحہ پڑھ کر صبر کرتا ہے۔ آہ، اک عزت ہی تھی، اب وہ بھی ہی ہوگئی۔ اب تو اس بدبخت مرجان کے ہاتھ بالکل خالی رہ گئے۔ کچھ نہ رہا، کچھ بھی نہیں۔ یا اللہ، ہمیشہ یہی سنا جس کا کوئی نہیں اس کا تو ہے۔ یا اللہ دیکھ آج اس کمزور، لاچار اور بے بس مرجان کو۔ دیکھ اے میرے اللہ، آج ہم کتنا اکیلا ہے..... کتنا تنہا'' بے تحاشا رونے سے اس کے دل کی دھڑکن بھی بے ترتیب ہونے لگی۔

''امارا کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں بس تو روتے روتے ہے اس نے آنکھیں بند کیں۔ گھپ اندھیرا..... وہی سخت رات اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ موت جیسی خاموشی، گہری تاریکی، تنہا، ڈری سہمی بھاگتی ہوئی مرجان اور وہ گیدڑ، اس کے خوں خوار پنجے اور دانت جس نے اچانک چھلانگ لگا کر مرجان کی چادر کو دانتوں میں دبوچ لیا تھا، پھر اسے لگا وہ گیدڑ نہیں..... اسے مولوی عبید کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے گھبراتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اسے لگا وہ گیدڑوں کی بستی ہی میں رہ رہی ہے۔ اردگرد غول در غول بس گیدڑ کسی انسان کا دور، دور تک نام ونشان نہیں۔

''اکیلے آدمی پہ تو یہ گیدڑ بھی شیر ہوتے ہیں۔''

اسے اب سمجھ میں آیا اپنی ماں کا وہ جملہ اچھا تو یہ انسانوں کے لیے تھا، ان جنگلی جانوروں اور گیدڑوں کے لیے نہیں۔ وہ تنہا اور کمزور تھی۔ اس لیے تو سب اس پہ شیر ہو رہے تھے۔ اس گیدڑ سے تو چادر چھڑوالی تھی مگر اس بھیڑیے سے کیسے اپنی چادر چھڑواؤں۔

''اے میرے اللہ تو ہی میری مدد کرتوں ہی کوئی راہ دیکھا۔ میں تجھ سے کچھ نہیں مانگتی، مگر صرف تیرا انصاف، تیرا عدل میرے پروردگار، یہ رات تو اس رات سے بھی زیادہ سخت ہے، یہ امتحان تو اس امتحان سے بھی کڑا ہے۔''

اس ظالم، بے رحم مولوی نے میرے سر سے عزت کی چادر چھینی ہے۔ اسے بھی عزت کی موت نصیب نہ کر۔ کاش اے میرے اللہ تو کوئی ایسا معجزہ کردے کہ اس رذیل کا سر ہو اور مرجان کے پاؤں ان شاء اللہ جب یہ وقت آئے گا، مرجان اس پہ بالکل رحم نہیں کھائے گا۔ اس کا وہی حشر کرے گا جس کا وہ حق دار ہے۔

☆☆☆

''اب کیا ہوگا؟ اب تم کیا کروگی؟'' صرف دائی اماں کو اس کی پاک دامنی کا یقین تھا۔ پورے محلے اور اپنے بچوں کی مخالفت کے باوجود اس کے پاس آجاتیں۔

''ہم اس جگہ..... اس محلے میں اور نہیں رہ سکتا۔ امارا دل گھٹتا ہے۔ امارا روح تنگ پڑتا ہے۔ بس ہم چلا جائے گا یہاں سے.....''

''کہاں..... کہاں جاؤ گی؟''

''اللہ کا زمین بہت بڑا ہے دائی اماں، کہیں بھی۔''

''تم بہت سادہ ہو مرجان، میری بچی..... اس دنیا کے اصول عجیب ہیں، یہ بڑے لوگوں کے لیے بڑی اور وسیع اور ہم جیسے غریبوں کے لیے، تنگ اور چھوٹی ہوتی ہے۔''

''سچ کہتی ہو اماں اب تو یہ دنیا ہمیں بس ایک قبر جتنی ہی لگنے لگی ہے، تنگ اور تاریک..... بس ہم اور یہاں نہیں رہ سکتا ان لوگوں میں امارا دل تنگ پڑتا ہے۔''

''میں تو کہتی ہوں، مت جاؤ میری بچی..... تمہارے پاس اور کون سی جگہ ہے، یہاں لے دے کر سر پہ اک چھت تو ہے۔ اگر تمہارا شوہر ساتھ ہوتا تو اور بات تھی مگر یوں اکیلے یہ دنیا بھی ایک سمندر جیسی ہی ہے۔ یہاں ایک سے ایک بڑا مگر مچھ گھات لگائے بیٹھا ہے کسی نئی جگہ کسی نئی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔''

''اب جو ہوگا دیکھا جائے گا..... یا مقدر، یا نصیب، اب رہ ہی کیا گیا ہے امارے پاس جس کی فکر کرے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اچھا! میں اب چلتی ہوں، میرے بہو، بیٹوں کو پتا چلا کہ میں تمہاری طرف آئی ہوں تو بہت

مصیبت ہو جائے گی۔"

"ہم جانتا ہے، وہ بھی سب کی طرح ہم سے ہی نفرت کرتا ہے۔ ہمیں ہی غلط سمجھتا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"چھوڑ وان لوگوں اور اس دنیا کی باتیں، انہوں نے کب بخشا ہے کسی کو، اب بولنے والوں کی زبانوں کو تو کوئی نہیں پکڑ سکتا ناں، سب کو سب نظر آتا ہے مگر عجب منافقت ہے۔ اب اس ناہید کے شوہر کو دیکھو، اللہ کرے ٹانگیں ٹوٹیں اس کی دیوار پھلانگ کر اک اکیلی عورت پھر بھی کہنے والوں نے اسے کچھ نہیں کہا اور پتھر بھی تمہارے ہی دروازے پہ پڑے۔ حالانکہ کس کو نہیں پتا کہ یہ سارا کیا دھرا اس خبیث مولوی، کیا نام ہے اس کا، اچھا چھوڑ و دفع کرو۔ اللہ ہی پوچھے ان ظالموں کو۔" میں تو کہتی ہوں دنیا سانجھی، مگر قبر اپنی اپنی اپنا حساب تو بندے کو خود ہی اللہ کو دینا ہے۔ خیر میں تو تمہیں اپنی بیٹی ہی سمجھتی ہوں۔ اس لیے تو سب کی پروا چھوڑ کر تمہارے پاس آ جاتی ہوں۔"

"تم بہت اچھا ہے دائی اماں..... اللہ تم کو اس کا اجر دے۔"

"کاش میں تمہارے کچھ کام آ سکتی۔"

"دائی اماں آپ نے امارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ جب بھی آپ کے کندھے پہ سر رکھ کر روتا ہے، جینے کا ہمت بڑھ جاتا ہے۔ ورنہ تو، پتا نہیں مرجان کب کا حرام موت مر گیا ہوتا، صرف آپ کے منہ سے نکلے دو لفظ ہی مرجان کے لیے مرہم سے کم نہیں۔ آپ کا بہت بڑا قرض ہے مجھ پر، اگر کبھی اتارنے کا موقع ملا تو ان شاء اللہ ضرور اتارے گا۔"

"قرض کیسا، بلکہ مجھے تو شرمندگی ہے کہ تمہارے لیے کچھ نہ کر سکی۔"

"دائی اماں، امارا ایک کام کرو گی۔"

"کیوں نہیں میری بچی، کیا کام ہے؟"

"ہم کو خلیل اللہ سے ملنا ہے، بہت ضروری ہے، اسے بتائے گا ہم کس حال میں ہے اور یہ بھی کہ اب ہم اس گھر اور اس محلے میں اور نہیں رہ سکتا کہیں اور جا رہا ہے۔"

"تو کیا تم وہاں جاؤ گی؟"

"مجبوری ہے۔"

"مت جاؤ جیل وہ کسی شریف عورت کے جانے کی جگہ نہیں۔"

"تو اور کیا کرے؟ دائی اماں تم ہی بتاؤ مرجان کے پاس اور کون سا راستہ ہے؟"

☆☆☆

آخر، وہ جیل کے دروازے تک بھی آ گئی، چھوٹی سی حفظہ گود میں اٹھائے عثمان کو دائی اماں کے حوالے کر کے آئی۔

"ہمیں وہ اپنے شوہر سے ملنا ہے۔"

"شوہر؟ او بی بی نام بتاؤ..... نام کیا ہے اس کا؟"

"جی..... وہ، خلیل..... خلیل اللہ۔"

"آج ملاقات کا دن نہیں ہے منگل کو آنا۔ شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس۔"

"شناختی کارڈ..... وہ تو نہیں ہے امارے پاس۔"

"منگل کو آنا، شناختی کارڈ لے کر۔"

"بھائی ہم بہت دور سے آیا ہے، اتنا کرایہ لگا کر..... روز، روز نہیں آ سکتا، تم مہربانی کرو ہمیں ملنے دو۔"

"ارے بی بی، کہاں ہاں، نہیں مل سکتی۔"

"دیکھو بھائی، امارا مجبوری سمجھو، ہم منت کرتا ہے، ہمیں ملنے دو، مہربانی ہوگا۔"

"اچھا، تو پھر کوئی..... چائے پانی کا انتظام ہے؟"

"چائے پانی؟"

"او، ہو..... کچھ..... پولیس والے نے ہاتھ کے اشارے سے رقم کا اشارہ کیا۔"

"امارے پاس، امارے پاس تو نہیں ہے۔"

"پھر تو تم، بالکل نہیں مل سکتیں۔"

"ایسے کیسے نہیں مل سکتا۔" مرجان نے غصے میں برقعہ اٹھا کر سر سے پیچھے گرایا۔

"ہمیں بیوقوف سمجھا ہوا ہے، وہ شوہر ہے امارا، ہم مل کر ہی جائے گا۔"

"او بی بی یہ جیل ہے کوئی تیرا سسرال نہیں، جاؤ

یہاں سے۔"

"کہہ دیا ناں، نہیں جائے گا..... ملے بغیر تو بالکل نہیں جائے گا۔"

"اف عجب پاگل پٹھانی ہے۔ یہ جیل ہے محترمہ، یہاں کے کچھ اصول ہیں۔"

"ہاں، ہاں دیکھ لیا تمہارا اصول، جہاں یہ ایسی دو نمبری ہو وہاں اصول کیسا؟" اتنے میں شور سن کر تھانیدار آ ٹپکا۔

"کیا شور مچایا ہوا ہے۔"

"یہ ہمیں اماری شوہر سے ملنے نہیں دیتا۔"

"وہ سر..... اس کے پاس شناختی کارڈ ہے نہ ملنے کا دن۔"

"ہاں، ہاں اور رشوت کا پیسہ بھی نہیں، جو تم ابھی ہم سے مانگ رہا تھا۔"

"جھوٹ بولتی ہے سر، میں نے کب..... پیسے کا نام لیا۔"

"نام نہیں لیا، اشارے سے تو مانگا۔"

"غلام رسول، تم کبھی نہیں سدھرو گے۔"

"آپ اماری ملاقات کروادو ناں۔" مرجان نے مڑ کر تھانیدار کی طرف دیکھا اور..... بس..... دیکھا اور کیوں دیکھا۔ تھانیدار تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

"غلام رسول، اس کی ملاقات کرادو۔" وہ خلیل اللہ سے مختصر وقت کے لیے ملی۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو۔ تم میں عقل ہے کہ نہیں، منہ اٹھا کر جیل میں چلی آئیں۔"

"اب تم جیل میں ہو تو جیل میں ہی آئے گا ناں کسی اچھی جگہ ہوتا تو وہاں ملنے چلے جاتا۔"

"تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا یہاں۔"

"مجبوری تھا، کوئی شوق سے نہیں آیا ہم۔"

"جو بھی مجبور ہوتا، تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ شریف لوگوں کے آنے کی جگہ نہیں۔"

"ہم بھی تو تمہیں یہی سمجھاتا تھا کہ یہ شریف لوگوں کی جگہ نہیں۔"

"واہ سمجھ دار عورت، تم یہاں طنز کرنے آیا ہے۔"

"تم نے سمجھا ہی کب..... اس مرجان کو..... تمہارے یہاں آنے کے بعد ہم نے جو عزت اور شرافت کے جنازے اٹھائے ہیں۔ ہم تو ماتم کرنے آیا تھا۔ تم کو طنز لگتا ہے..... اماری حالت تو دیکھو، طنز کرنے کے قابل ہے ہم۔"

"ملاقات کا وقت ختم بی بی، چلو جلدی کرو۔" پولیس والے نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

"خلیل اللہ وہ....."

"نہیں..... پہلے تم اماری بات سنو۔" خلیل اللہ نے اسے ٹوک دیا۔

"وقت نہیں ہے، پہلے تم اماری بات سن لو۔" مرجان نے گویا منت کی۔

"نہیں، کہا ناں، پہلے اماری بات سنو، مرجان تم نے یہاں آ کر غلط کیا ہے بہت غلط، آئندہ ہم مر بھی جائے تو ادھر مت آنا۔"

"ملاقات کا وقت ختم، سنا نہیں تم نے..... جلدی کرو۔ خواہ مخواہ کسی نے شکایت لگا دی تو میرے لیے مصیبت ہو جائے گی۔" تھانیدار نے پھر اسے چلنے کے لیے کہا۔

وہ جو بات کرنے گئی تھی کی ہی نہیں، بس اتنا کرایہ لگایا، بے کار کا تردد کیا، مصیبت کاٹی، منہ ماری کی اور کچھ حاصل وصول بھی نہ ہوا۔

☆☆☆

دوسرے دن ہی شام کے بعد پولیس کی دو بڑی بڑی گاڑیاں دروازے تک آئیں۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ خدا خیر کرے..... مگر خیر کہاں تھی۔ ڈی ایس پی چوہدری شوکت علی، تھانیدار سے اس کے حسن کا تذکرہ سن کر دیوانہ وار چلا آیا تھا۔ مرجان نے پولیس کی گاڑیوں کی آواز سنی، گھبراہٹ میں دروازہ کھولا اور.....

قانون کے محافظ نے ..... قانون کی نگرانی میں..... انتہائی دھڑلے سے دن دھاڑے شریفوں کے محلے میں ایک باعزت گھر کی چار دیواری کی حرمت پامال کر کے..... ایک شریف عورت کی عزت لوٹ لی۔"

کہاں گئی وہ محلے کی غیرت..... وہ تو بس..... انا

للہ وانا علیہ الیہ راجعون۔ وہ بے چاری چیخی بھی تھی، آوازیں بھی دی تھی، مدد کے لیے بھی پکارا تھا، مگر شریفوں کے محلے میں اتنے زیادہ شریفوں کے گھر، شریف زادوں سے بھرے ہوئے ..... گویا سارے گونگے، بہرے یا شاید اسرافیل نے سور پھونک دیا تھا۔ اس رات لگا یہ شہر، آباد لوگوں کا شہر تھوڑا ہی ہے یہ تو بس شہر خموشاں ہے۔

وہ ..... ایک کمزور، اکیلی عورت کی مدد کرنے کے بجائے۔ اس کے کردار پہ انگلی اٹھانے والے..... وہ معاشرے کے بااثر، معزز، ٹھیکیدار، چودھری شوکت علی کا سامنا بھی کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اسے روکنا تو دور کی بات۔ گھٹیا، منافق لوگ۔

☆☆☆

آہ ..... صبح ہوئی ..... کیا صبح تھی۔ گزشتہ رات کی تاریکی اور اس کی سیاہی گھر کی دیواروں سے چمٹ گئی یہ سیاہی صرف اس گھر کی چار دیواری تک تھوڑا ہی محدود تھی۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو ..... باہر دور، دور تک پھیل گئی۔

وہ باہر نکلی بچوں کے دودھ کے لیے، سبزی کے لیے، وہ اس سبزی فروش محمد رفیق کے پاس گئی۔ سبزی لی۔ وہ اسے کچھ ..... عجیب و غریب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مرجان نے تیز نظروں سے اسے گھورا تو اس نے نظریں چرالیں۔ صرف وہی نہیں، ہر کوئی ..... ہر کوئی نظریں چرا رہا تھا۔ سب کے دل میں چور تھا۔ اپنے، اپنے چور کو چھپا رہے تھے۔ مرجان کی نظروں کا سامنا کرنے کی کس میں ہمت تھی؟ اس نے کسی سے کچھ نہ کہا، کوئی شکوہ نہ کیا۔ بس اس کی خاموشی، جب وہ کسی کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتی تو پتا نہیں ..... کیوں سب کو ایسا لگتا، جیسے اس نے لعنت ہی بھیجی ہو ..... لعنت۔

کوئی نہ آیا ہمدردی کرنے کو، مگر صرف وہ ..... دائی اماں، ہانپتی کانپتی۔

''مرجان، بچے۔ کہو سچ نہیں، جو سنا وہ سچ نہیں۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ماں جیسے آنسو، مگر ایک کمزور، بے بس ماں جیسے آنسو۔

''سچ ہے۔'' اس نے بے زاری سے کہا۔

''خدا کی لعنت، خدا کی لعنت ہو اس پر .....''

''صرف اس پر کیوں؟'' وہ جو دروازے سے ذرا اندر کھڑی تھی، باہر نکل آئی گویا قفس میں قید، صدیوں پرانی روح، بنا کفن کے، بغیر پردے، بغیر برقعے اور چادر کے پہلی دفعہ ..... اپنی زندگی میں پہلی دفعہ۔

''ان سب پہ کیوں نہیں۔ ان سب پہ لعنت بھیجو، دائی اماں۔'' وہ چیخ کر بولی، اس کی آواز سے کچھ عورتیں ٹوٹی ہوئی گریلوں سے جھانکیں اور کچھ کھڑکیوں سے، کچھ ادھ کھلے دروازے سے وہ گلی کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ جو محلے کے دو چار مرد گزر رہے تھے۔ راستہ بند ہونے کی وجہ سے مجبوراً رک گئے۔

''دائی اماں انہوں نے مجھے نشئی اور مجرم کی بیوی کہا، ہم نفرت کی، ہم پہ لعن طعن کی، ہمیں برا بھلا کہا۔ ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھا، ہمیں گالی دی، ہمیں کوئی دکھ نہیں، امارے شوہر نے کام ہی ایسا کیا تھا ہم اسی قابل تھا مگر ..... جو امارے معصوم بچے کے ساتھ ہوا اور جو پچھلی رات امارے ساتھ ہوا ..... ان غیرت مندوں کو ہمت ہی نہ ہوا۔ ایک لفظ بھی کہنے کو ..... لعنت ہے تم لوگوں پہ، تم لوگوں کی بزدلی پہ، لعنت تم لوگوں کی اس دکھاوے کی غیرت پہ، خدا کا قہر نازل ہو تم سب پہ، بے غیرت ..... منافق۔''

اس نے غصے سے زمین پہ تھوکا مگر چھینٹے شریفوں کے منہ تک گئے تھے۔

☆☆☆

شام کو صحن میں بچھی چارپائی پہ بیٹھی وہ خالی، خالی، اداس آسمان کے پھیکے رنگ کو دیکھ رہی تھی کہ ناہید نے اسے دیوار سے آواز دی۔

''مرجان!'' مرجان، میری بات سنو۔

''تم .....''

''ہاں ..... میں۔''

''تمہارا شوہر، تمہارا ساس غصہ نہیں کرے گا تم پہ۔''

''نہیں، وہ گھر پہ نہیں، ساس دوائی کھا کر سو رہی ہے۔'' وہ ذرا جھک کر بولی۔

''مرجان..... وہ میں، میں تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔''

''کس بات کی معافی.....؟ تم نے کیا کیا ہے؟''

''کیا ہے تو معافی مانگ رہی ہوں ناں۔'' وہ رک رک کر بولی جیسے لفظوں کے بوجھ نے اسے تھکا دیا ہو۔

''ہم سمجھا نہیں۔''

''مرجان، میں بہت شرمندہ ہوں۔'' اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''تم کیوں شرمندہ ہو، تم نے تو کچھ نہیں کیا، تم نے تو اپنے شوہر کو نہیں کہا کہ وہ دیوار پھلانگ کر کسی عورت کی عزت خراب کرے۔''

''ہاں، کہا تو نہیں..... لیکن منع بھی تو نہیں کیا۔'' اس نے جھجکتے ہوئے مرجان کی طرف دیکھا تو اس کی نظروں میں ڈھیر شرمندگی تھی۔

''میں جانتی تھی کہ وہ..... اس رات جو بھی اس نے کیا۔''

''مطلب؟ مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''وہ..... مولوی عبید اسی نے دو لاکھ خرم کی ہتھیلی پہ رکھے تھے اسی نے کہا تھا یہ سب کرنے کو، میں سب جانتی تھی لیکن، میں بھی، میں بھی لالچ میں آ گئی تھی۔ اس لیے نہ اسے منع کیا، نہ روکا خاموش رہی، چپ رہی۔ اب یہ خاموشی میرے سینے کا بوجھ بن گئی ہے مرجان!'' وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

''مجھے معاف کر دو۔ تم نے ایک بہن جتنا مجھ پہ اعتبار کیا، ایک سہیلی جیسا پیار..... مگر ہم واقعی کم ظرف، منافق..... تم بالکل صحیح کہتی ہو۔ ہم نے ہمسائے کے حق کا خیال تو کیا اکیلی عورت ہونے کا بھی لحاظ نہ کیا۔ انسانیت تو کیا، خوف خدا تک نہ کیا۔ مجھے معاف کر دو۔ اس رات بھی جب پولیس والے نے..... تمہاری آوازیں آتی رہیں اور ہم بزدل بے حس دل پر پتھر کر کے لیٹے رہے، بے غیرتوں کی طرح۔''

''بس ناہید، ہم سمجھ گیا۔''

مرجان پیچھے ہٹنے لگی تو، ناہید نے تیزی سے دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

''نہیں پہلے کہو، تم نے معاف کر دیا۔''

''اماری کیا اوقات، کہ ہم معاف کرے کسی کو، اللہ ہی معاف کرے تم لوگوں کو۔''

''میری بات تو سنو، مرجان۔''

''سن تو لیا ہے، کیوں امارے زخم تازے کرتی ہو۔ جاؤ..... تم جاؤ، تمہارا ساس جاگ گیا تو، تمہارا حشر کر دے گا۔''

''تم نے..... معاف کر دیا ناں مجھے۔''

''پتا نہیں۔'' مرجان نے ایک ہاتھ سے اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کی اور انتہائی سرد مہری سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔

''مرجان، تم صرف ایک دفعہ کہہ دو، تم نے معاف۔''

''ناہید.....!''

پیچھے سے غصے میں، اس کی ساس نے اس کو آواز دی تو وہ بجلی کی سی تیزی سے نیچے اتری مگر..... اس کی ساس سب سن چکی تھی۔

''شوہر نے وفاداری نبھائی نہیں جاتی، بازاری عورتوں کے ساتھ یاریاں نبھاتی پھر رہی ہے۔ ساس کا خیال رکھتے تجھے موت پڑتی ہے اور اس دو ٹکے کی عورت کا بڑا ہی خیال آ گیا تجھے۔''

اور اس رات ناہید کے شوہر اور ساس نے اسے مارا، اور اس قدر برا مارا کہ اگلے دن اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔

☆☆☆

اگلی ہی رات ڈی ایس پی چوہدری شوکت علی پھر آ دھمکا۔ دروازے تک آتی بڑی، بڑی گاڑیوں کا شور، تنگ، تاریک خاموش گلیوں میں دور تک تھا۔ شور شرابے کا ڈر تو کمزور، غریب لوگوں کو ہوتا ہے۔ ایسے بااختیار اور طاقت ور لوگوں کو کہاں کی فکر، دروازہ کھولا، تو وہ سامنے ہی کھڑا تھا، دونوں ہاتھ دروازے کی کواڑ پہ ٹکائے، اپنی مضبوط بازوؤں پہ سارے جسم کا بوجھ ڈالے..... اس نے نشے سے مست نظروں سے مرجان کو دیکھا۔ وہ شراب سے سرخ ہوتی آنکھیں، موٹی موٹی مونچھیں، حرام کھا کھا کر موٹے

تازے بیل کی طرح تھل تھل کرتا وجود۔

''میری ایک عادت ہے جو ایک دفعہ کھاتا ہوں، دوبارہ منہ نہیں لگاتا۔ کیا کروں، بری عادت ہے، منہ کا ذائقہ بدلنے کی، مگر تم اتنا خوب صورت، اتنا پیارا، تمہارا نشہ منہ کو لگ گیا، شیشے میں کنگھی کررہا تھا، تو تمہارے پیار کی نشانی دیکھی تو دل بے اختیار...... پھر تمہارے پاس کھینچ لایا۔'' اس نے اپنی گردن پہ پڑے زخموں کی طرف اشارہ کیا جو شاید، مرجان کے ناخنوں سے بنے تھے۔ وہ دو قدم آگے بڑھا، مرجان دو قدم پیچھے ہوگی۔

''رکو، زبردستی کی ضرورت نہیں، اپنے قدم یہیں روک لو، تمہیں جو چاہیے تمہیں مل جائے گا۔''

مرجان کا غیر متوقع رویہ، غیر متوقع جواب اور غیر متوقع، پرسکون لب و لہجہ، وہ حیران ہوگیا۔

''کیا ہوا؟ آج لڑو گی نہیں، گالی نہیں دو گی، شور نہیں مچاؤ گی، مدد کے لیے بھی...... کسی کو نہیں بلاؤ گی۔''

''نہیں...... وہ ہمیں پرسوں رات غلط فہمی ہوگیا تھا۔''

''کیسی غلط فہمی۔''

''کہ ہم بڑے شریفوں کے درمیان رہتا ہے، گلا پھاڑنے کا فائدہ؟ یہاں کون سا کسی نے آجانا ہے۔''

''ہا، ہا، ہا وہ پورا منہ کھول کر ہنسا، اک طاقت اور نشے میں مست قہقہہ۔''

''دیکھو، تھانیدار صاحب، تمہیں جو چاہیے تمہیں مل جائے گا۔ مگر ہمیں بھی بدلے میں کچھ چاہیے۔''

''ہاں بولو، مانگو......'' وہ مرجان کی طرف مست شرارتی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی اک مست نظر ہی بتا رہی تھی کہ وہ زندہ دل، من موجی، اپنی من مانی کرنے والا، اس کی تیندوے جیسی آنکھوں کی چمک، وہ ایسے لوگوں میں سے تھا جو اپنی زندگی جیتے ہیں قدم، قدم پہ جیتے ہیں، چاہے اک قدم پہ ہزاروں مریں ...... بے پرواہ بے نیاز ہوکر۔

''ویسے تم مجھے اتنی سمجھ دار عورت لگی تو نہیں تھیں۔ مگر بات سمجھ داری کی کر رہی ہو، اچھا ہے لین دین میں ضمیر ذرا مطمئن رہتا ہے، مانگو، مانگو بدلے میں کیا چاہیے۔''

''سچ کہتے ہو سمجھ دار تو میں نہیں تھی۔ دنیا کے ہاتھ لگ گئے۔ سمجھ دار ہوگئی ہوں۔ یہ دنیا بھی عجیب، عجب خانہ ہے بڑے بڑے احمقوں کو سمجھ دار اور بڑے بڑے سمجھ داروں کو احمق بنا جاتی ہے۔'' وہ اس کی بات پہ پھر مسکرا دیا۔

''کیا چاہیے تمہیں؟''

''وہ بچے...... بہت بھوکے ہیں صبح سے، ساتھ والی گلی میں ہوٹل ہے، دودھ منگوا دو...... ایک کلو۔''

''وہ ہنسا، پھر ہنسا اس دفعہ سب سے زیادہ زور سے ہنسا۔''

''کیا؟ دودھ، وہ بھی کلو بس ایک کلو دودھ۔'' وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا، جیسے مرجان نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

''اوئے رسول بخش۔'' ایک کمزور بوڑھا سا شخص سپاہی ذرا اندر آیا۔

''جی سر۔''

''سامنے ادھر، ہوٹل سے چار، پانچ کلو دودھ پکڑ لاؤ۔ ہماری مرجان بھی تو پیئے گی۔ واہ کیا قدرت کا شاہکار ہے خوب صورت انمول اور اوپر سے نام رکھنے والے نے سونے پہ سہاگا، نام بھی کیا رکھا۔ مرجان...... آہ، میری جان۔''

☆☆☆

اب چوہدری شوکت علی کا اکثر آنا جانا ہوتا۔ اسے کھانے پینے، گھر کے راشن کے لیے کسی فکر کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ سپاہی رسول بخش ہر ہفتے ڈھیر سارا سودا سلف گھر پہ ڈلوا دیتا۔ اس نے شوکت علی سے کہا تو نہیں۔ اس نے خود ہی سپاہی رسول بخش کی ڈیوٹی مقرر کر دی تھی کہ وہ اس کا خیال رکھے کسی قسم کی پریشانی نہ ہونے دے۔ وہ گھر کے حالات بھی اچھی طرح جان گیا تھا۔

ایک رات وہ آیا تو یہیں سو گیا، صبح آنکھ کھلی تو دیکھا...... مرجان چولہے پہ چائے بنا رہی تھی، بچوں کو چولہے کے پاس بٹھایا، رس کھلا رہی تھی، وہ دیکھتا رہا کافی دیر...... اسے اس سے کچھ انسیت سی ہوگئی تھی یا شاید محبت

.....قدرت کی مصوری کا ایک خوب صورت شاہکار، سادگی میں حسن ایک مکمل حسن، نہ سرمہ، نہ کجلہ، نہ سرخی، نہ گجرا..... تتلی کے پروں، کلیوں کی نازکی، پھولوں کی نرم و نازک خوشبودار پتیوں کی خوب صورتی..... قدرتی خوب صورتی میں اور کوئی کیا اضافہ کرسکتا ہے۔ وہ تو مکمل ہی ہوتے ہیں۔ اپنے آپ میں مکمل..... مرجان کا حسن بھی کسی چیز کا محتاج نہ تھا وہ تو بس..... مکمل تھا، اپنے آپ میں مکمل۔ وہ اسے محبت بھری نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، اور، وہ بس سر جھکائے، اپنے کام میں مصروف اسے تو جیسے کوئی پروا ہی نہ تھی کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے..... اور کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔

''مجھے چائے نہیں پلاؤ گی۔''

اس نے جواب تو نہ دیا۔ بس ایک پیالے میں چائے ڈال کر اسے بھی پکڑا دی۔ اس نے پی اور وہ صبح کی صاف، واضح روشنی میں باہر نکل گیا اس کے جانے کے بعد بھی کسی پتھر کی ہمت نہ تھی کہ اس کے دروازے سے ٹکراتا اور وہ، نام نہاد معاشرے کے معزز ٹھیکیدار جو کل تک آستینیں چڑھا کر ایک اکیلی، کمزور عورت کے پیچھے لٹھ لے کر پڑے تھے اور اسے اس شریفوں کے محلے سے دھکے دے کر نکالنے کی بات کرتے تھے۔ وہ تو گویا اپنی شرافت کی پگڑیاں اتار کر ان پر جوکڑی مار کر بیٹھ گئے تھے۔ اگر گلی میں کسی نے غلطی سے ڈی ایس پی کو دن دھاڑے گھر کے دروازے سے نکلتے دیکھ بھی لیا تو یوں نظریں بچائیں جیسے..... پوچھنے والے سے کہیں گے۔ بھئی ہم نے تو صحیح دیکھا ہی نہیں ہمیں کیا معلوم بندہ تھا؟ یا ہوا؟

ہوں..... بزدل، منافق لوگ.....''

لوگ بے چارے بھی کیا کریں۔ ایک تو وہ مربعوں کا مالک، زمینوں، جائیدادوں والا اور اوپر سے..... ڈی ایس پی کا عہدہ؟ غریب کا تو ہر کوئی بھاگ کر گریبان پکڑ لیتا ہے مگر ہائے یہ امیر با اختیار لوگ؟ اس کے جانے کے بعد مرجان نے برقعہ اٹھایا، اسے غور سے دیکھا اور..... جلتے چولہے میں ڈال دیا۔

آہ، عزت و شرافت کے بڑے لبادے اس دنیا نے اتارے، ایک آدھ اس نے بھی اتار دیا تو کون سا گناہ کیا؟ ویسے بھی زندگی کے اس مقام پر آ کر اس نے شریفوں کے وہ، وہ روپ دیکھے کہ اب تو..... اس کے سامنے سارے ہی ننگے تھے۔ یہ شرافت کے پردے بھی اسے منافقت کے لبادے لگنے لگے۔ اسے بیگم صاحبہ کا وہ..... نام نہاد، حاجی، پنج وقت کا نمازی شوہر یاد آ گیا۔ بیگم صاحبہ سے نظریں بچا کر کیسی، کیسی گھٹیا حرکتیں کر جاتا تھا۔ کس قدر تنگ تھی مرجان اس کی نام نہاد شرافت سے اور بیگم صاحبہ..... یا تو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کی ہوئی تھیں..... یا ہوگی کوئی اللہ میاں کی گائے..... اپنے شوہر کی شرافت کی مثالیں دیتی پھرتی۔

''حاجی صاحب جیسا شریف اور با کردار شوہر اللہ سب کو دے۔'' آمین۔

''ارے میں تو اندھا اعتبار کرتی ہوں اپنے شوہر پر۔''

ہوں..... اسی اعتبار کی آڑ میں ہی تو اس نے اندھی بنایا ہوا تھا بے چاری بیگم صاحبہ کو..... مرجان کو سوچ کر ہنسی آ گئی دنیا کی منافقت پہ..... یا وقت بدل گیا تھا یا مرجان..... پہلے جن باتوں پہ رونا آتا تھا۔ اب انہی باتوں پہ ہنسی۔

☆☆☆

''کیسے رہ لیتی ہو تم، اس غلیظ اور گندے علاقے میں، یہ جگہ تمہارے قابل نہیں ہے مرجان۔ تم چاہو تو میں تمہیں ایک خوب صورت سا بنگلا خرید دیتا ہوں کسی بہت اچھے علاقے میں۔''

''نہیں، ہم یہیں ٹھیک ہے۔''

ایک وقت تھا کہ مرجان اس گھر اور اس علاقے سے دور، بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی مگر اب..... اس نے فی الحال، اب ایسا کوئی بھی ارادہ ترک کر دیا تھا ''مرجان'' اس نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ کر اپنے پاس چارپائی پہ بٹھا لیا۔

''دل بے اختیار ہی تمہاری طرف کھنچا چلا آتا ہے، تم جانتی ہو کیوں؟''

''کیوں.....؟''

''پتا نہیں تم عام سی عورت نہیں ہو لگتا ہے خاص

ہو، بہت خاص۔"

"ہوں..... وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی جو مرجان کے چہرے پہ پھیل گئی۔"

"خیر اب ایسا بھی کچھ نہیں۔"

"تم کیا جانو، مرجان، میری جان..... ہیرے کی کوئلے کی کان میں کیا اہمیت اس کی قیمت کا اندازہ تو اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی بادشاہ کے تاج پہ سجتا ہے۔ سات سمندر کی تہ میں مرجان صرف ایک معمولی سا، پودے کا بیج ہی تو ہے پہچان تو جوہری کے ہاتھ دیتے ہیں اسے۔"

"رہنے دو پہچان کو وہ۔" بیزاری سے اٹھی تو اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"اف! یہ بے اعتنائی۔ کون نہ مر مٹے اس بے نیازی پر، تم کہتی ہو تم اس جگہ کے قابل نہیں، میں کہتا ہوں یہ جگہ تمہارے قابل نہیں تم جا کر دیکھو تو سہی گلبرگ کا وہ بنگلا، جو میں نے خاص تمہارے لیے دیکھا ہے۔ بہت اچھی جگہ ہے۔ بالکل تمہارے قابل۔"

"ہم کسی قابل نہیں۔"

"تم بہت قیمتی ہو مرجان، اور خاص چیز کو خاص جگہ پہ ہی رکھا جاتا ہے۔"

"تمہارا بیوی ہے؟" مرجان نے اچانک بات بدلی۔

"او، کس کا ذکر، کر دیا، نفسیاتی عورت..... لڑنے جھگڑنے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں۔"

"اور..... بچے۔"

"ہاں، ماشاءاللہ، چھے بچے ہیں میرے۔"

وہ ہنسی۔ "ہنس کیوں رہی ہو۔"

"ویسے ہی، تم اسے پسند بھی نہیں کرتا اور چھ بچے بھی۔"

"دائی اماں سچ ہی کہتا ہے۔"

"کیا.....؟"

"یہی کہ مرد کو بچے اپنے مگر بیوی دوسرے کی اچھی لگتی ہے۔"

"نہیں، اب ایسی بھی بات نہیں۔" وہ ذرا شرمندہ سا ہوا۔

"میں نے تمہارے حسن کی تعریف سنی تو بس دیکھنے آیا اور جب دیکھا تو یہیں رہ گیا۔ اس میں میرا کیا قصور۔"

"ہم تم پہ مرمٹے تو یہ کس کا قصور ہے آئینہ لے کر ہاتھ میں خود فیصلہ کرو۔" وہ گنگنانے لگا۔

"مرجان۔" اس نے بہت پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم بولو تمہیں کیا چاہیے، تم مجھے اتنی اچھی لگتی ہو کہ تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں، اپنا سب کچھ تمہارے قدموں پہ رکھ دوں۔ بولو کچھ تو مانگو، گاڑی، بنگلا، زمین، پیسہ۔"

"تم واقعی ہمارے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے۔"

"ہاں، بالکل۔"

"تو ٹھیک ہے، ایک بندے کو سبق سکھانا ہے۔ وہ بھی ایسا کہ، دیکھ کر روح کانپ جائے۔ پھر کسی کا ہمت نہ ہو کسی معصوم کو تکلیف دینے کا۔"

"کسے؟ نام لو۔"

"مولوی عبید، یہ بڑے مدرسے کا مولوی۔"

☆☆☆

پھر..... پورے محلے میں خبر، جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ پولیس کی نفری آئی۔ مدرسے کے مولوی کو گاڑی میں ڈال کر لے گئی۔ محلے میں تفتیش شروع ہوگئی۔ وہ بھی سخت قسم کی عثمان کی میڈیکل رپورٹ اور ایف آئی آر ہی اسے لٹکانے کے لیے کافی تھیں مگر محلے کے دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا دیکھی ہمت کی اور مولوی کے خلاف گواہی دے دی۔ سبزی فروش محمد رفیق نے تو اپنے بچے کی میڈیکل رپورٹ بھی پولیس کے حوالے کر دی۔

مرجان تھانے پہنچی۔ وہ سلاخوں کے پیچھے چٹائی پہ بیٹھا شاید نماز پڑھ رہا تھا۔

"مت پڑھو نماز جیسوں نے اپنے غلیظ وجود سے اس دنیا کو گندا کیا ہوا ہے۔ ویسے ہی اپنے دکھاوے کے سجدوں سے زمین کو غلیظ مت کرو۔"

"تم بدکار عورت، تم نے مجھ پہ جھوٹا الزام لگایا ہے۔ میرا اللہ میرا انصاف کرے گا۔" وہ فوراً نماز ختم کر کے بولا۔

"اللہ تم جیسوں کی نمازیں، قیامت کے دن

تمہارے منہ پہ مارے گا۔ یہ ان سجدوں سے کیا ہوتا ہے۔ جانتے ہو اس زمین پہ سب سے زیادہ سجدے ابلیس نے کیے اور تم..... شیطان کے چیلے۔"

"تمہاری بکواس سے کیا ہوتا ہے، بازاری عورت، ہم باعزت ہے اور باعزت ہی رہے گا۔"

"شاید مگر اب ذرا باعزت طریقے سے جوتے کھاؤ۔"

"اوئے کہاں ہے وہ تھانیدار عابد علی!" پیچھے سے چودھری شوکت علی نے آواز دی۔

"یس سر۔"

"اوئے، اس مولوی کا عدالت نے کتنے دن کا ریمانڈ دیا ہے؟"

"سر، وہ پندرہ دن کا جسمانی ریمانڈ۔"

"اور تم نے اسے یہاں اپنا سالا بنا کر رکھا ہوا ہے۔"

"سر..... وہ" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ "سر، وہ پورا ڈیڑھ لاکھ دیا ہے مولوی نے..... ذرا اس لیے۔"

"اچھا، اچھا اور تم نے سارا جیب میں ڈال لیا۔"

"نہیں جناب..... وہ میرے حصے میں تو صرف پندرہ ہزار ہی آئے ہیں۔"

"اوئے بے غیرتوں، معصوم بچوں کا معاملہ تھا کہیں تو غیرت کھا جایا کرو ہر جگہ حرام زدگی ضروری ہے۔ لے کر جاؤ اسے ٹارچر سیل میں۔" چودھری شوکت علی نے غصے میں غرا کر کہا۔

"جی، جی سر....." تھانیدار، ڈی ایس پی کے غصے سے گھبرا گیا۔

"اور سنو، ذرا سی بھی رعایت نہ ہو، ورنہ....."

"آپ..... آپ فکر ہی نہ کریں سر۔"

دو سپاہیوں نے حوالدار کے ساتھ مل کر مولوی کو باہر کھینچا تو ٹارچر سیل کا نام سن کر ہی مولوی کی چیخیں نکل گئیں۔ مشکل سے خود کو چھڑوا کر مرجان کے پاؤں پہ گرا۔ عورتوں کی طرح آنسو بہانے لگا، ناک رگڑ، رگڑ کر معافی مانگنے لگا، مگر اک معافی ہی تو تھی جو وہ کسی کو دینے کو تیار نہیں تھی کیونکہ اب وہ..... وہ مرجان نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں چھڑوانے کے لیے اک زوردار ٹھوکر مولوی کے ماتھے پہ ماری تو وہ سر کے بل پیچھے گر پڑا۔

"رحم انسان پہ کھایا جاتا ہے شیطان پہ نہیں۔"

"چلو، دفع کرو اسے، آؤ تمہیں یہاں کی دودھ پتی پلاؤں، بہت ہی مشہور ہے۔" چودھری شوکت علی اسے اپنے آفس لے آیا۔ وہ مزے سے چائے پیتی رہی ادھر شوکت علی اپنی ہی خوش گپیوں میں مصروف تھا، ذرا، ذرا سی دیر کے بعد مولوی کے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ مرجان کے تو دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔

"تم اس گندے محلے میں کیوں رہتی ہو ایک دفعہ جا کر بنگلا دیکھو تو سہی بہت خوب صورت ہے خاص تمہارے لیے خریدا ہے میں نے۔"

"نہیں، ہم یہیں ٹھیک ہے۔"

"کیوں؟"

"بس ویسے ہی۔"

"میں جانتا ہوں یہاں بیٹھ کر تم اپنے اس نشئی شوہر کا انتظار کر رہی ہو۔"

"ہاں، جب وہ جیل سے آئے گا تو پھر جانے ہمیں کہاں ڈھونڈتا پھرے۔"

"اوکے رسول بخش۔"

"جی سر۔"

"اس کو بتاؤ، اس کے اس نشئی شوہر کے بارے میں، مجھے دیر ہو رہی ہے میں ذرا ڈیوٹی پہ نکل رہا ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر باہر نکل گیا۔

"وہ بی بی جی۔" مرجان کو وہ احتراماً ہی بلاتا تھا جو مرجان کو بہت اچھا لگتا تھا۔

"کیا؟"

"وہ بی بی جی، عدالت کی پیشی کے بعد آپ کے شوہر خلیل اللہ نے پولیس کی حراست سے بھاگنے کی کوشش کی، وہ ہتھکڑی سمیت فرار بھی ہو گیا تھا مگر..... پولیس کے نشانے پہ آ گیا۔"

"کیا مطلب؟"

"مارا گیا۔"

"کیا؟ کب.....؟"

"جی بس یہی ڈیڑھ دو مہینے پہلے۔" مرجان کی تو

جیسے سانس ہی رک گئی۔

''خلیل اللہ مارا گیا۔''

''وہ اس کو تین ہفتے برف خانے میں رکھنے کے بعد دفنا دیا، اس کی میت لینے کوئی وارث نہ آیا اس لیے..... لاوارثوں کے قبرستان میں..... آپ چاہیں تو قبر پہ لے کر جا سکتا ہوں آپ کو۔''

مرجان کو تو اس کی بات صحیح سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔

''خلیل اللہ مر گیا، خلیل اللہ مر گیا۔'' اس کی پیشانی آنکھوں سے تو بس آنسو گر رہے تھے۔ ایک اور قیامت گزر گئی۔ اب اس گھر میں رہنے کا کوئی جواز نہ تھا اس نے بالآخر اس گھر اور محلے کو خیر آباد کہہ دیا اب وہ امیر اور ماڈرن ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں حسن ہو تو نزاکت آ ہی جاتی ہے اور اگر پیسہ ہو تو، اس نے اپنے بچوں کو اعلا بورڈنگ اسکولوں میں ڈال دیا۔ اب بس میک اپ بیوٹی پارلر اور نئے نئے ڈیزائنر و پرسوٹ..... واہ کیا انداز تھا۔ کیا طرز زندگی، ویسے ہی تو نہیں لوگ پیسے اور دولت کے پیچھے بھاگتے، چیز ہی ایسی ہے۔

مرجان تو اس قدر بدل گئی تھی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ سچ ہی کہتے ہیں۔ جیسا دیس ویسا بھیس، کہاں وہ غریبوں کا محلہ اور تنگ و تاریک گلیاں اور کہاں گلبرگ اور ڈیفنس جیسے محل نما مکان اور کھلی سڑکیں..... چودھری شوکت علی اس کا بہت خیال رکھتا تھا، وہ ایک من موجی سا انسان تھا اور من تو بس..... مرجان سے لگ گیا تھا، مرجان تو اس کے من کو ایسی بھائی کہ کچھ اور بھاتا ہی نہ تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت اسی بنگلے میں گزارتا جو اس نے مرجان کو لے کر دیا تھا۔ یہ تو انسان کی فطرت ہے، ہر انسان سکون چاہتا ہے اور مرجان اس کے لیے باعث سکون ہی تھی وہ مرجان کو اسی لیے یہاں لے کر آیا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ جو اس گندے، ٹوٹے پھوٹے گھر میں ممکن نہ تھا۔ وہ محلہ چودھری شوکت کو خود بڑا ناپسند تھا۔ اوپر سے تنگ گلیوں میں بڑی گاڑیاں، الگ عذاب..... اس جگہ پہ اسے مرجان بالکل ایسی ہی لگتی تھی جیسے گندے تالاب میں ایک خوب صورت کنول کا پھول..... اور، وہ اس کنول کو اٹھا کر اپنے صاف شفاف حوض میں لے آیا تھا اپنی طرف سے تو اس نے انصاف ہی کیا تھا دوسروں کی اس متعلق کیا رائے ہے۔'' اسے اس کی پرواہ نہ تھی اور نہ ہی اسے پرواہ کرنا پسند تھا۔ وہ صرف اپنے دل کی سنتا اور دل سے ہی سوچتا اور مرجان..... تو اس کے دل پہ یوں بیٹھی جیسے کسی تخت پہ ملکہ کسی سنگ تراش کی ترشی ہوئی مورت جیسا اس کا جسم، سفید گلاب جیسا چہرہ، روشن گلابی گال، سیاہ لمبے بال، گھنی پلکیں اور اس پر اس کا وہ ٹھہر ٹھہر کر بولنے کا وہ دلنشین انداز، گویا تسکین روح قرار دل، اور ایک اس کی اپنی بیوی، ماشاءاللہ، پنجابی جٹ خاندان کی ناقابل تلافی پیداوار، جب بولتی تو، کانوں کے پردے بھی ہلا دیتی۔ دل کہتا، یہ چپ ہی اچھی تھی۔ کچھ اس کی شخصیت کے ساتھ قدرت نے بھی انصاف سے کام نہ لیا تھا کچھ اسے خود بھی بننے سنورنے کا خاص ڈھنگ نہ تھا۔ یہ تو چودھری کی ماں کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اس کی بیوی تھی ورنہ..... ہر چیز کے معاملے میں اس کی پسند غیر معمولی تھی تو شریک حیات کیسے معمولی ہو سکتی تھی۔ بس وہ گزارے لائق تھی اور وہ پچھلے سترہ، اٹھارہ سال سے گزارا ہی کر رہا تھا۔ اور جہاں تک بات تھی اس کی رنگین طبیعت کی تو..... رنگ بھرنے کے سامان بہت تھے۔ اب تک بیسیوں عورتیں اس کی زندگی میں آئیں بھی اور چلی بھی گئیں، ان میں سے بیشتر بس ایک رات کی مہمان تھیں۔ شکیلہ، چوہدری شوکت کی بیوی اپنے شوہر کی اس رنگ مزاجی سے خوف واقف تھی، مگر مرتی کیا نہ کرتی صبر کے گھونٹ جو زہر سے بھی کڑوے تھے جی کڑا کر کے بس پی لیے۔ اپنے بچوں کی خاطر، اپنے گھر کی خاطر۔ جب وہ شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے آپ کو دیکھتی تو، اس کا دل بجھ سا جاتا۔ خالق کی بنائی ہوئی کوئی چیز فضول نہیں مگر، اسے تو اپنا آپ فضول ہی لگتا۔ وہ اللہ سے گلے شکوے کرتی، معمولی شکل وصورت، سانولا رنگ، درمیانہ قد، چودھری جیسے شوہر کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس نے کیا، کیا جتن نہ کیے تھے۔ سارا دن نوکروں کی طرح اس کے گھر کو سنبھالتی، اس کی بیمار ماں کو دیکھتی۔ اس کی بے رخی، بے وفائی برداشت کرتی، حتی

کہ چھ بچے بھی پیدا کر کے دے دیے مگر، ہائے یہ دشمن نصیبا، نصیب دشمناں یہ معمولی شکل وصورت، اس کی ساری ریاضت کو ایک پل میں مٹی کر دیتی۔

☆☆☆

چودھری شوکت کی زندگی میں مرجان کی اپنی ایک اہمیت تھی، اب تو چودھری کے اردگرد کے لوگوں کے ساتھ بھی اس کی جان پہچان ہونے لگی تھی۔ چودھری کے دوست یاروں کی محفل میں اکثر اس کا ذکر ہونے لگا۔

''آخر اس خالی پیمانے کو بھی کسی شراب نے بھر ہی دیا۔'' ہاہاہا وہ دوستوں کی بات پہ قہقہہ لگاتا۔

''بھئی اب تو وقت ہی نہیں ہوتا چودھری صاحب کے پاس..... ہاں بھئی ہم کیوں یاد آنے لگے۔ دماغ پہ ہر وقت وہ..... جو چھائی رہتی ہے۔''

''سنا ہے آج کل بڑے مصروف ہو اور مصروفیت بھی بہت خوب صورت ہے۔'' اور اس بات پہ چودھری اپنے سارے دوستوں کے ساتھ بے ساختہ ہنس پڑتا۔ یہ بات تو زبان زدعام ہوگئی تھی کہ چودھری کو ایک پٹھانی نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، گرویدہ تو کیا، اپنے پلو کے ساتھ باندھ ہی لیا ہے۔ یہ خبر اڑتی، اڑتی چودھری کی بیوی شکیلہ کے کانوں تک بھی پہنچ ہی گئی۔ ایک دن مرجان کو دیکھنے کی خاطر چار گھنٹے اس کے بنگلے کے باہر ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی رہی، اور جب مرجان شاپنگ کے لیے گھر سے باہر نکلی تو وہ اسے ایک ہی نظر دیکھ کر سمجھ گئی کہ، آخر اس کے شوہر نے اسے اس قدر اہمیت کیوں دی؟

''اس عذاب سے اتنی جلدی جان نہیں چھوٹنے والی۔'' وہ منہ میں بڑبڑائی، اور ڈرائیور کو گھر چلنے کا اشارہ کیا۔ آئی تو تھی، خبر لینے مگر خاموشی میں ہی عافیت سمجھی، کچھ چودھری کے غصے کے ڈر کی وجہ سے تو کچھ، مرجان کا سراپا ہی ایسا تھا کہ وہ خود ہی اس کے سامنے جانے سے ذرا کترا گئی۔

☆☆☆

ایک دن مرجان بچوں کی شاپنگ کے لیے نکلی تو کہا چلو بچوں کے لیے کچھ فروٹ بھی خرید لے۔ دکان سے سیب لے ہی رہی تھی کہ اچانک نظر ایک بوڑھی کمزور سی عورت پہ پڑی۔ پورے دو سال بعد مگر، پھر بھی وہ پہچان گئی۔ ایک ہی نظر میں..... کیسے بھول سکتی تھی انہیں۔ دائی اماں۔''

شدید لاغر، کمزور، بیمار، دو سال میں وہ اس قدر بدل گئی تھیں کہ بس ہڈیوں کا ڈھانچہ..... ہائے بے چاری دائی اماں ..... وہ انہیں گھر لے آئی۔ بہت خیال رکھا، تیمارداری کی، اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھایا، کھانے پینے کا خیال رکھا، اللہ کا شکر، بالآخر صحت بحال ہوئی۔ دائی اماں، بہو بیٹوں کی ایک، ایک بات بتاتیں تو چار، چار آنسو گراتیں۔

''کہہ دیا کسی اولڈ ہوم، کسی دارالامان، ایدھی سینٹر ہی چلی جاؤں گی مگر، اپنی اولاد.....'' وہ پھر رونے لگتیں۔

''میں بھی تو آپ کی اولاد ہی ہوں، میرے پاس رہیں، اپنی بیٹی کے پاس، اولڈ ہوم میں کیوں؟''

انہوں نے تشکر بھرے جذبات کے ساتھ اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

''ہمیشہ ایک ہی خواہش کی، اللہ سے ایک ہی دعا مانگی، فقط ایک ہی حسرت تھی، اللہ ایک بیٹی دیتا جو میرا احساس کرتی۔ اللہ نے بالآخر مرنے سے پہلے سن ہی لی۔''

اللہ بھی کیسے، کیسے دعائیں قبول کرتا ہے، دائی اماں کو بیٹی مل گئی اور مرجان کو ماں کا پیار۔

☆☆☆

ویسے تو دائی اماں اس چھت کے نیچے اپنی منہ بولی بیٹی کے ساتھ سکون سے زندگی گزار رہی تھیں مگر دن بدن ایک انتہا درجے کی بے سکونی تھی جو بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ چودھری شوکت کے ساتھ اس طرح مرجان کے بے نام سے تعلق سے کچھ مطمئن نہ تھیں بلکہ خاصی بے چین تھیں، انہیں یہ خاصا غیر مناسب لگتا تھا کسی ناجائز رشتے کو رکھنا۔

''تم، اس سے بات کیوں نہیں کرتیں؟''

''کیا بات کرے؟''

''یہی..... کیا تمہیں یوں مناسب لگتا ہے۔'' وہ بس اتنا کہہ کر خاموش ہوگئیں۔

مرجان تو اب دائی اماں کا اشارہ بھی سمجھ لیتی تھی۔
''ہمیں کیا مناسب لگتا ہے کیا نہیں، اس سے کسی کو فرق پڑتا ہے دائی اماں۔''
''تم بات کر کے دیکھو تو سہی ہوسکتا ہے وہ نکاح کر ہی لے۔''
''وہ نہیں کرے گا دائی اماں۔''
''آخر کیوں؟''
''کیونکہ اس کے نزدیک نکاح کا مطلب ہے بیوی اور بیوی سے تو بھاگتا ہے وہ۔''
''استغفار اللہ، استغفار اللہ، سچ کہتا ہے وہ، انسان خسارے میں ہے دیکھو تو سہی، اللہ نے جو سیدھا سادہ جائز راستہ بنایا ہے اس پہ چلتے ہوئے اسے موت پڑتی ہے، گناہ کرنا آسان لگتا ہے۔ وہ انسان کبھی نفع میں نہیں رہتا جو رحمٰن سے رشتہ توڑ لے اور شیطان سے جوڑ لے۔''
''باقاعدہ نکاح.....''
''ہاں، اس کی قانونی اور شرعی بیوی۔''
''ہمیں نہیں لگتا دائی اماں کہ وہ ہمیں اس قابل سمجھتا ہے۔''
''کون کہتا ہے، تمہیں اتنا مہنگا گھر لے کر دیا، تمہارے بغیر کھانا نہیں کھاتا، پانی کی طرح پیسہ لٹا رہا ہے۔ بالکل ایک اچھے شوہر جیسا ہی تو تمہارا خیال رکھتا ہے پیچھے رہ ہی کیا گیا۔ اگر وہ تمہیں اس قابل نہ سمجھتا تو، تمہیں اتنی اہمیت کیوں دیتا، تم اس سے کہو تو سہی کہ تم اپنے رشتے کو جائز کرنا چاہتی ہو۔''
''جائز، یہ تو ہماری بھی خواہش ہے۔''
''ہوسکتا ہے وہ تمہاری خواہش کا احترام کرے۔''

☆☆☆

''کیا کہا اس نے؟'' چودھری شوکت جونہی گاڑی میں بیٹھا تو ٹیرس پہ کھڑی مرجان کے پاس دائی اماں فوراً ہی آ گئیں۔
''بات تو کیا ہے مگر.....''
''مگر کیا ...؟''
''پتا نہیں ...''
''کیا، پتا نہیں.....''
''اس نے کچھ واضح جواب نہیں دیا۔''
''کیوں؟''
''کیوں، اب اس کیوں کا کیا جواب دے ہم، دائی اماں، جتنا ہم اسے سمجھا ہے، اتنا تو ہم جانتا ہے اگر وہ، ہم سے نکاح کرنا چاہتا تو، وہ کب کا کر چکا ہوتا۔ اب اگر وہ، ہمیں اس طرح ہی رکھنا چاہتا ہے تو ہم کیا کر سکتا ہے۔''
''تو، کہو اس سے کہ تم کوئی بازاری عورت نہیں ہو، ایک خاندانی اور شریف عورت ہو۔ اس طرح نہیں رہ سکتیں اس کے ساتھ.....''
''ہوں، شرافت، شرافت کی چادر تو کب کی تار، تار ہو گئی دائی اماں، آپ بھی کس بھلے وقت کی بات کرتی ہو۔''

☆☆☆

''بابا کب آئیں گے؟''
''ابھی آ ہی رہے ہوں گے۔'' شکیلہ نے بچوں کو تسلی دی۔
''گیارہ بج گئے ہیں آپ نے ان کو یاد تو کروایا تھا ناں کہ ہم نے چاند رات پہ ان کے ساتھ شاپنگ کرنے جانا تھا۔''
''ہاں، بیٹا انہیں یاد ہے۔''
''تو، پھر ابھی تک آئے کیوں نہیں۔''
''بیٹا وہ پولیس کے افسر ہیں، ان کی ڈیوٹی بہت سخت ہے۔ آ جائیں گے جب چھٹی ہو گی۔'' دکھ سے شکیلہ کی آواز بھر آئی۔ ''تم سو جاؤ۔''
نہیں، بابا آئیں گے تو ہم شاپنگ پہ جائیں گے۔
بچے کہتے کہتے سو گئے اور رات کے تین بج گئے۔ وہ گھڑی کی سوئیاں دیکھتی رہی۔ اسے گھڑی کی سوئیاں دیکھنے کی کچھ عادت سی بھی ہو گئی تھی، بلکہ اسے سامنے دیوار پہ لگے کلاک اور اس کی سوئیوں سے کچھ انسیت سی تھی۔ انتظار کی طویل اور سخت گھڑیوں میں وہی اس کی ساتھی تھیں۔ ساری، ساری رات جاگ کر شوہر کا انتظار کرنا، جب بیوی جانتی ہو کہ اس کا شوہر کسی اور عورت..... تو انتظار فقط انتظار نہیں رہتا، عذاب بن جاتا ہے اور وہ عذاب

کاٹ رہی تھی، پچھلے اٹھارہ سالوں سے، تین، سوا تین بجے وہ، نشے میں جھومتا گھر میں داخل ہوا۔

''چاند رات مبارک۔'' وہ نشے ہی میں تھا شکیلہ کے ساتھ وہ اتنا خوش مزاج صرف نشے کے وقت ہی ہوتا تھا۔ وہ بے زاری سے مڑی تو، اس نے ایک دم اس کا بازو پکڑ لیا۔

''کیا ضرورت تھی ایسے نشے میں منہ اٹھا کر گھر آنے کی، گھر میں ماں ہے۔ بچے ہیں۔ نوکر چاکر ہیں ہے کچھ خیال، لحاظ ہے نشہ ہی کرنا تھا تو پڑے رہتے اس گشتی کے پاس۔''

''کون، گشتی۔''

''نشہ اتر جائے تو آنا میرے پاس چودھری صاحب۔ اس حالت میں اس رکھیل کے ہی پاس جایا کرو۔''

''احترام سے نام لو اس کا۔''

''ہاں، کیوں نہیں، میری ماں لگتی ہے ناں وہ، میرا بس چلے تو منہ ہی نوچ لوں اس کمینی کا، گلہ ہی دبا دوں۔''

''سوچنا بھی مت۔'' اچانک چودھری کی آنکھوں میں نشے کی جگہ غضب اتر آیا۔ اور اسے شکیلہ کو حقارت سے ایک طرف جھٹک دیا۔

اس نے کوشش کی کہ وہ نہ روئے مگر ہمیشہ کی طرح ناکام ہوگئی۔ آہ، چاند رات تھی اور صبح عید اور اس بے چاری نے تو رو، رو کر اپنی آنکھیں ہی سوجھالی تھیں۔ اسے پچھلے اٹھارہ سالوں میں کوئی ایک ایسی عید یاد نہیں تھی جو اس نے ہنس کر گزاری ہو یا اچھے طریقے سے منائی ہو۔ کیا کم ظرف تھا یہ چودھری، کبھی جھوٹے منہ بھی نہ پوچھا، اسے تو یاد ہی نہیں کہ اس کے سنگدل شوہر نے کبھی اسے کوئی چھوٹا سا تحفہ ہی دیا ہو سکھ سکون تو نصیب سے ہی ملتا ہے۔

''کیسا جلا ہوا نصیب ہے میرا۔'' وہ پھر ہچکیاں لے کر رونے لگی۔ کوئی عید۔ چاند رات کیسے خوشی دے سکتی ہے اگر شریک حیات ہی اس خوشی میں شریک نہ ہو۔

''یہاں میں اور بچے انتظار کر کر کے مر گئے اور دیکھو تو، اس منحوس کے ساتھ، چاند رات..... کیا ہو جاتا کوئی قیامت تو نہ آ جاتی اگر، چاند رات ہمارے ساتھ گزار لیتا۔ آخر کتنے پتھر رکھوں اس دل پہ.....''

وہ دعا کرنے لگی کہ کاش کبھی یہ عید، یہ چاند رات نہ آئے، یہ تو اس کے احساس تنہائی کو اور بڑھا دیتی تھیں۔

☆☆☆

ایک دن چودھری شوکت اپنے بیٹے کی سالگرہ ہی بھول گیا، مرجان سے اٹھا تو سیدھا اپنے دوستوں کی طرف شراب اور شکار پہ نکل گیا۔ بے چاری شکیلہ اپنے نصیب پہ رو پیٹ کر صبر کر لیتی مگر، اپنے بچوں کے حق پہ کیسے کسی کو ڈاکا مارتے دیکھتی تو چپ رہتی، بیوی صبر کر لیتی ہے مگر ماں..... ماں تو فقط ماں ہوتی ہے۔ غصے میں بپھری مرجان کے پاس بھی پہنچ ہی گئی۔ پہلی دفعہ یوں آمنے سامنے۔

''دفع ہو جاؤ میرے شوہر کی زندگی سے..... ویسے کہاں سے خرید کر لیا ہے چودھری نے..... ہاں، بولو، ہرا منڈی سے یا کسی اور منڈی سے.....''

''اسی منڈی سے جہاں تمہارا ابو لی لگا تھا۔''

''کیا؟'' مرجان نے اس قدر پرسکون طریقے سے ٹکا کر جواب دیا کہ غصے میں شکیلہ کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ مرجان کا منہ لال کرنے کے لیے ہوا میں ہاتھ لہرایا تو مرجان نے کسی ہرنی جیسی تیزی کے ساتھ اس کا ہاتھ اچک لیا۔

''مرجان اب اتنا بھی راستے میں نہیں پڑا، سنبھال کر رکھو اپنا یہ ہاتھ۔''

''تم سنبھالو..... اپنی یہ دو ٹکے کی جوانی۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے مرجان پر غرا کر کہا۔ ''جس کی گلی، گلی بولی لگاتی پھر رہی ہو۔''

''ماشاء اللہ، دیکھو، ہمیں مشورہ دینے آئے ہیں وہ..... جن سے اپنا شوہر بھی سنبھالا نہیں جاتا۔ اگر سنبھالنا مشکل ہے تو گلے میں پٹا ڈال کے رکھ۔ ہر برتن میں منہ مارنے کی عادت ہوگئی ہے اسے۔''

''تو کیوں سوتی ہے اس کتے کے ساتھ۔''

''یہ سوال.....'' وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔

''تو، تو اس سے کر جو تیرے ساتھ سونا پسند نہیں کرتا۔'' مرجان کے جواب پہ وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

دل تو چاہا کہ کوئی چیز اٹھا کر مرجان کے سر پہ ہی دے مارے مگر اپنے غصے میں کانپتے ہوئے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

''خوب اچھی طرح جانتی ہوں، تم جیسی فاحشہ عورتوں کو، جو شریف مردوں اور، دوسرے کے شوہروں کو پھانستی ہیں۔''

''آ، ہاں شریف مرد۔'' وہ طنزیہ ہنسی پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی، میں بھی خوب جانتی ہوں تم جیسے شریفوں کو..... تم جیسوں کی شرافت کی چادر جتنی داغ دار ہوتی ہے اتنی کسی فاحشہ کی کہاں، تمہارے اس شریف شوہر نے ایک باعزت گھر کی چار دیواری میں نقب لگائی۔ ایک مجبور، بے بس عورت کی عزت پامال کی۔ شرمندہ تو تم کو ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکو، پھر کسی اور کو گالی دینا۔ تم جیسوں کی، گالیوں کا جواب دینا مرجان اچھی طرح جانتی ہے۔''

''کسی بات کا اتنا اعتبار، اتنا غرور ہے تمہیں، اپنے اس حسن کا؟ ہوں چاہے کتنی بھی خوب صورت ہو تم..... ہو کیا تم..... چودھری کی رکھیل..... اس کی بیوی تو، میں ہوں، اس کے چھ جائز بچوں کی ماں۔'' اس نے غرور سے گردن اکڑاتے ہوئے کہا بس ایک حقارت میں، مرجان کے منہ پہ تھوکا نہیں باقی ادھار نہ چھوڑا۔''

''چھ جائز، بچوں کی ماں، اپنا حق مانگنے ایک رکھیل کے دروازے پہ کیوں آئی ہے۔'' مرجان بھی کہاں ادھار رکھتی تھی فوراً چکتا کر دیا۔

''سچ کہو تو ہمیں، ترس آتا ہے تم جیسی عورتوں پہ، اپنی ساری زندگی، ساری جوانی لٹا دیتی ہو بچے پیدا کر کے دیتی ہو، گالیاں سنتی ہو، جوتے کھاتی ہو پھر بھی خالی جھولی پھیلا کر اپنا حق مانگتی پھرتی ہو، ویسے سات سلام ہے تمہاری ہمت کو، اتنا ہمت تو کسی منڈی کی لونڈی بھی نہیں ہو سکتا۔ قابل رحم حالت ہے تمہاری، آہ، اللہ تمہاری حالت پہ رحم کرے۔''

وہ مرجان کی بات پہ خاموش ہو گئی چاہ کر بھی کچھ نہ بول سکی۔ ویسے وہ سچ ہی کہہ رہی تھی اس میں جھوٹ کیا تھا۔ جتنا استحصال ان شریفوں کی چار دیواریوں میں عورتوں کا ہوتا ہے کوٹھوں کے زینوں میں بھی نہ ہوتا ہوگا، وہ تو ایک رات سوتی ہیں اور برابر کا معاوضہ لے کر یہ جا وہ جا، اور بے چاری یہ شریف عورتیں ساری زندگی دانوں کی طرح چکی میں پستی رہتی ہیں اور حاصل وصول..... خسارے کا سودہ تو تھا۔ خود اس کی مثال اس گائے جیسی تھی جو اٹھارہ سالوں سے اک کھونٹے پہ بندھی اور اس کا مالک اسے چارہ ڈالنا ہی بھول جائے۔ بیوی کوئی بے زبان جانور نہیں ہوتی، کون سمجھائے ان مردوں کو۔ اگر شوہر قدرے کرے تو زندگی کا پل صراط عورت کاٹ ہی لیتی ہے اور اگر..... شوہر چوہدری جیسا بے حس..... اللہ ایسا شوہر کسی بیوی کو نہ دے۔ کیسا سخت دل بے قدرا انسان تھا وہ شکیلہ کی ذات اتنی بھی معمولی اور بے وقعت نہیں تھی جتنی چوہدری کی بے حسی اور بے وفائی نے کر دی تھی۔ اس کی ذات میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں۔ جنہیں چوہدری نے کبھی خاطر میں نہ لیا۔ وہ گھر واپسی پہ بھی سارے راستے یہی سوچتی رہی۔

''ہاں..... سچ ہی تو کہہ رہی تھی پہلے اپنے گریبان میں جھانکو اپنا پھٹا گریبان سینا مشکل لگا تو آ گئی دوسرے کا گریبان پھاڑنے..... اٹھارہ سال ایڑھی چوٹی کا زور لگا کر بھی وہ اپنا شوہر اور اپنا ازدواجی رشتہ نہ سنبھال سکی اور آ گئی، مرجان پہ لعن طعن کرنے، اگر..... اگر اس کا اور اس کے شوہر کا رشتہ مضبوط ہوتا تو کسی تیسرے کی کیا ہمت تھی۔'' اس کا دل بھر آیا تو اس نے پرس سے سن گلاسز نکال کر لگا لیے، وہ ہمیشہ دوسروں سے اپنے دکھ اپنی کمزوری اور آنسو چھپا کر رکھتی تھی۔ دنیا کے سامنے رونا، رونے کا بھی کیا فائدہ تھا، دنیا تو آہ کر کے سنتی ہے اور واہ کر کے اڑاتی ہے۔ سچ ہی کہتی تھی میری خالہ (ساس)

وچ شریکاں ویسے اندر رویئے بار ہیسے

☆☆☆

''دیکھا اسی لیے میں کہتی تھی کہ اس کمبخت سے کہو کہ نکاح کر لے تم سے۔'' دائی اماں کا تو بلڈ پریشر ہی ہائی ہو گیا۔

''غضب خدا کا ..... رکھیل میرا اللہ مجھے معاف کرے، مرجان، یہ لفظ دوبارہ کسی کی زبان پہ بھی اللہ تمہارے لیے نہ لائے۔ یہ منہ پہ آ کے یہ کہہ کر چلی گئی تو پتا نہیں باہر..... باہر دنیا پیٹھ پیچھے کیا، کیا نہ کہتی ہوگی۔'' دائی اماں نے دکھ اور افسوس میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''فحاشہ، استغفار اللہ، کانوں نے یہ بھی سننا تھا۔''

''مرجان سب سے قیمتی ہوتی ہے عزت، اگر وہ تمہیں بیوی بنا کر عزت نہیں دے سکتا تو لعنت بھیجو اس گھر پر۔'' انہوں نے جذباتی ہو کر کہا۔

''تو کہاں جائے دائی اماں۔'' مرجان کے سوال پہ وہ خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

''اب وہ دوبارہ ادھر نہیں آئے گی۔''

''تمہیں یقین ہے۔'' مرجان دائی اماں کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے پریشان تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ دائی اماں پریشان ہو کر دوبارہ بیمار پڑ جائیں۔

''یقین.....'' وہ وہسکی پیتے ہوئے مسکرایا۔

''جو میں نے اس کا حال کیا ہے وہ، دوبارہ ادھر کا منہ بھی کرنے کی ہمت نہیں کرے گی۔''

''حال؟ تم نے، ہاتھ اٹھایا اس پر۔'' مرجان نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

تو اس نے حرکت ہی ایسی کی۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تم مارے اسے، وہ بیوی ہے تمہاری..... تم اس کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو۔''

''وہ اسی قابل ہے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں، وہ اسی قابل ہے، آخر وہ عورت ہے اور اوپر سے بیوی بھی ..... یہ کم قصور ہے اور تم حق سمجھ کر ذلیل کر رہے ہو اسے۔''

''وہ تمہیں گالی دے کر گئی ہے اور تم..... اس کی طرف داری کر رہی ہو۔''

''طرف داری نہیں کر رہی، مجھے بس دکھ ہو رہا ہے۔ ترس آ رہا ہے اس پر، تمہیں ترس نہیں آتا اس پر۔''

''وہ، ایک نفسیاتی، فضول عورت ہے۔ کتے کی طرح بھونکتی رہتی ہے ہر وقت..... اب تو تم نے خود بھی دیکھ لیا ہوگا۔''

''اگر پتھر پہ بھی چوٹ پڑے تو، خاموش تو وہ بھی نہیں رہتا۔ ایک عورت آخر، کتنا صبر کرے۔ ہاں دے کر گئی ہے وہ گالی، اس کے غصے کے پیچھے اس کی بے بسی کو صرف ایک عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ کاش کہ تم بھی سمجھ سکتے اس کی تکلیف کو.....''

''آں..... وہ ایک فضول عورت ہے۔'' چودھری نے حقارت سے کہا۔

''کیوں؟ کیونکہ وہ ایک معمولی شکل وصورت کی ہے۔ اس نے خود تو اپنی شکل نہیں بنائی، اللہ نے بنائی ہے۔ تم اللہ سے لڑو اس بے چاری کو اذیت کیوں دیتے ہو۔''

''آخر، تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ تم اس کی اتنی وکالت کیوں کر رہی ہو۔'' مرجان خود بھی نہیں جانتی کہ تم آخر وہ شکیلہ کے لیے اتنی دکھی کیوں ہو رہی تھی، نہیں یہ مرجان کے اپنے اندر کا ہی دکھ تھا۔ اس کے شوہر چوہدری نے اس پہ ہاتھ اٹھایا۔ اسے مارا یہ سن کر مرجان کا اپنا ہی کوئی زخم ہرا ہو گیا۔ ٹیس تو اٹھ رہی تھی مگر وجہ تھے اپنے ہی اندر کے ناسور وہ غم، اور اذیتیں جو اس نے اپنے شوہر خلیل اللہ کے ہاتھوں اٹھائی تھیں۔ کس قدر اس کی تذلیل کرتا تھا، ایک تو اس کی ماں کے کنگن نکال کر بیچ دیے اور اوپر سے اس بے چاری کا ہاتھ بھی توڑ دیا۔ مرجان کو اپنی ٹوٹی ہڈی کی اتنی تکلیف نہیں تھی۔ جتنی اس تذلیل کی جو اسے محض ایک عورت اور بیوی ہونے کی وجہ سے اٹھائی تھی۔ جب ایک شوہر اپنی بیوی پہ ہاتھ اٹھاتا ہے تو کیا وہ ایک لمحے کے لیے بھی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس وقت، اس بے چاری کے دل پہ کیا گزر رہی ہوگی۔ جو شخص اس کا مان، اس کی طاقت، اس کا سہارا، اس کی عزت وہی اگر بے عزت اور ذلیل کرنے لگے۔ جس کی ذات سے مل کر وجود مکمل ہوتا ہے وہی اگر اس کی ذات پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جائے تو وہ بے چاری کہاں جائے۔ اگر جائے پناہ ہی پناہ نہ دے اور اگر سایہ ہی جلانے لگے تو..... یہ اذیت تو وہی عورت جان سکتی ہے جس کا دل اس بھٹی میں جلا ہو۔

''تم، محبت کرتے ہو مجھ سے؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والا سوال ہے۔''

''تم سے کچھ مانگوں تو.....''

''پوچھ کیوں رہی ہو، تمہیں شک ہے مجھ پر.....'' اس نے رسانیت سے جواب دیا۔

''شک تو نہیں.....''

''مانگو، چودھری کا دل بہت بڑا ہے۔''

''تو، آئندہ ہاتھ مت اٹھانا اس پر۔''

''اف، میں سمجھا تم اپنے لیے کچھ مانگو گی۔''

''اس نے اپنے لیے ہی مانگا تھا مگر چودھری جیسا سطحی سوچ رکھنے والا خود پسند مرد، جس کے لیے صرف اس کی اپنی ذات اہم تھی، یہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔''

''تم نے جواب نہیں دیا۔''

''اچھا، کوشش کروں گا۔'' چودھری نے بیزاری سے کہا۔

''تم اسے بالکل پسند نہیں کرتے۔'' وہ اس کی بیزاری پہ حیران تھی۔

''میں تو اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''مگر کی۔'' مرجان نے زور دے کر کہا۔'' اور چھ بچے بھی جنوا لیے۔ اپنے سارے حق لے لیے اور اس کا حق دینے میں..... کیا یہ کم ظرفی نہیں۔''

''کیا مطلب؟ چھ بچے؟ عورت ہوتی ہی اسی کام کے لیے ہے۔'' اسے مرجان کا اعتراض واقعی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ مرجان خاموش ہو گئی۔ منزل خان سے دلاور خان، دلاور خان سے خلیل اللہ اور خلیل اللہ سے چودھری شوکت، زندگی بدل گئی، وقت بدل گیا، جگہ بدل گئی، علاقہ بدل گیا، مرد بدل گئے، مگر نہ بدلی تو سوچ عورت کا استحصال اپنا حق اور اولین فرض سمجھ کر کرنا۔ اس میں چودھری شوکت کا بھی قصور نہ تھا۔ وہ اسی معاشرے کی پیداوار تھا جسے مردوں کا معاشرہ کہتے ہیں۔ جہاں مرد کا مقام سر کا تاج اور عورت پاؤں کی جوتی، آخر دونوں کا کیا مقابلہ؟ منصف نے بھی عورت کی تقدیر کے ساتھ کیسا انصاف کیا تھا جسے وہ جتنا سمجھتی تھی اتنا ہی الجھ جاتی تھی۔

☆☆☆

زندگی کے دن گزر رہے تھے۔ بالکل صحیح ہی کہا ہے کسی نے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
زندگی یونہی، تمام ہوتی ہے

وہ گویا ٹھہرے پانی میں جھک کر اپنا عکس ہی دیکھ رہی تھی کہ کسی پتھر نے منظر ہی بدل دیا۔ اس کی زندگی میں اس قدر ہل چل مچی کہ پھر سب تہس نہس ہو گیا۔ ایک صبح خبر ملی، چودھری شوکت علی کا قتل..... کسی نے گاڑی پہ ٹریلر چڑھا دیا۔ تحقیقات ہو رہی تھیں۔ زندگی ایک دفعہ پھر بدلی اب معاشرے میں مرجان کا اسٹیٹس بدل چکا تھا۔ وہ اب انتہائی ماڈرن جسم فروش، پیشہ ور عورت..... جس کے پہلے گاہک تھے، چودھری شوکت کے ہی عزیز، دوست یار، یہ دنیا بھی منافقتوں سے بھری پڑی ہے۔ چودھری کی ناگہانی موت کا سب سے زیادہ غم تو چودھری رفاقت علی نے کیا جو اس کا کزن اور قریبی دوست تھا۔ مگر مرجان کی گود میں سر رکھ کر دو، چار اور شریفوں سے واسطہ پڑا، حسن کے چرچے دور، دور تک تھے مگر نصیب..... صرف چند ہی گاڑی، پیسے والوں کا کھل سکا۔ کسی عام مرد کی تو اوقات ہی نہ تھی کہ اس کے بنگلے کے دروازے تک بھی آتا۔ پھر ایک دن وہ بھی آ ہی گیا، طاہر کھوکھر عرف ٹیپو، لاہور کے مشہور قبضہ گروپ کا سرغنہ، ٹارگٹ کلر..... لوگ جتنا اس سے ڈرتے، خوف کھاتے، مرجان کے قریب آیا تو اسے احساس ہوا کہ وہ اندر سے اتنا ہی ایک نرم اور خوش مزاج انسان تھا۔ لگتا تھا ایک انسان کے وجود میں دو انسان بستے ہیں۔ لوگوں کی جان لینے کا کام، جانے وہ کیسے کر لیتا تھا۔

☆☆☆

آہ، یہ زندگی کے اتار چڑھاؤ اور نشیب و فراز..... اسے لگا۔ وہ جانے کتنے ہی طوفان عبور کر آئی ہے۔ اف یہ زندگی..... واہ۔ اللہ! تیرے رنگ..... نہ تیری دنیا کو کوئی سمجھ سکا نہ تیری ذات کو، یہ تو دور کی بات ہے یہاں تو خود اک اپنی ذات ہی ناقابل فہم ہے۔ جانے کتنے لوگ بند کتاب کی طرح اس دنیا میں آتے

ہیں اور بند کتاب کی طرح ہی چلے جاتے ہیں۔ وہ کتاب جسے نہ کبھی کسی نے پڑھا، نہ کھولا، حتیٰ کہ خود کو، خود بھی نہ جانا، نہ پڑھا، نہ سمجھا۔ گویا، دنیا میں آ کر بیگار ہی کاٹی۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو پڑھتے ہیں یا پڑھے جاتے ہیں۔ جانے..... وہ کون لوگ ہوتے ہیں۔

وہ ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ، طاہر کھوکھر اندر آیا۔ لمبا تڑنگا، خوب صورت چہرہ، چمکتے بال۔

''کیسی ہو مرجان۔'' اس کا یہی انداز تھا اسے بلانے کا اس نے پستول نکال کر ٹیبل پہ رکھا اور اس کے پاس دیوان والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''تم نے کتنے لوگوں کی جان لی، اس سے۔'' وہ سامنے شیشے کے ٹیبل پہ پڑے اس کے پستول کو دیکھ رہی تھی۔

''یہی دو چار۔''

''دو کہ چار۔''

''اب اتنا حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔''

''کیوں؟''

''اتنا سوچو تو، جان لینا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''تو تم سوچے سمجھے بغیر ہی کسی زندہ انسان کی جان لے لیتا ہے۔''

''ہاں؟ سوچے سمجھے بغیر.....''

''آج تک کتنے انسانوں کی جان لی؟''

''یہی بیس پچیس۔''

''بیس پچیس۔'' مرجان کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

''تمہارے پیچھے سنا ہے منسٹر کا ہاتھ ہے اس صوبے کا چیف منسٹر، اسی لیے تم ابھی تک بچا ہوا ہے۔'' مرجان نے شیشے کے گلاس میں وہسکی انڈیلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''حیرت کی بات ہے یہاں زیادہ تر غیر قانونی کام، قانون کی نگرانی ہی میں ہوتے ہیں۔''

''ہاں تو..... زیادہ تر قبضہ تو، یہی قانون کا مضبوط ستون، چیف منسٹر ہی وصول کرتا ہے۔''

''یہ سیاست دان ایسے ہی ہوتے ہیں، تقریر میں کچھ، حقیقت میں کچھ، دس، دس چہرے، بیس بیس زبانیں۔''

''اسے خوف خدا نہیں۔''

''تم بھی بچوں جیسی باتیں کرتی ہو وہ خود کو خدا ہی سمجھتے ہیں اس لیے انہیں کسی کا خوف نہیں۔''

''استغفار۔'' مرجان نے گہرا سانس لیا۔

''تم بتاؤ، تم ایک جان لینے کا کتنا پگڑی لیتا ہے۔''

''کیوں، تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ویسے ہی.....''

''بندے، بندے پہ ڈیپینڈ کرتا ہے۔ جتنا اہم بندہ، اتنا ہی مہنگا۔''

''اگر ہم تمہیں پگڑی دے تو..... جان لے گا۔''

''کس کی؟''

''ظاہر ہے بندے کی۔''

''وہ ہنسا، میں سمجھا تم مرغی کا کہو گی۔''

''ہم مذاق نہیں کر رہا ہے۔''

''مرجان، ہم تو تمہارے لیے جان دے سکتا ہے، جو سب سے مشکل کام ہے تم جان لینے کا کہہ رہی ہو یہ تو میرا معمول کا ہی کام ہے..... کس قدر خوب صورت ہیں تمہاری یہ آنکھیں ان کی خاطر تو لاکھوں قربان ہو جائیں، ہزاروں دل فدا۔'' وہ اس کی آنکھوں کی تعریف کرتے کرتے انتہائی قریب آ گیا۔ مرجان نے آنکھیں بند کر لیں وہ اس کی گرم سانسیں اپنی پلکوں سے ٹکراتی محسوس کر سکتی تھی۔

☆☆☆

''اچھا، میری بچی مرجان، اللہ کے حوالے۔''

''کہاں جا رہی ہیں دائی اماں؟''

''اللہ بھلا کرے اس عبدالستار ایدھی کا جس نے مجھ جیسے غریبوں کے لیے جگہ جگہ ٹھکانے بنائے ہیں۔''

''کیوں، یہاں کیا تکلیف ہے آپ کو؟''

''ویسے تو کوئی تکلیف نہیں۔ محل جیسا گھر ہے تمہارا، زندگی کی ہر سہولت ہے۔ ایئر کنڈیشنر ہے۔ پھولوں سے بھرا لان ہے..... تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں اس لیے تم یہاں رہنا چاہتی ہو لیکن میرا دل نہیں لگتا یہاں۔''

''جانتی ہوں آپ کیوں جا رہی ہیں۔''

''اگر جانتی ہو تو مجھے روکو نہیں کیونکہ اب

تمہارے روکنے سے میں روک بھی نہیں سکتی۔''

''آپ میری ماں ہیں مجھے کیسے اکیلا چھوڑ سکتی ہیں۔''

''اگر انسان گناہ پہ راضی ہو جائے تو اللہ بھی اسے اکیلا چھوڑ دیتا ہے۔ بندے کے سہارے کی وقعت ہی کیا ہے۔ ماں ہوں، اس لیے تو سمجھایا تھا یہ کام صحیح نہیں۔''

''تو اور کیا کرے ہم دائی اماں، یہاں رہنے کا صرف ایک دن کا کتنا خرچا ہے کچھ خبر ہے آپ کو۔ اگر ہم یہ کام نہ کرے تو، یہ گھر جو واحد چھت ہے امارے پاس، گروی ہو جائے گا۔''

''ہاں، تو کیوں رہتی ہو یہاں، بیچ دو اسے، کسی عام سی جگہ پہ کوئی سستا سا گھر لے کر رہ لیتے ہیں جہاں خرچا بھی کم ہوگا۔ باقی ہم دونوں ماں بیٹیاں مل کر کوئی محنت مزدوری کر لیں گے۔ مانا کہ عزت کی زندگی گزارنا مشکل ہوتا ہے مگر عزت سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں ہوتی میری بچی۔''

''عزت..... عام سی جگہ، سستا سا گھر، غریبوں کا محلہ، محنت مزدوری، رہنے دو دائی اماں ہم سے اب یہ سب نہیں ہوگا۔ مرجان کو لمبے راستے مت دکھاؤ، مرجان بہت تھک گیا ہے۔''

''ہاں، سمجھ سکتی ہوں منرل واٹر پینے کی عادت پڑ جائے تو نلکے کا پانی پینے سے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے۔'' وہ کہہ کر دروازے کی طرف مڑیں۔

''رکو تو، دائی اماں۔'' اس نے پھر ان کا راستہ روک لیا۔ ''صرف ایک تم ہی تو ہے امارے پاس، تم بھی چھوڑ کر چلی جاؤ گی تو، مرجان تو بہت اکیلی ہو جائے گی۔''

''بڑھاپے میں در، در کی ٹھوکریں کھانا آسان نہیں مرجان، اللہ تمہیں کبھی ایسا اکیلا نہ کرے جیسی کہ میں۔'' دائی اماں کی آواز بھر آئی تو مرجان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

''ہم بھی جہنم کی آگ میں جل رہا ہے دائی اماں۔ سچ پوچھو تو مرجان بھی صرف نجات چاہتا ہے۔ صرف نجات ٹھیک ہے، جہاں آپ کہیں گی وہیں چلتے ہیں۔ جو آپ کہیں گی وہی کروں گی۔ آپ میری ماں ہیں آپ کی نہیں مانوں گی تو اور کس کی مانوں گی۔ بس مجھے تھوڑا سا مہلت دے دو، ایک بہت ضروری کام ہے وہ نمٹا لوں تو، چھوڑ دوں گی یہ گھر بھی..... ٹھیک ہے۔''

''کون سا ضروری کام.....؟''

☆☆☆

وہ لوٹ آئی..... بالآخر، وہ لوٹ آئی۔

طاہر کھوکھر کی ڈبل کیبن، اور دو گاڑیاں اس کے پیچھے وہ مین روڈ سے اتر کر لنک روڈ پہ آ گئے، ذرا آگے پتھریلے علاقے پہ گاڑیاں ہچکولے کھانے لگیں۔ آہ، کس قدر مانوس ہوا تھی..... مانوس خوشبو، مانوس سی فضا کیوں نہ ہوتی۔ اس کا اپنا علاقہ جو آ گیا تھا، وہ لوٹ آئی تھی زندگی کے دس، بارہ سال ایسے بیتے جیسے دس جنمیں، دس شامیں، یہ دس، بارہ سال ان راستوں پہ لوٹ کر لگا جیسے صرف کوئی دس، بارہ دن ہی تو تھے۔ جانے یہ زندگی اتنی تیزی سے کیوں گزر جاتی ہے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ، آخر یہ وقت، اتنی تیزی سے کیسے گزر گیا۔ کیا یہ وقت کا دھوکا تھا۔ سب ایسا ہی محسوس کرتے ہیں یا یہ احساس اس کے لیے ہی کچھ مختلف تھا۔ عجب سا احساس تھا جسے وہ سمجھنے کی کوشش تو کر رہی تھی مگر سمجھ نہیں پا رہی تھی، بالکل سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بالآخر، وہ علاقہ..... وہ محلہ..... وہ گلی..... وہ گھر..... اور وہ دروازہ آ ہی گیا۔ بالکل نہ بدلا تھا، جانے کتنی دنیا بدل گئی مگر، یہ وہی گھر، وہی دروازہ، بس ذرا پرانا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

طاہر کھوکھر کے ماہر بندوں نے دیواریں پھلانگیں اور اسلحے سمیت گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ اور پندرہ، بیس منٹ بعد دروازہ کھولا۔ مرجان، طاہر کھوکھر اور اس کا ایک گارڈ جو منتظر کھڑے تھے۔ دروازہ کھلتے ہی گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ مرجان کا دل زور، زور سے دھڑکا۔ وہ ایک لمحے کے لیے دروازے پہ رکی اور دل پہ ہاتھ رکھ لیا۔

"مجھے کر کے برباد
وہ کتنے خوش ہیں
شاد ہیں آباد ہیں
چلو جا کر دیکھیں آج
وہ.....وہ کتنے خوش ہیں
مجھے کر کے برباد
وہ.....وہ کتنے شاد ہیں
مجھے کر کے برباد
وہ.....وہ کتنے آباد ہیں
میری آنسوؤں، میری مٹی سے
جو جنت بنائی تھی انہوں نے
کیا وہ اس جنت کے شداد ہیں
چلو، جا کر دیکھیں آج
وہ.....وہ کتنے آباد ہیں
میرے آشیانے کے تنکوں کو
چرا کے اپنا گھر بنایا تھا
فقط ہاتھ سیکنے کے لیے
پورا درخت جلایا تھا
میری خوشیوں کو دفنا کے آج
وہ.....وہ کتنے خوش ہیں
چلو، جا کر دیکھیں آج
وہ.....وہ کتنے خوش ہیں
شاد ہیں.....آباد ہیں
مجھے کر کے برباد.....
وہ.....
وہ کتنے خوش ہیں۔"

دو، چار قدم مشکل سے اٹھا کر وہ گھر کے صحن کی طرف بڑھی عجب سی کیفیت تھی، گزرا وقت یاد آ گیا۔ بچپن یاد آ گیا۔ تندور کے پاس سے گزری تو مورے یاد آ گئی۔ عرصے بعد یاد آئی اور اس قدر شدت سے یاد آئی کہ نیم کے درخت کے نیچے بنے تندور پہ روٹیاں لگاتی نظر آ رہی تھی۔ گھر میں چٹنی پھرتی، کام کرتی، درخت کے نیچے بچھی چارپائی پہ بیٹھی ریشم کی کڑھائی کرتی، وہ ذرا، ذرا سی مسکراتی۔ مورے..... اپنی پیاری مورے۔ چلتے، چلتے وہ انار کے درخت کے بھی قریب پہنچ ہی گئی۔ انار کا درخت دیکھا تو، وہ بھی یاد آ گیا۔ ایک لمحے کے لیے انار کے درخت کے پاس رکی۔ دل تو چاہا کہ انار کے درخت کو گلے سے لگا کر ماتم کرے۔ اپنے گزرے ہر دن پہ، ہر لمحے پہ روئے اس قدر روئے کہ سینے پہ پڑا صدیوں کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ ایسا لگ رہا تھا انار کے درخت کی چاروں سمت پھیلی شاخیں رات کی نیم تاریکی سے بوجھل ہیں یا شاید اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ بھی اداس ہیں۔ جو اس پہ گزری، اس پہ تو اس گھر کا کونا، کونا افسردہ لگ رہا تھا۔ انار کے درخت کو پیچھے چھوڑتی وہ برآمدے میں آئی۔ برآمدے میں، بی جان، پلوشہ، ایک چھوٹی سی لڑکی اور وہ کھڑی تھی..... تائی گلشن اور دو چھوٹے بچے ایک بارہ، تیرہ سال کا ہوگا جو یقیناً شیر جان تھا۔ جس کا نام اس کے باپ کے نام پہ رکھا گیا تھا، کبھی مرجان نے اپنے ہاتھوں میں اسے اٹھایا تھا، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا، وہ کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ دوسرا بچہ، چھ سات سال کا، شیر جان کا چھوٹا بھائی ہی ہوگا۔ سب پریشان ڈرے سہمے طاہر کھوکھر کے دو بندے ان پہ بندوق تانے کھڑے تھے۔

بی جان..... بی جان کے سارے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم آ گیا تھا یعنی بالآخر وقت نے زمین کی طرف جھکا ہی دیا تھا وقت کی ظالم آندھی کے سامنے تو بڑے، بڑے جھک جاتے ہیں یہ، بی جان کس کھیت کی مولی تھیں، کمزوری جسم سے زیادہ چہرے سے عیاں تھی۔ پلوشہ کچھ بہتر حالت میں تھی اور تائی گلشن اس قدر بدل گئی تھی کہ پہچاننا مشکل تھا وہ تو بی جان سے بھی زیادہ بوڑھی اور کمزور لگ رہی تھی، سفید الجھے ہوئے بال، چہرے پہ جھریاں اور تھکاوٹ، آنکھوں سے جھانکتی ہوئی ویرانی اور شکست، نہ وہ قیمتی بھڑکیلے کپڑے، نہ وہ نخرے، نہ وہ ناز، نہ وہ حکمرانہ انداز..... وقت کے ساتھ تو انسان بدل ہی جاتا ہے مگر یہ بدلی ہوئی حالت تو نہ تھی البتہ تباہ شدہ حالت ضرور تھی جیسے کسی آباد شہر میں زلزلہ گزر جاتا ہے، وہ بھی

تائی گلشن کو اس حالت میں دیکھے گی اس نے سوچا ہی نہ تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

برآمدے کے ایک کونے میں زمین پہ اس کا چچا شہرام خان، ساتھ میں دلاور خان اور ثناء اللہ بھی بیٹھے تھے جنہیں مضبوط رسیوں سے باندھا گیا تھا۔

اسے بھی سب عجیب و غریب نظروں سے دیکھ رہے تھے، شاید انہوں نے بھی کبھی نہ سوچا ہوگا کہ وہ کبھی مرجان کو یوں دیکھیں گے، زندگی میں پھر دوبارہ اسے دیکھنے کی انہیں یقیناً نہ خواہش تھی، نہ امید، مرجان خود بھی بہت بدل گئی تھی، پہلے تو صرف خوب صورت تھی اور اب تو گویا خوب صورتی کا شاہکار۔

"ہاں، بی جان آپ ہی کہا کرتی تھیں اس دنیا کا اصول ہے جہاں کا مٹی ہوتی ہے اڑ کر پھر وہیں آ جاتی ہے۔" مرجان نے بی جان کو مخاطب کر کے کہا۔

"ہم تو سمجھا تم مر کھپ گیا ہوگا۔"

"مرا کھپا تو تم بھی نہیں بی جان، حالانکہ مرنے کا عمر تو ہو چکا ہے تمہارا، یقیناً امارے لیے ہی زندہ بیٹھا ہے، چلو مرنے سے پہلے، آنکھ بھر کے دیکھ لو، پیار کر لو اپنی مرجان کو، آخر ہم تمہارے بیٹے کی اولاد ہے، واحد اولاد، واحد نشانی۔"

"اگر زندہ بچ ہی گیا تھا تو یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"قسم تو میں نے بھی کھائی تھی کہ کبھی لوٹ کر اس منحوس گھر میں نہیں آئے گا مگر کیا کرے انسان کی طرح اس کی قسمیں بھی کمزور ہوتی ہیں، کمبخت ٹوٹ جاتی ہیں۔"

"تم کیا چاہتا ہے؟" اس کا چچا شہرام خان اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"انصاف۔"

"کیسا انصاف.....؟"

"بہت بوڑھا ہو گیا ہے تم بھی چچا، لگتا ہے امارا مورنے، کو بھول گیا ہے۔ جو کچھ تم نے اس گھر میں امارے ساتھ، امارا مورے کے ساتھ کیا تھا اس کا حساب تو ہوگا..... وہ کہاں ہے، امارا پیارا تایا جان، لالا، لالا کمل خان اور اس کا وہ لاڈلا بیٹا، حبیب اللہ۔"

"وہ نہیں ہیں۔" بی جان نے کہا۔

"کہاں ہیں؟ بلاؤ ناں، ملاقات کا بہت دل چاہ رہا ہے، آپ لوگوں ہی سے تو ملنے آیا ہے مل کر ہی جائے گا سب کو۔"

"تم ان سے نہیں مل سکتیں۔" اس دفعہ پلوشہ بولی۔

"کیوں؟"

"وہ کھائی سے نیچے پتھروں کا بھرا ٹرالی گرا وہ دونوں ٹرالی کے نیچے دب کر مر گیا۔ لاش نکالنا بھی مشکل تھا بہت ہی برا موت ہوا دونوں کا....."

"اچھا!....." وہ اب سمجھی کہ گلشن اتنی جلدی بوڑھی کیوں ہو گئی تھی۔ پہلے بیٹی کا دکھ، پھر جوان بیٹے کی موت کا غم، اور اوپر سے بیوگی کا یہ بوجھ..... آہ، کبھی وہ صنوبر کی بیوگی پہ اطمینان دل سے گھومتی تھی۔

"اے! دوسروں کے غموں پہ ہنسنے والو، اپنے غموں کے لیے آنسو بچا کے رکھو۔"

یہ وقت کی پکڑ، کتنی سخت تھی۔ کوئی نہیں بچ سکتا اس سے جیسے موت سب کے لیے، ویسے ہی قدرت کے سارے حساب کتاب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ سارے انسان جیسے ایک سے پیدا ہوتے ہیں، ایک ہی راستہ ہوتا ہے، زندگی اور ایک ہی منزل، موت، بس تھوڑا ہی تو فرق ہوتا ہے۔ اعمال اور کردار کا، یہ دنیا تو شطرنج کی بچھی اک بساط ہے۔ بس پیادوں، وزیر، ملکہ بادشاہ کا ایک عارضی اور معمولی سا فرق ہی تو ہوتا ہے۔ اور انسان بیوقوف اس معمولی فرق کے لیے خود کو اتنا کھپاتا ہے۔ یہ دنیا تو واقعی ایک سراب ہے، بھاگتے بھاگتے زندگی کی پیاس تو نہیں بجھتی البتہ زندگی ضرور بجھ جاتی ہے۔ وہ ابھی حیران و پریشان ہی کھڑی تھی کہ طاہر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"مرجان، کام ختم کرنا ہے۔"

"ہاں، اس نے اپنا سر ہلایا۔ یہاں اس لمحے وہ

خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کرے؟ آخر وہ کیا چاہتی ہے؟ طاہر کے ایک بندے نے شہرام اور دلاور خان کی طرف اپنی پستول سیدھی کی تو بی جان کی اور گلشن کی تو چیخیں ہی نکل گئیں۔

''نہیں خدا کے لیے یہ ظلم مت کرنا۔'' بی جان نے منت کی، اسے یقین ہی نہ آیا، یہ وہی بی جان تھیں۔ منت اور بی جان..... یہ ملاپ کچھ جچا نہیں۔

''اور یہ جو ظلم تم نے کیا تھا۔''

''ہم نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ صنوبر ایسے مرے۔ امارا اللہ جانتا ہے۔ ہمیں خود اس کی ایسی موت کا دکھ ہے شاید، اس طرح مرنا تمہاری ماں کا نصیب تھا۔''

''واہ، کیا پیاری بات کی ہے بی جان، پھر جھگڑا ہی کس بات کا، مجھو اس طرح مرنا اب ان کا نصیب ہے۔ اب اس نصیب پہ تم کو اتنا تکلیف کیوں ہو رہا ہے۔''

یہ لب ولہجہ، یہ بات کرنے کا انداز، اب جیسی بی جان ویسی مرجان، بی جان کو بھی کب اس پہ یقین آ رہا تھا۔

''تم وہی مرجان ہو ناں، جو ایک طوطے کو بھی زخمی نہیں دیکھ سکتی تھی، کیا تھی تم..... ایک معمولی پرندے کی بھی تکلیف تم سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔'' بی جان نے اسے اس کا معصوم بچپن یاد دلایا۔

''نہیں، ہم وہ مرجان نہیں ہے۔'' وہ بی جان کے قریب آئی۔ انتہائی قریب، ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تیز نظروں سے دیکھا۔ اس معصوم مرجان کو بی جان تم نے ہی تو مارا تھا۔ وہ بے چاری تو ابھی تک دفن ہے بکریوں کے اس باڑے میں۔''

''ابھی تو اس گھر نے دو بیٹوں کے جنازوں کو رخصت کیا ہے۔ مرجان..... مت کرو۔'' یہ پلوشہ تھی۔ ''رحم کرو۔''

''رحم، مجھ پہ رحم کیا تھا کسی نے؟''

اس کے سوال پر سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر، نظریں چرا لیں۔

''تو.....؟'' طاہر نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہاں نہیں، ادھر بکریوں کے باڑے میں لے جاؤ انہیں۔''

''نہیں، انہیں چھوڑ دو، میری بیٹو کو چھوڑ دو۔'' بی جان، جانے کمزور ہو گئی تھیں، رو رہی تھیں، اسے تو یہ وہ بی جان لگ ہی نہیں رہی تھیں۔ بی جان، روتے ہوئے کتنی عجیب لگ رہی تھیں۔

''بی جان، کیا صرف بیٹوں کی موت کا غم کرتے ہیں؟'' مرجان نے سوالیہ نظروں سے بی جان کی طرف دیکھا۔ ''پھر تو آپ کے مرنے کا کسی کو غم نہیں ہوگا۔''

وہ بکریوں کے باڑے میں ان کے پیچھے آئی۔ نہ گھر بدلا تھا، نہ وہ باڑہ البتہ بکریوں کی تعداد پندرہ سے دو ہو گئی تھی۔ جب اس کی ماں تھی تو گھر کے ہر حصے کی صفائی رکھتی تھی، اب اس گھر میں وہ بات نہ رہی تھی، آباد گھروں جیسی، اسے ماں یاد آئی، بہت یاد آئی، اب بھی ایسے لگتا تھا جیسے اسی گھر میں آباد ہو یہ شاید اس کی پاک روح کی خوشبو تھی جو اس کی جان، اس کی بیٹی، اس کی مرجان کو نے، کونے سے محسوس کر سکتی تھی۔

طاہر نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو مرجان نے پہلے گھٹنوں کے بل بیٹھے/ جھکے اپنے پیارے، چچا شہرام خان کی طرف اشارہ کیا۔ طاہر کے ایک بندے نے اشارے سے ہی اپنی لوڈڈ گن سیدھی کر لی۔

''نہیں۔''

پلوشہ نے اپنے سر کی چادر اتاری اور مرجان کے پاؤں میں رکھ دی۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

''مرجان، ایسا مت کرو، وہ امارا شوہر ہے، امارے سر کا تاج، امارا سرنگا مت کرو۔''

''ساری زندگی کون سا سکھ اس نے دیا ہے تمہیں چچی! جانوروں کی طرح تمہیں رکھا، کتنا رلایا ہے تمہیں، کیوں اس کے لیے بھیک مانگ رہی ہو۔''

''وہ میرے بچوں کا باپ ہے، میرے بچوں کو یتیم مت کرو۔''

''اس نے کس بے دردی کے ساتھ اماری مورے کی جان لی، تم تو خود گواہ ہے اس ظلم کا، اماری مورے نے ہمیشہ بہنوں کی طرح تمہارا خیال رکھا۔ کیا تم اس کے قاتل کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو۔''

''اس سے نہیں۔'' مرجان نے طاہر کے بندھے کے ہاتھ میں اٹھائی گن کو ہاتھ سے پرے کیا۔

''اماری ماں کا موت اتنا آسان نہیں ہوا تھا۔ بہت دردناک موت دی تھی ان ظالموں نے بڑی تکلیف سے مرا تھا وہ۔'' مرجان نے باڑے میں نظر دوڑاتے ہوئے آخر کیسی ڈھونڈ ہی لی۔ کمخنوں نے ابھی وہ کیسی رکھی ہوئی تھی اور وہ بھی اسی بکریوں کے باڑے میں شاید اسی دن کے لیے۔ مرجان نے ایک ہاتھ سے اس وزنی کیسی کو پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی لے آئی۔ اس نے ایک نظر بی جان کو دیکھا پھر ایک نظر اپنے چچا کو اور پھر کیسی پہ اپنے دونوں ہاتھ مضبوطی سے رکھے اور اسے کچھ ہوا میں بلند کیا۔

اسے، اس رات کا وہ تکلیف دہ لمحہ یاد آ گیا جب اس کی ماں کے خون سے اسی جگہ کی مٹی تر ہوگئی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، شدید غم کے جذبات تھے جانے کتنے آنسو اس کے گالوں سے رینگتے ہوئے اسی مٹی پہ جا گرے۔ اس نے پختہ ارادے سے آنکھیں کھولیں مگر آنکھیں کھولتے ہی اسے اپنی مورے ..... باڑے کے دروازے کے پاس کھڑی نظر آئی۔ اسے لگا جیسے وہ مسکرا رہی ہے۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی۔ وہ ابھی اپنی مورے کو دیکھ ہی رہی تھی کہ اس کی مورے باڑے کے کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ گویا کوئی قیدی دس بارہ سال بعد رہا کر دیا گیا ہو۔

بے تحاشا آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آئے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے کیسی کو ایک طرف پھینک دیا اور لرزتی ہوئی آواز سے خود سے مخاطب ہوئی۔

''ہم نے معاف کیا، ہمیں اللہ کے انصاف پہ زیادہ یقین ہے وہ اپنے چچا شہرام خان کی جان نہیں لے سکتی تھی، پلوشہ کی خاطر، بھی وہ دعا کیا کرتی تھی کہ پلوشہ کی زندگی میں خوشی اور سکون ہو۔ اس نے ہمیشہ پلوشہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور اب خود اپنے ہاتھوں سے کیسے وہ..... اور ویسے بھی انصاف تو ہو چکا تھا، اس کے آنے سے پہلے ہی تقدیر سارے حساب برابر کر چکی تھی، اللہ کا عدل معتبر تھا اس کے تایا لالا گل خان اور اس کی بیوی نے اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے اس یتیم کو سولی چڑھایا تھا مگر، پھر بھی نہ بچا سکے تھے۔ گھر کے بیٹوں کی جان زیادہ قیمتی تھی اور بیٹیوں کی سستی۔ کہاں تھا وہ لالا گل خان، بی جان کا سب سے پیارا بیٹا اور کہاں تھا وہ حبیب اللہ، گلشن کا شیر جوان، مرجان کی آنکھوں نے کبھی اس گھر کو آباد دیکھا تھا کبھی زندہ لوگ بستے تھے یہاں اب تو جیسے اعمالوں کا بوجھ اٹھائے مردے، یہ بکھرا شیرازہ دیکھ کر اس کا دل بھی جانے کیوں..... زویا۔

''رہنے دو طاہر، ہم یہاں جن لوگوں سے بدلہ لینے آیا تھا اب وہ یہاں نہیں رہتا، ان سے اب ہم کیا بدلہ لے۔ ان پہ تو ترس آ رہا ہے۔''

''کیا؟'' طاہر نے اس کی طرف وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''چلو! چلتے ہیں واپسی کا راستہ بہت لمبا ہے۔''

''اس نے ایک نظر بی جان، پلوشہ، تائی گلشن، اپنے چچا اور پھر ایک نظر اسے دیکھا۔ دلاور..... خلیل اللہ نے سچ ہی کہا تھا بہت بدصورت ہو گیا تھا، خاصا چہرہ بگڑ چکا تھا مگر آنکھیں، ویسی کی ویسی۔ آنکھیں چار ہوئیں تو.....''

''تم ایسے نہیں جا سکتا، ابھی امارا حساب بے باک نہیں ہوا۔'' مرجان کو تو پتا ہی نہ تھا کہ دلاور خان نے قسم کھائی تھی کہ نکاح کے کلمے نہیں پڑھوائے گا جب تک اسے ٹھکانے نہ لگا لے، وہ بھی اپنے ہاتھوں سے۔

''قسم کھایا تھا ہم نے..... ہم نے تمہیں بہت

ڈھونڈا، کاش تم ہمیں مل جاتا، منحوس عورت۔'' وہ غصے میں چنگھاڑا۔

''منحس تو تم ہے، اپنا شکل تو دیکھو، نحوست ٹپک رہا ہے۔'' مرجان نے انتہائی بے رحمی سے اس کے جلتے دل پہ اور تیل چھڑک دیا۔

''تم فکر نہ کرو، تمہارا شکل تو ہم اس سے بھی زیادہ بگاڑے گا۔''

''تم نے جو بگاڑنا تھا بگاڑ لیا۔ صبر کر کے بیٹھو دلاور خان۔ اپنے لیے نہیں تو اپنی اس ماں کے لیے اماری ماں کا میت تو ٹھکانے لگایہ چلتا پھرتا میت جانے کب ٹھکانے لگے۔''

''میری ماں کا یہ حالت بھی صرف تمہاری وجہ سے ہے منحوس..... اگر تم نہ بھاگتا تو زرمینے بھی دیت میں نہ جاتا۔''

''یہی تو ہم تمہیں سمجھا رہا تھا اگر تم قتل نہ کرتا تو ہم بھی دیت میں نہ جاتا، اس وقت تو اماری بات تمہاری سمجھ میں نہ آیا، اب آ گیا ہوگا۔'' اس نے اک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''یہ وقت کا حساب ہے..... تقدیر کا فیصلہ، اللہ کا انصاف تب ہم بے بس تھا، اب تم..... تمہیں نظر نہیں آ رہا دلاور خان وقت سارے حساب خود ہی بے باک کر دیتا ہے۔ جسے ڈھونڈنے کی تم نے اتنی زحمت کی وہ آج، تمہارے سامنے ہی کھڑی ہے، ہمت ہے تو پورا کر لو اپنا قسم۔''

''تم اماری پہلی محبت ہو مرجان اور..... آخری نفرت۔'' اس نے دانتوں میں غصہ دباتے ہوئے کہا۔

''صرف، نفرت کی بات کرو، دلاور خان۔'' اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

''محبت تو کہیں بہت پیچھے رہ گئی، معصوم بچپن کے ساتھ ہی دفن ہوگئی، انار کے درخت پہ لگی اس کلی کی طرح، جو ابھی کھلنے بھی نہ پائی تھی اور، مسل دی..... تم ظالموں نے۔''

''یعنی، وہ۔'' وہ بے یقینی میں بڑبڑایا۔ ''یعنی وہ چپ وہ خاموشی وہ اظہار تھا۔'' اسے بالکل یقین نہ آیا۔

''نہیں مگر وہ انکار بھی نہیں تھا۔'' کتنے ہی آنسو مرجان کی آنکھوں میں امڈ آئے۔ دلاور خان کو لگا، سارے کے سارے آنسو اس کے دل پہ آ گرے ہوں، اسے سینے میں شدید تکلیف محسوس ہوئی، جیسے کسی چیز نے اس کے دل کو مٹھی میں پکڑ کر اس قدر بے دردی اور سختی سے دبا دیا ہو کہ ایک شدید درد کی لہر اس کے جسم کی رگ، رگ تک پھیل گئی۔ آہ مرجان..... خاموشی ٹوٹی بھی تو یہاں آ کر ماضی کے بند دریچے کسی تیز آندھی سے یوں کھلے کے سالوں کی پڑی دھول جیسے ہر طرف پھیل گئی۔

''ہم تمہیں بتانا چاہتا تھا، تمہارے ہاتھ کا لڈو واقعی بہت میٹھا تھا۔'' وہ اس وقت ایسا کچھ کہنا تو نہیں چاہتا تھا مگر۔''

''کاش کہ، ہم نے اس لڈو میں میٹھے کی جگہ زہر ڈالا ہوتا، منزل خان کے بیٹے کے مرنے سے پہلے ہی تمہیں قبر کی گہرائیوں میں اتار دیتا، تو اماری ماں اس تکلیف سے نہ گزرتا اور نہ ہم..... اماری نصیب میں ایک دوسرے سے محبت کرنا لکھا ہی نہیں تھا، دلاور خان، صرف نفرت لکھا تھا..... صرف نفرت۔''

''اگر نفرت ہی کرتا ہے تو ہمیں مارے بغیر کیوں جا رہا ہے یہاں سے۔''

''بس یہی غلطی ہوا ہم دونوں سے..... تم سے محبت کا حق ادا نہ ہوا دلاور خان، اور ہم سے نفرت کا۔'' شدید کرب و ملال سے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی مرجان نے کانپتا ہوا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔

''تمہاری وجہ سے ہم نے بہت تکلیف کاٹا۔''

دلاور خان کے لب و لہجے پہ پھر نفرت حاوی ہونے لگی۔

''ہوں۔'' مرجان کے چہرے پہ اک طنزیہ مسکراہٹ کی لہر آ کر گزر گئی۔

''دوسروں کے دامن کانٹوں سے بھرو گے تو اپنی ہتھیلیاں تو زخمی ہوں گی۔''

''تمہیں لڈو میں زہر نہ ڈالنے کا دکھ ہے۔ ہمیں بھی تمہیں زندہ چھوڑنے کا بہت دکھ ہے، کاش، اس دن تمہارا گلا دبا دیا ہوتا اور تمہارا لاش منزل خان کے خاندان کے حوالے کر کے جان چھڑوالیتا۔''

''جان تو تم ہم سے مر کر بھی نہیں چھڑوا سکتا دلاور خان..... آج ایک سچ کا اعتراف ہم بھی کرتا ہے وہ دو قدم چل کر اس کے قریب آ گئی، تم بھی ہماری پہلی محبت ہے اور..... آخری نفرت۔''

لفظ، نفرت پہ اس کی آنکھوں میں بھی نفرت عود آئی۔ اس کی کمال سرگوشی نے دلاور خان کا دماغ گرم کر دیا۔

''چلو، چلتے ہیں۔'' وہ طاہر کی طرف مڑی۔

گلشن اور لی جان نے اسے تشکر کے جذبات کے ساتھ دیکھا، پلوشہ بڑھ کر اس کے ماتھے پہ پیار کرنا چاہتی تھی مگر نہ کر سکی۔ اچانک ہی دلاور خان رندہ لے کر اس کی طرف لپکا اس سے پہلے کہ وہ مرجان کی گردن پہ رندہ مار کر اسے زخمی کرتا..... طاہر نے بغیر دیر کیے سیدھا نشانہ اس کے سر کا لیا اور گولی کی آواز تھی اور، گلشن کی چیخ وہ وہیں بیٹھ گئی، ایک اور بیٹے کی ناگہانی موت، اس کی ٹانگوں سے گویا جان ہی ختم ہو گئی۔ اسی جگہ، اسی بکریوں کے باڑے میں، دس بارہ سال پہلے، خون بہا تھا سب کی آنکھوں کے سامنے وہی رات گھوم گئی۔ دلاور خان یقیناً طاہر کھوکھر عرف ٹیپو کو نہیں جانتا تھا ورنہ کبھی یہ حماقت نہ کرتا۔ ٹیپو کا تو اڑتی چڑیا کے پر پہ بھی کبھی نشانہ خطا نہ ہوا تھا۔ لاہور کی گلیوں میں پھرنے والے عام بچوں سے لے کر، رائے ونڈ کے معتبر شاطر سیاستدان اس سے خوب واقف تھے۔ یہ دلاور خان تو واقع عجیب تھا، خواہ مخواہ کی موت کو گلے لگالیا۔ وہ بھی کافی دیر حیران و پریشان کھڑی رہی پھر سنبھل کر تائی گلشن کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تمہاری حالت پہ رحم آتا ہے۔ جب تم جیسا لوگ خود کو خدا سمجھتا ہے تو وہ ایسے ہی اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ ہمیں پھر بھی تمہارے جوان بیٹوں اور شوہر کے اس طرح مرنے کا دکھ ہے۔ کیا کرے، تمہاری طرح کم ظرف نہیں کہ کسی کے مرنے پہ خوش ہو..... اللہ تمہیں صبر دے۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

''جو اللہ کی مرضی۔''

☆☆☆

اور وہ بہت کچھ پیچھے چھوڑ کر اس دروازے سے نکل آئی۔ دل غم سے بوجھل تھا۔

''یہاں گاڑی روکنا۔'' اور وہ، ایک سمت دیکھ کر رونے لگی، دل ایک تھا اور غم کئی وہ بے چاری بھی کرتی تو کیا کرتی۔

''تو، دلاور، تمہارا انجام ایسے لکھا تھا، میرے ہاتھوں، میری آنکھوں کے سامنے۔'' وہ آسمان جیسی نیلی آنکھیں، جن کو دیکھ کر اس کی دھڑکن بے ترتیب ہو جاتی تھی جن کا سامنا کرنے سے وہ ہمیشہ ڈرتی تھی، وہ نیلی سمندر جیسی آنکھیں وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

''مورے، کاش تم نے مرجان کو نہ جنا ہوتا۔'' وہ سامنے قبرستان کو دیکھ رہی تھی۔

''کون ہے وہاں۔'' طاہر نے اسے مسلسل ٹکٹکی باندھے دیکھا تو اس سے پوچھا۔

''مورے۔'' وہ اتنا کہہ کر پھر رو پڑی۔

طاہر گاڑی سے اترا، اس کی سیٹ کی طرف کا دروازہ کھولا۔

''آؤ۔''

''کہاں؟''

''تمہاری مورے سے تمہیں ملوالاؤں۔''

''نہیں۔'' وہ پھر رونے لگی۔

''کیوں؟''

''ہم نہیں جا سکتا، مرجان کا وجود اتنا گندا ہو گیا ہے، اس زندگی کا راستہ طے کرتے کرتے، مورے ہم شرمندہ ہے۔ ہم بہت شرمندہ ہے۔'' اسے لگا غم سے اس کا دل پھٹ جائے گا۔

''اچھا چلو، واپس چلتے ہیں۔ طاہر نے گاڑی پھر لاہور کی طرف دوڑا دی۔ وہ دو دن طاہر کے

ڈیرے پہ ہی رہی۔ اس کا قرض بھی تو اتارنا تھا۔

☆☆☆

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

وہ تھکی ہاری گھر پہنچی ابھی غم کا ٹوکرا سر سے اتار کر رکھا ہی نہ تھا کہ دائی اماں نے ایک اور خبر سنا دی۔ وہ بے حسی سے اس کی منتظر تھیں۔

''خلیل اللہ آیا تھا۔''

''کیا؟'' اسے اپنے کانوں پہ یقین ہی نہیں آیا۔

''وہ، زندہ ہے۔''

''یقیناً، زندہ ہے۔ دو ماہ پہلے ہی رہا ہوا ہے جیل سے، تمہیں اس کی موت کی خبر کس نے دی تھی۔'' دائی اماں نے استفسار کیا۔

''وہ..... ڈی، ایس، پی شوکت علی۔''

''ہوں، جھوٹ بولا تھا اس کمبخت نے۔''

''مگر اس نے جھوٹ کیوں بولا اور وہ بھی اتنا بڑا جھوٹ۔'' زندگی میں بہت سے جھوٹوں کا سامنا کر کے بھی مرجان کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بڑا ہی رذیل نکلا یہ ڈی، ایس، پی خیر اب مرے بندے کو کیا کہوں۔''

دائی اماں کو غصہ تو تھا مگر کیا کر سکتی تھیں جو ہوا، سو ہوا۔ چودھری شوکت علی نے خلیل اللہ کو ٹھکانے لگانے کا مکمل منصوبہ تو بنا لیا تھا مگر اس سے پہلے خود ہی ٹھکانے لگ گیا۔ موت تو وہ منزل ہے جس پہ کس نے پہلے پہنچنا ہے اور کس نے بعد میں اس کا انتخاب وہ خود کرتی ہے۔ اگر چودھری کو زندگی ذرا سی اور مہلت دے دیتی تو خلیل اللہ کبھی یہاں تک نہ پہنچ سکتا۔

''اچھا تو، اس کمبخت نے اسی لیے تم سے نکاح نہیں کیا۔'' دائی اماں ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کر سوچنے لگیں۔

''خلیل اللہ زندہ ہے۔'' مرجان کی عجیب حالت تھی خوش بھی تھی اور حیران بھی، اسی بے یقینی میں وہ صوفے پہ بیٹھ گئی۔

''اللہ کا شکر ہے، خلیل اللہ زندہ ہے۔''

''شکر مت مناؤ مرجان، وہ بالکل اپنے حواس میں نہیں ہے، پاگلوں کی طرح ہر طرف ٹکریں مارتا پھر رہا ہے۔''

''کیوں؟'' مرجان نے سوالیہ نظروں سے دائی اماں کی طرف دیکھا۔

''وہ بہت غصے میں تھا، اس کی آنکھوں میں غصے اور نفرت کی آگ دیکھی ہے میں نے، مرجان، تم جاؤ، چلی جاؤ، وہ کہہ رہا تھا۔'' دائی اماں شدید پریشان تھیں۔ ''وہ کہہ رہا تھا، نہیں چھوڑے گا، تمہیں بالکل نہیں چھوڑے گا، تمہاری جان لے لے گا۔''

''اماری جان لے لے گا۔''

''ہاں، دائی اماں کے پریشانی میں ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ کہتا ہے تم ایک بے وفا، بدکردار عورت ہو، اس کے ہاتھ میں پستول تھا، ہمیں ڈھونڈ رہا تھا کہہ رہا تھا، تمہیں مارے بغیر اطمینان سے نہیں بیٹھے گا۔''

''تسلی رکھو دائی اماں، پانی پیو۔'' مرجان نے پانی کا گلاس بھر کر ان کی طرف بڑھایا۔ ''جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔''

دائی اماں جتنی گھبرائی ہوئی تھیں وہ اتنی ہی پرسکون تھی۔

''تم نے سنا نہیں، وہ کہہ رہا تھا۔''

''سن لیا، دائی اماں سن لیا۔'' دائی اماں تو اس کے پرسکون رویے پہ حیران تھیں۔

''آپ تو ایسے پریشان ہو رہی ہو دائی اماں، جیسے ہم اس دنیا میں مرنے والا کوئی پہلا انسان ہوگا، روز جانے کتنے مرتے ہیں، چلو، ان میں ہم بھی سہی۔''

''موت آسان نہیں ہوتی۔''

''زندگی کون سا آسان ہوتی ہے۔''

''یعنی، تمہیں کوئی فکر نہیں۔'' پانی کا گلاس پکڑے، وہ بھی اس کے پاس صوفے پہ بیٹھ گئیں۔

''رہنے دو، دائی اماں، اب اتنی فکر کون کرے، اس نے اطمینان سے ایک لمبا سانس لیا اور، صوفے کی بیک پہ سر رکھ کر سکون سے آنکھیں بند کر لیں۔ پتا نہیں کیوں؟ مگر اب کسی بات کی فکر نہیں ہوتی۔''

☆☆☆

شام کو بھی وہ ٹیرس پہ بیٹھی کھلے آسمان کو دیکھتی رہی۔ یہ شام کا منظر بھی، کتنا اداس کر دینے والا ہوتا ہے۔ سورج..... دیکھتے، دیکھتے یہ سورج بھی غروب ہو ہی گیا۔ رات کی تاریکی گہری سے گہری ہونے لگی۔ اندھیرے کے ساتھ احساس تنہائی بھی بڑھنے لگا احساس تنہائی سے اس کا دل بوجھل ہونے لگا تو وہ بے اختیار رونے لگی۔ یہ آنسو بھی.....! وہ آنسو صاف کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ یہ آنسو ہی تو تھے جو ابھی تک اس کا ساتھ نبھا رہے تھے باقی تو سب.....! کمبخت ایسی وفا نبھائی کہ رو، رو کر بھی خشک نہ ہوتے تھے۔

مغرب کی نماز پڑھ کر دائی اماں، تسبیح ہاتھ میں اٹھائے اسے ڈھونڈتی ادھر ہی آ گئیں۔

''رو، رو کر..... کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔ اب بھی کہتی ہوں دیر نہیں ہوئی بچے، چلی جاؤ، یہاں بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا کوئی عقل مندی ہے۔''

''مجھے کیا معلوم، عقل کسے کہتے ہیں؟''

''اپنا نہیں تو اپنے معصوم بچوں کا کچھ سوچو، اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو، کچھ ان کی ہی فکر کرو۔''

''ہم کیوں فکر کریں، ہم کون ہوتا ہے فکر کرنے والا، جس کا تخلوق ہے وہ خود ہی بندوبست کر دے گا۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔..... ''ہم تو سوچ رہا ہے، معلوم نہیں، ہم کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا۔ ہو سکتا ہے خلیل اللہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو، ہو گا ہم بے وفا، بدکار، بدکردار، قابل سزا۔''

''نہیں، تم بھی اچھی طرح جانتی ہو، تم بے وفا ہو نہ بدکار، یہ دنیا جو سمجھتی ہے، وہ سچ نہیں۔''

''بد سے بدنام برا، یہ بھی تو اسی دنیا کا سچ ہے، چھوڑو بھی دائی اماں! یہ فیصلہ تو شاید ہمارے مرنے کے بعد بھی نہ ہو سکے کہ، ہم کیا تھا۔''

''بس بچے، جو تقدیر میں لکھا ہو، وہ تو دیکھنا ہی پڑتا ہے، جو اللہ نے.....''

''اللہ، ہاں..... اللہ، دائی اماں ایک بات تو بتاؤ کیا اللہ ہمیں معاف کر دے گا۔''

''آہ، انسان گناہ کا پتلا ہے اور وہ، غفور و رحیم، اس کی رحمت کا دائرہ تو بہت وسیع ہے میری بچی یہ دنیا جتنی بے رحم ہے۔ وہ اتنا ہی مہربان، یہ دنیا، یہ رشتے جتنا بڑا جھوٹ ہیں اس کی ذات اتنا ہی بڑا سچ، یہ انسان کو تنہا چھوڑ سکتے ہیں مگر وہ کبھی اپنے بندے کو تنہا نہیں چھوڑتا۔''

''دائی اماں، اس کا دل بھر آیا، ہم تو نہ اس کو سمجھ سکا نہ خود کو، ایسی بے کار کی زندگی گزاری۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

''خود کو اور تکلیف مت دو مرجان، میری، تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔ یہاں تو بڑے بڑے عقل مندی اور سمجھ دار اس گورکھ دھندے کو نہیں سمجھ پائے..... ان باتوں کی بھلا ہمیں کیا خبر، یہاں تو بڑے باخبر لوگ کہہ گئے۔''

''بھلیا کی جاناں میں کون؟''

''آپ پڑھی لکھی ہو دائی اماں۔''

''ہاں، اور نہیں تو کیا، میٹرک پاس، ہم چار بہنیں ہی میٹرک پاس تھیں۔ کوئی بھائی نہ تھا، میرے ابو شاعر تھے۔ ادب میں ایک نام ہے ان کا۔''

''اچھا، آپ نے کبھی بتایا نہیں۔''

''ہاں، کبھی باتوں میں ذکر ہی نہیں ہوا۔ میرے ابو بہت سمجھ دار تھے۔ ایک دنیا ان کی سمجھ داری اور عقل کی قائل تھی۔ لوگ ان سے مشورے لیتے، اپنے معاملات اور مسائل میں ان سے فیصلے، مگر اپنے لیے انہوں نے جتنے بھی فیصلے کیے مرتے دم تک ان پہ رنج و غم میں مبتلا رہے۔ ہم بہنوں کی زندگی کا ایک بھی فیصلہ صحیح نہ تھا۔ ہم تو کہتی رہیں، ابو غم نہ کریں۔ یہ تو نصیب کی بات ہے ہمارے نصیب ہی ایسے ہوں گے، آپ کا کیا قصور۔ ہم چار اولادیں تھیں ان کی، کسی سے بھی سکھ نصیب نہ ہوا انہیں۔ ہم بھی کیا کرتے، تکلیف میں صرف باپ کا کندھا نظر آتا، ہمیں کیا معلوم تھا اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں کا اتنا بوجھ ان پہ ڈال رہے ہیں جوان کے بوڑھے کاندھوں کے لیے ناقابل برداشت ہے۔'' دائی اماں کے لب و لہجے میں شدید ملال تھا۔ ''اس وقت میں نے دعا

کی، یا اللہ مجھے کبھی بیٹی نہ دینا، صرف بیٹے دینا، شاید، غلط ہی دعا مانگی ہوگی، کاش میں کہتی، یا اللہ مجھے زندگی میں صرف سکون دینا، ایمان دینا، اطمینان قلب دینا۔

''آپ صحیح کہتی ہیں، اطمینان قلب سے بڑی کوئی دولت نہیں آہ، خوش قسمت ہے وہ انسان جسے عزت کی زندگی اور سکون کی موت نصیب ہو۔ کاش میں بھی خوش قسمت ہوتی۔ بچپن میں مورے بتاتی تھی، اگر انسان نیک ہو تو موت کا فرشتہ سفید لباس میں ملبوس ایک خوشبودار گلاب کا پھول لے کر آتا ہے آدمی کو سنگھاتا ہے اور روح قبض کر لیتا ہے اور اگر، انسان گناہ گار ہو تو وہ ایک بھیانک جلاد کی طرح آتا ہے ایک بہت وزنی درآدمی کے ٹخنے پہ مار کر اس کی روح نکالتا ہے۔'' وہ پھر رونے لگی، بے تحاشا آنسو آنکھ میں آ گئے۔

''ہمیں بتاؤ ناں دائی اماں، ہم کیا ہے؟ نیک یا گناہ گار ..... ہمارا اللہ ہمیں معاف کر دے گا یا سزا دے گا؟''

دائی اماں نے اپنے آنسوؤں سے گیلا ہاتھ اس کے سر پہ رکھ دیا، ہائے یہ بے چارا انسان بھی، ساری زندگی گزار دیتا ہے اور اک اپنی ذات کے راز کو بھی نہیں پا سکتا۔ سچ ہی تو کہا ہے بھلے نے۔

بھلیا کی جاناں میں کون ؟
نہ میں مومن وچ مستیاں
نہ میں وچ کفر دی ریت آں
نہ میں پاکاں ، وچ پلیٹ آں

دائی اماں کی بھی ہچکی بندھ گئی وہ اسے کیا دلاسا دیتیں، مشکل سے اٹھیں اور روتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

نہ میں پاکاں وچ پلیٹ آں
نہ میں پاکاں وچ پلیٹ آں

بے چاری مرجان نے دکھ، تھکن اور آنسوؤں سے بوجھل ہوتی، ہوئی آنکھوں کو بند کیا، وہیں نیچے سر رکھا اور بے سدھ ہو کر سو گئی۔ جیسے تھکن ہو، شدید تھکن، صدیوں، سالوں کی تھکن وہ تھکن سے بے حال تھی۔ وہیں رات بیت گئی، ساری رات بیت گئی۔

☆☆☆

صبح اس کی حالت بری تھی۔ دائی اماں آئیں، ان کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں مرجان کو اٹھانے کے لیے ہاتھ لگایا تو بخار میں تپ رہی تھی۔

''کیا حال کر لیا ہے تم نے اپنا۔'' دائی اماں کو اس کی حالت پہ افسوس ہو رہا تھا۔

''ٹھیک تو ہے ہم، کیا ہوا، امارے حال کو.....''

''کہاں ٹھیک ہو، اسے ٹھیک ہونا کہتے ہیں۔''

''مرجان بچے۔'' دائی اماں ذرا ٹھہر کر بولیں۔ ''چلی جاؤ یہاں سے بہت برا خواب دیکھا ہے میں نے مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔''

''اماری اتنی فکر مت کرو دائی اماں۔'' مرجان دوپٹا سنبھالتے ہوئے اٹھی۔

''ہم اندر جا رہا ہے۔ تیار ہو کر آتا ہے۔''

''تمہیں تو تیز بخار ہے۔''

''غسل کر کے، کپڑے بدل کر آتا ہے، کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

''کیوں؟ کہیں جا رہی ہو؟''

''ہاں، شاید.....'' وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی، دائی اماں چوکیدار سے کہلوا دو، اگر خلیل اللہ آئے تو اسے عزت و احترام سے اندر لے آئے۔'' اور دائی اماں تو بس، کچھ کہتے، کہتے رک گئیں۔

تھوڑی دیر بعد جب وہ، کمرے سے نکلی تو خوب تیار تھی جیسے کوئی دلہن، بارات کے انتظار میں کھڑی ہو، کپڑے، گہنے، خوشبو، سب تھا بس، دولہے کا انتظار تھا۔ وہ بھی آ ہی گیا۔ خلیل اللہ، پورے پانچ سال بعد، دیکھا تھا اس نے۔ کافی بدل گیا تھا، خاص طور پہ داڑھی..... کافی بڑھی ہوئی تھی اور مونچھیں، اس کی مونچھیں کبھی اتنی لمبی اور بے ڈھنگی نہیں تھیں مگر، پھر بھی اچھا لگ رہا تھا۔

''اگر یہ ہمیں مارنے آیا ہے تو کہہ دیں اس سے دائی اماں ذرا دیر نہ کرے۔'' اماری جان لینے کا حق اس سے زیادہ کس کو ہے۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا ناں، ہم سے کہ محافظ ہو گا، اماری عزت کا، اماری خوشی کا، اماری جان کا، ہر صورت حفاظت کرے گا، زندگی کی آخری سانس تک، چاہے تمہاری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔''

''تم وہ نہیں ہو۔'' خلیل اللہ نے گولیوں سے بھرا ہوا پستول نکالا۔

''تم بھی وہ نہیں ہو۔'' مرجان مسلسل اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی۔

''ایک وقت تھا، جب تم ہمیں دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھا، ام نے تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ دیا، اس حال، کو پہنچ گیا اور امارے جیل جاتے ہی تم..... بے وفا عورت۔ ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایسے کبھی اپنے ہاتھوں سے تمہاری جان لے گا..... لیکن تجھ بے غیرت کو زندہ بھی نہیں چھوڑ سکتا۔''

''ہم بے غیرت ہے کیونکہ ہم عورت ہے، یہ فیصلہ کس نے کیا کہ صرف مرد ہی غیرت مند ہوتا ہے۔'' مرجان نے درد بھری سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بس، ہم عورت ہونے کا بہت سزا کاٹ چکا، اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں بھی سزا کا اختیار ہے تو، یہ آخری سزا بھی سنا دو ہمیں..... مرجان نے بہت سے پل صراط پار کیے ہیں یہ بھی سہی۔''

''واہ خوب، خلیل اللہ کی زہریلی طنزیہ مسکراہٹ نے جیسے اس کا دل چیر دیا۔''

''بازار میں آج تمہارے مقابل کا کوئی عورت نہیں اور باتوں میں تو بالکل نہیں، تم بہت تیز ہو گیا ہے مرجان لیکن تمہاری باتوں کا یہ تیزی کسی کام کا نہیں، تم بچ نہیں سکتا۔''

''تم اماری جگہ کھڑا ہوتا تو جان جاتا خلیل اللہ، جب کوئی سولی پہ چڑھا ہوتا ہے تو وہ بچنا نہیں چاہتا، صرف نجات چاہتا ہے۔''

''تو کیوں چڑھا تم سولی۔'' خلیل اللہ نے غصے میں دانت پیس کر زور دے کر کہا۔

''عزت کی زندگی گزارنے سے تمہیں، عزت بیچنا آسان لگا۔''

''امارا اللہ ہی جانتا ہے کتنا آسان تھا۔''

''ہمیں تو بڑی محنت مزدوری کے درس دیتا تھا اپنی دفعہ کیا ہوا ہاتھوں پہ چھالے پڑ گئے۔''

''دل پہ چھالے پڑ گئے۔'' دکھ سے مرجان کی آواز کپکپا گئی۔

''کیوں اس غلاظت میں گرایا خود کو، اس سب کی خاطر۔'' خلیل اللہ نے آراستہ ڈرائنگ روم کے ریشمی پردوں اور شاندار، دیواروں پہ طنزیہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' مرجان نے جھکی نظروں اور گردن سے بس نفی میں سر ہلایا۔

''بھوک.....''

''خلیل اللہ جس مرجان کو جانتا تھا وہ بھوک سے مر تو سکتا تھا مگر اپنی عزت.....''

''ہاں، مر سکتا تھا ہم بھوک سے مگر بچوں کی بھوک، ایک ماں کے دل کی تکلیف ایک ماں ہی سمجھ سکتا ہے، تم جیسا مرد نہیں۔'' آخری جملے میں اس نے بھی خلیل اللہ کو غصے سے گھورا۔

''لاکھ لعنت تم پہ، لعنتی عورت، شرمندہ ہونے کے بجائے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔ مرنے دیتا بچوں کو۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''اس سے تو بہتر تھا موت ہی آ جاتا انہیں۔''

''تم کیسے، کہہ سکتا ہے یہ، وہ اولاد ہے تمہاری، تمہیں کچھ خبر ہے، تمہارے جانے کے بعد تمہارے معصوم عثمان کے ساتھ کیا ہوا؟''

''میری اولاد، میرا عثمان، ہمیں کیا خبر وہ کس کی اولاد ہے؟'' یہ خلیل اللہ کے منہ سے نکلا کوئی جملہ نہ تھا گویا، دھکا تھا۔ اسے لگا وہ ایک لمحے میں کسی بہت گہری کھائی میں آ گری ہے۔

''کس کی اولاد.....؟'' وہ ٹھہرائی آنکھوں اور کپکپاتی آواز کی ساتھ زیر لب، بڑبڑائی..... کس کی اولاد.....؟'' اس دفعہ بے تحاشا آنسو اس کی آنکھوں سے پھلانگ کر، گالوں پہ رینگتے ہوئے نیچے فرش پہ آ گرے، کس کی اولاد.....؟''

''مطلب کیا ہے تمہارا؟'' اسے اپنے کانوں پہ جیسے یقین ہی نہ آیا ہو۔

''نرس نے کیا بتایا تھا، چار ماہ کا حمل ہے، کا معلوم یہ اس منزل خان کا ہی گند.....''

''بکواس بند کرو، کمینے انسان، تم بھی جانتا

عثمان تمہارا ہی اولاد، تمہارا ہی خون، تمہارا ہی بیٹا ہے اگر تمہیں رتی برابر بھی شک ہوتا تو تم بھی اسے اپنی گود میں نہ اٹھاتا، نہ باپ کی طرح پیار کرتا۔ تم بھی جانتے ہو تم اتنے اعلا ظرف نہیں ہو کہ کسی اور کی اولاد کو برداشت کر لو۔ ہمیں معلوم ہے اچھی طرح تم نے یہ بات صرف ہمارا دل جلانے کے لیے کیا ہے۔ لیکن صرف ہمیں اذیت دینے کے لیے تم..... اور اگر تمہارے دل میں واقعی اس متعلق کوئی بال ہے تو رہے..... ہم بھی کبھی اس کو صاف کرنے کی فکر نہیں کرے گا، آخر تمہیں کس نے کہا تھا کہ ایک بیوہ عورت کی عدت خراب کرو۔ اللہ کی حد توڑو، اس کے قانون کا احترام نہ کرو۔ تم جیسوں کی بھی یہی سزا ہے، ساری عمر شک میں جیو اور شک میں مرو تم کو رحم نہیں تو، وہ بھی بے نیاز ہے۔''

''ڈھٹائی تو دیکھو، اس بے غیرت عورت کی، کیسے کسی عالمہ فاضلہ کی طرح واعظ کر رہا ہے اور اپنے کام دیکھو تو..... ویسے ڈھٹائی اور بے غیرتی تم پہ ختم ہے مرجان، اللہ، اللہ تو ایسا کر رہا ہے جیسے ابھی حج کر کے بیٹھا ہو۔ اور کام تو دیکھو اس رذیل عورت کے، جیسے خود اللہ سے غلاظت کھانے کا سند لے کر آیا ہو۔ ہمیں شرم آتا ہے خود پر کہ کبھی ہم نے تم جیسی عورت سے محبت کیا، ہمیں پچھتاوا ہوتا ہے۔''

''تمہاری شرم، تمہارا پچھتاوا..... آخر، محبت پچھتاوے میں بدل ہی گئی۔'' ایک یخ بستہ ہوا پار مرجان کی اپنی گہری سانس اس کے وجود کے ساتھ ٹکرائی۔

''تو ازالہ کرنے آئے ہو، یہ لے کر۔'' مرجان نے خلیل اللہ کے ہاتھ میں پکڑے، گولیوں سے بھرے پستول کی طرف اشارہ کیا۔''

''جو داغ تم نے لگایا ہے وہ تمہارے خون سے ہی دھوئے گا۔''

''اگر تم اپنے اطمینان کے لیے یہ کرنا چاہتا ہے تو کر لو۔'' اس نے جیسے بے فکری سے کہا۔

''اور تم کیوں اتنے اطمینان میں ہے۔'' خلیل اللہ کو اس کے طمانیت بھرے لہجے سے چڑ ہو رہی تھی۔

''ہم تمہیں مارنے آیا ہے، تمہاری جان لینے۔'' اس نے تقریباً پاگلوں کی طرح چیختے ہوئے کہا۔

''ہاں، تو لو..... کس نے روکا ہے تمہیں۔''

''ڈھیٹ عورت.....''

''تم کیا چاہتا ہے۔ ہم تمہارے سامنے گڑگڑائے، ہاتھ جوڑے، تمہارے پاؤں پکڑے، تم سے اپنی زندگی کی بھیک مانگے..... ہم یہ نہیں کر سکتا۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''مرجان نے آج تک اپنے لیے کچھ نہیں مانگا نہ اسے مانگنا آتا ہے۔ زندگی کی بھیک بھی نہیں۔''

''تو، رذیل عورت کی فحاشہ بیٹی۔''

''اگر جرم کیا ہے تو ہم مجرم ہے تمہارا۔'' وہ غصے میں غرائی۔

''دو ہمیں گالی دل کھول کے ذلیل کرو مگر، اماری ماں، کوئی گالی مت دینا۔'' اس نے خلیل اللہ کا گریبان پکڑ لیا۔

خلیل اللہ نے اسے پیچھے دھکا دیا وہ بری طرح لڑکھڑائی، گرتے، گرتے بچی۔

''جہنم میں جاؤ، تم بھی اور تمہاری ماں بھی۔'' اس نے اس کی طرف پستول سیدھا کیا..... اور پھر ٹریگر دبا دیا۔ ایک گولی مرجان کے سینے کو چیرتی ہوئی پیچھے دیوار کو جا لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا، وہ اپنے گھر کے صحن میں کھڑی ہے۔ وہی چودہ سال کی معصوم مرجان..... اسے سردی محسوس ہوئی۔ سامنے وہی انار کا بڑا درخت تھا اور جاڑے کا موسم، اس نے غور سے خزاں رسیدہ انار کے درخت کو دیکھا، نہ کوئی پتا..... نہ کوئی کلی، نہ کوئی کونپل، نہ کوئی پھل، پرندوں کا ایک غول خاموش، ٹہنیوں پہ براجمان جیسے کسی کا منتظر کہ اچانک ایک اور زوردار آواز آئی (یہ دوسری گولی تھی جو اس کے سینے میں آ لگی) اچانک، پرندوں کے غول نے درخت کو چھوڑا اور کھلی فضا میں اڑ گئے۔ آہ، سردیوں کی ڈھلتی شام کا وہ نرم سورج، جس کی لال سیاہی شفق پہ پھیلی، نیلگوں آسمان اور اس پہ سفید بادلوں کی لہروں کو اپنے رنگ میں رنگتی..... کس قدر سحر انگیز تھا وہ نظارہ، رنگ بدلتے آسمان پہ اڑتا، آزاد پرندوں کا وہ غول، کس قدر خوب صورت، کس قدر حسین، کس قدر دلفریب منظر تھا۔

☆☆

بھاگتے بھوت

احمد صغیر صدیقی

آپ نے بھوتوں سے متعلق بہت سی کہانیاں پڑھی ہوں گی مگر زیر نظر تحریر ان سب سے مختلف نوعیت کی ہے۔ ایک شخص نے اپنے آرام کے لیے ٹرالر خریدا مگر اس پر ایک عورت نے قبضہ جمالیا۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے ساتھیوں کو بھی اس ٹرالر میں بلالیا۔ وہ پانچوں بھوت کسی بھی صورت اس کا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہ تھے، آخر کار اسے ایک ترکیب سوجھ ہی گئی اور اس نے اس پر عمل کر ڈالا۔

بھوت ہمیشہ ہی خوف ناک نہیں ہوتے، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ ایک ہنسی مسکراتی تحریر۔

بے شک بہت سی باتیں بے حد عجیب ہوتی ہیں اورانہیں غیر متوقع بھی نہیں کہا جاسکتا مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ آخر میرے ہی ساتھ کیوں ہوا تھا۔

آخر میرا کیا قصور تھا جو میں اس مصیبت میں ڈالا گیا تھا۔

اوپر سے سونے پر سہاگا والی بات یہ تھی کہ میری شادی بھی ہونے والی تھی۔ میرے پاس بس ایک ہزار ڈالر کی رقم تھی، وہ میں نے ساری کی ساری اس ٹریلر کی خریداری میں لگادی تھی۔ میں اسی ٹرالر میں مونیکا کو لے کر ہنی مون منانے کے لیے امریکا کے مختلف شہروں میں جانے والا تھا۔ میں پیشے کے لحاظ سے ایک رائٹر ہوں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ کچھ دن آزادی کے ساتھ گھوم گھام کر جب لوٹوں گا تو کچھ اچھی چیزیں لکھوں گا۔

ہا...... ہاہا۔

ہوہو۔

اگر آپ کو میرا قہقہہ مصنوعی یا تلخ سا محسوس ہوا ہو تو اسے ایک قدرتی امر سمجھیں۔ یہ واقعی ایک تلخ قہقہہ ہی تھا۔

زرا سوچیے میرے یعنی میل کے، میرا نام میلون ہے مقدر میں کیا لکھا تھا۔ ایک عدد ایسے ٹریلر کا مالک بنا جو ”آسیب زدہ“ تھا۔ زرا سوچیے میرا قہقہہ اگر تلخ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟

میں نے اس سے قبل آسیب زدہ گھروں وغیرہ کی کہانیاں تو بہت سی سنی تھیں۔ مگر کسی ایسے مکان میں کسی نہ کسی طرح رہا جاسکتا ہے۔ کچھ زیادہ آدمیوں کے ساتھ یا خود کو کسی ایک آدھ کمرے تک محدود کر کے...... مگر کسی آسیب زدہ ٹریلر میں ہرگز نہیں۔ اس میں کسی قسم کی گنجائش ہی کہاں ہوتی ہے۔ خواہ ٹریلر سپر ڈی لکس قسم ہی کا کیوں نہ ہو۔ اس میں دو کے بجائے چار بستر ہوں تب بھی۔ کچن بھی ہو باتھ روم بھی ہو تب بھی۔ ریڈیو لگا ہو، بجلی ہو ایزی کرسیاں ہوں تب بھی جی ہاں کسی بھوت کے ساتھ اس میں کسی بھی طور ہرگز نہیں رہا جاسکتا۔ آپ جا ہی کہاں سکتے ہیں؟ کہیں بھی نہیں۔

بات یوں ہے کہ پچھلے ایک ہفتے سے میں نے اس قدر آسیبی قہقہے سنے ہیں کہ میرا اپنا قہقہہ بھی کسی

بھوت کا قہقہہ بن چکا ہے۔

میرے پاس بس یہی ٹریلر تھا اور اسے کھینچنے والی کار بھی، میں مونیکا کے پاس جانے والا تھا جو ہالی وڈ میں رہتی تھی۔ اپنی آنٹی کے ساتھ۔ میں ادھر ہی جا رہا تھا جب الہانی سے کوئی گیارہ میل مغرب کی دوری پر ایک آوارہ گرد بھوت نے مجھ سے لفٹ مانگی تھی۔ جی نہیں اسے اجازت کی ضرورت ہی کب تھی، وہ بس زبردستی اس میں گھس آیا تھا۔

مگر ذرا توقف کریں۔ میں ابتدا ہی سے سناتا ہوں۔ میں نے یہ ٹریلر نیو انگلینڈ کے علاقے سے خریدا تھا۔ نہایت عمدہ تھا اور دو ہزار نو سو اٹھانوے ڈالر میں کسی بھی طرح برا نہ تھا..... بس میں نے اسے اپنی کار کے پیچھے ٹانک لیا تھا اور مغرب کی طرف چل پڑا تھا۔ میں بہت خوش تھا میں اس کے لیے دو سال سے رقم پس انداز کر رہا تھا۔ میرا یہ مسئلہ عمدگی سے حل ہو گیا تھا۔ اور میں بہت مسرور تھا۔

میں اسی سرور کی کیفیت میں سفر کر رہا تھا جب میں نے دریائے ہڈسن کا پل پار کیا اس وقت اندھیرا ہو چکا تھا۔ الہانی سے گزر رہا تھا کہ بارش اور طوفان نے آ لیا۔ مگر میں نے سفر جاری رکھا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد میں نے رک جانے میں عافیت دیکھی۔ جہاں میں نے اپنی کار روکی، وہ ایک پرانا سا راستہ تھا دو چٹانوں کے درمیان تھا۔ میرا ارادہ تھا میں اس جگہ رات گزار کر صبح نکلوں گا۔

بارش تیز تھی اور بجلی کڑک رہی تھی مگر میں نے جو گوشہ منتخب کیا بہت محفوظ سا تھا۔ میں نے اپنے لیے کچھ کھانا گرم کیا۔ کافی بنائی۔ کھانا کھا کر میں نے انگڑائی لی۔ جوتے اتارے اور ایک آرام کرسی پر دھنس گیا۔ میں نے ایک سگریٹ جلائی اور کرسی سے پشت ٹکا کر کش لینے لگا۔ کاش اس وقت مونیکا بھی ساتھ ہوتی۔

میں نے سوچا تو مزا آ جاتا۔

چونکہ میں اکیلا ہی تھا۔ میں نے ایک کتاب تپائی سے اٹھالی۔ یہ کوئی دلچسپ کتاب نہ تھی۔ میرا خیال ہے اسے پڑھتے ہوئے مجھ پر اونگھ کی کیفیت طاری ہو گئی

تھی۔ ہوسکتا ہے میں سویا بھی ہوں کچھ دیر۔ مگر جب میں چونکا تو اس کا سبب باہر ہونے والے گرج چمک سے تھا۔ بجلی زور سے کڑکی تھی۔ اور اس کی وجہ سے شیلف پر رکھے چینی کے برتن کھڑکھڑا اٹھے تھے۔ میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

معاً دروازہ آواز سے کھلا اور بارش کی ایک زور دار بوچھاڑ ہوا کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ میں اس وقت یہی سمجھا تھا کہ یہ ہوا اور ابھری ہے اور پھر اسی ہوا نے دروازے کو دھڑ سے بند کر دیا۔ اس کے بعد میں نے ایک آواز سنی جو ایک بھوت کی تھی۔

میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ یہ ایک سسکی جیسی تھی۔

''خوب..... تو یہ صورت ہے۔'' اس نے کہا۔

میں دروازے کو بند کرنے کے لیے اٹھ چکا تھا۔ کتاب میرے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ میں آواز سن کر اسی جگہ منجمد سا ہو گیا۔ جو ہوا ٹریلر میں گھسی تھی اپنے ساتھ ہی باہر پھیلی کہر کو بھی اندر لے آئی تھی۔ اصولاً اسے دوسرے لمحے چھٹ جانا چاہیے تھا مگر یہ اس کے بجائے ایک جگہ جیسے جم گئی تھی اور اب یہ شکل اختیار کر رہی تھی اور ٹھوس صورت میں آ رہی تھی۔

آپ سمجھ گئے ہوں گے یہ کیا تھی۔ یہ کچھ دیر نہیں تھی بلکہ یہ ایک بھوت تھا۔ ایک آسیب جس کے پاس کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں تھا۔

اپنی جگہ ٹھہر کر اس روح نے مجھے ناپنا تولنا شروع کر دیا۔

''کھڑے کیوں ہو ڈیئر بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''اور اس طرح پلکیں مت پٹ پٹاؤ میں نروس ہو رہا ہوں۔ آج پندرہ سال بعد کسی چھت تلے آیا ہوں اور میں ذرا اس سے لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔''

''ک..... کون ہو تم؟'' میں کھلایا۔

''میں کوئی کوا نہیں ہوں۔'' اس مظہر نے کہا۔ ''لہٰذا کائیں کائیں مت کرو۔ کیا میں تمہیں دکھائی نہیں دے رہا ہوں؟''

''ت، تم..... کوئی بھوت ہو کیا؟''

''اب تم نے بات کی ہے قاعدے کی۔'' اس نے کہا۔ ''بھوت تو میں ہوں۔ البتہ میں تمہیں کس قسم کا بھوت لگ رہا ہوں؟''

اس کے سوال پر میں نے اس کا ذرا غور سے جائزہ لیا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد ہوا اندر نہیں رہی تھی لہٰذا وہ لہرا بھی نہیں رہا تھا۔ میں اسے اطمینان سے دیکھ سکتا تھا۔

وہ نا ٹے قد کا تھا۔ بدن گھٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر بھوتوں والا قدرتی لباس تھا۔ اس کے سر پر ایک پچکی ہوئی فلیٹ ہیٹ تھی۔ ٹھوڑی پر ہلکی سی داڑھی بھی تھی۔

''تم مجھے کوئی آوارہ گرد بھوت لگتے ہو۔'' جائزہ مکمل کر کے میں نے ناگواری سے کہا۔

جواب میں اس زبردستی کے مہمان نے مسکرا کر اس طرح سر ہلایا۔ جیسے میری بات کی تصدیق کر رہا ہو۔

''تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' اس نے کہا۔ ''تم مجھے اسپائک ہیگن کہہ کر پکار سکتے ہو۔ چاہو تو صرف ہیگن سے بھی کام چل سکتا ہے۔ اب اتنا لمبا نام تم بار بار نہیں لے سکو گے تاہم حادثے سے قبل مجھے سب اسپائک ہیگن ہی کہتے تھے۔''

''کون سے حادثے کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

بھوت متحرک ہوا اور ٹریلر کے ایک بنک پر چلا گیا پھر وہ اس پر بیٹھ بھی گیا۔ اس نے ایک پیر کو دوسرے پر رکھ کر قینچی سی بنائی اور انہیں ہلانے لگا اس کے پیروں میں ربر کے جوتے تھے۔ خاصے پرانے سے۔

''میں بتاتا ہوں۔'' اس نے پیر ہلاتے ہوئے کہا۔

''میں ایک ٹرک پر تھا اور سویا ہوا تھا چھت پر اور سوتے میں نیچے لڑھک گیا تھا۔ ٹھیک اسی مقام پر جہاں تمہارا یہ ٹریلر کھڑا ہے۔ تب سے میں مجبوراً یہیں پڑا ہوا تھا۔ میں کوئی بھلا آدمی نہ تھا یہ جگہ میرے لیے ایک قید خانہ بنا دی گئی تھی۔ میرے لیے کسی ایک جگہ رکنے کی سزا بہت سوچ کے دی گئی تھی کیونکہ فطرتاً میں مٹر گشتی کا عادی تھا۔ کسی ایک جگہ جم کر رہنے کی تو میں

سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اتنے برسوں میں ایک جگہ رہنے سے میری حالت ابتر ہو چکی ہے۔ مجھے اس کی اجازت بھی نہ تھی کہ میں کسی چھوٹے سے بھی گھر کو آسیب زدہ کر سکتا۔ وہاں کھلی فضا میں مجھے کار روائی کی اجازت تھی مگر یہاں بارش اور ہوا کے سوا کچھ نہ تھا۔ بس کتے تھے یا سناٹا اور پیارے جب میں نے تمہیں ادھر رکتے دیکھا تھا تو نہ پوچھو مجھے کیسی خوشی ہوئی تھی۔''

میں اس کی باتیں صبر سے سنتا رہا پھر میں نے خشک لہجے میں کہا۔

''سنو تمہیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

مظہر نے منہ کھولا اور جماہی لی۔ ''یہ تو ممکن نہیں۔ پہلے تم ادھر رکے تھے میں بعد میں آیا ہوں۔ یہ علاقہ میرے قبضے میں ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم یہاں سے نہیں جاؤ گے؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''رات بھر یہیں سر پر مسلط رہو گے؟''

''تم نے درست سمجھا پیارے۔ بالکل یہی ارادہ ہے۔'' بھوت نے دوسری جماہی لی۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''صبح تم چھ بجے مجھے جگا دینا۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور میرا مذاق اڑانے کے لیے منہ سے خراٹوں کی آوازیں نکالنے لگا۔

''خرخرخررر......''

مجھے تاؤ آ گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی کتاب اس پر کھینچ ماری۔ مگر اس سے ٹکرانے کے بعد وہ اس کے جسم سے گزرتی ہوئی ٹکر سے دوسری طرف جا گری۔

اسپائنک ہیگن نے صرف ایک آنکھ کھولی اور اسی سے اس نے میری طرف دیکھا۔

''گزر گئی نا میرے اندر سے؟'' اس نے کہا پھر آہستہ سے ہنسا۔ ''ہہ، ہاہاہا۔''

''ت، تم، تم۔'' میں بڑھتی ہوئی جھلاہٹ سے بولا۔ اور نزدیک رکھے کشن کو اٹھا کر اس کی سمت پھینکا۔ اس کا حشر بھی کتاب جیسا ہوا۔ وہ بھی اس کے بدن سے گزرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا تھا۔

اسپائنک ہیگن نے اپنی دوسری آنکھ بھی کھول دی اور طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ اسے میں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اس کا بدن ٹھوس نہیں تھا کہ اس پر کوئی ضرب لگ سکتی۔ میں نے سوچا اور اپنے غصے کو چھپا لیا۔

''سنو۔'' میں نے چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لہجہ نرم کر لیا۔

''کیا بتایا تھا تم نے؟ ہمیں اس جگہ رکنے کا پابند بنا کر سزا دی گئی ہے؟ یعنی تم مجبور ہو ادھر پڑے رہنے کے لیے؟ کہیں نہیں جا سکتے۔''

وہ خاصا کائیاں بھوت تھا بولا۔ ''تم اس چکر میں مت پڑو۔'' اس کے لہجے میں شرارت بھری ہوئی تھی۔

میں نے اپنی برساتی (رین کوٹ) اٹھائی سر پر سیٹ جمائی دروازہ کھولا اور بارش میں باہر اتر گیا۔ اگر اس دوزخی پر یہاں رکے رہنے کی پابندی تھی تو ہوگی مجھ پر تو نہ تھی۔ میں ٹریلر سے اتر کر اس کے آگے جتی کار میں جا گھسا۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ انجن اسٹارٹ کیا۔ بارش میں کار کا سفر آسان نہیں تھا۔ پہیوں تلے کیچڑ آ رہی تھی مگر میرا دماغ غصے سے تپ رہا تھا میں نے پروا نہ کی اور چلتا رہا۔ میں کوئی بیس میل تک گیا۔ پھر میں نے اپنا ٹریلر ایک جگہ پارک کر دیا۔ یہ ایک غیر استعمال شدہ روڈ تھی۔ اس کے بعد میں مسکرایا۔

''اب اس کو پتا چلے گا کہ میں نے اس کے پیروں تلے سے زمین نکال دی ہے۔ اب اس کی سمجھ میں آ جائے گا کہ کس سے اس نے پنگا لیا تھا۔ پھر میں اسی طرح مسکراتا ہوا کار سے اترا اور ٹریلر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر پہنچ کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔

ہا۔

ہاہا۔

ہاہا، ہاہا۔

یہ میرا قہقہہ تھا۔ وہ بھوت اسپائنک ہیگن اطمینان

Pakistanipoint.com

سے بنک پر پڑا سو رہا تھا۔ اس کے منہ سے سچ مچ کے ہلکے ہلکے خراٹے نکل رہے تھے۔

خر، خر، خرر، خرر۔

میں نے اسے دیکھ کر بلند آواز سے لعنت بھیجی۔

وہ ایک دم سے ہڑبڑایا اور آنکھیں کھولیں مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور بولا۔

''ہیلو تفریح کیسی رہی؟''

تفریح..... میرا دماغ سنسنانے لگا۔

''تو کیا تم نے جھوٹ بولا تھا کہ تم اس جگہ سے نہیں ہٹ سکتے؟'' بھوت نے بھاڑ سا منہ کھول کر جماہی لی۔

''تم غلط سمجھے پیارے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے یہ تو کہا ہی نہیں تھا کہ میں نکل ہی نہیں سکتا۔ بے شک پابندی والی بات کہی تھی کہ میں کسی اور جگہ نہ چلوں۔ میں اپنے آپ سے تو وہاں سے آیا نہیں یہ تو تمہاری حرکت ہے۔ اس کے ذمہ دار تم ہو۔ میرا ہاتھ صاف ہے اور..... تمہاری وجہ سے میرا مسئلہ ہو گیا ہے۔ مجھے اس جگہ سے نجات مل گئی ہے۔

''کیا مطلب؟'' میں نے ٹپٹا کر پوچھا۔

''مطلب صاف ہے۔ میں اب جدھر چاہے جا سکتا ہوں۔ میں تمہارا احسان مند ہو۔ مہربانی کے لیے بہت شکریہ۔''

''اس کا مطلب ہے کہ..... یعنی۔'' میں کراہا۔

''ہاں اس کا مطلب یہی ہے۔ میں نے طے کیا ہے کہ سفر کے خاتمے تک میں اب تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔''

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں چیخا۔ ''بھوت کسی زندہ آدمی کے ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔ وہ تو ویرانوں میں رہتے ہیں۔ یا پرانے مکانوں وغیرہ میں۔''

وہ میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرے پیارے دوست۔ تمہاری معلومات بھوتوں کے بارے میں خاصی کم لگتی ہیں۔ تمہیں کچھ پتا نہیں بھوتوں کی متعدد قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً کچھ بھوت کہیں جم کر نہیں رہتے۔ یہ آوارہ گرد قسم کے بھوت ہوتے ہیں۔ میں انہی میں سے ہوں اور یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم نے میرا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ تمہارے ساتھ رہ کر میں کسی چھت تلے بھی رہ سکتا ہوں اور گھوم گھام بھی سکتا ہوں۔ تمہارا ٹرالر میرے مسئلے کا عمدہ حل ہے۔ ہمارے لوگوں کے بہترین دماغ بھی اس تک نہیں پہنچتے تھے۔ واقعی ہمارے مطلب کے لیے یہ ٹرالرز بہترین کہے جا سکتے ہیں۔ آسیبی ٹرالرز۔ واہ، یقین کرو جب انہیں اس کا علم ہوگا تو وہ تمہاری قبر پر ایک شاندار مقبرہ تعمیر کر دیں گے۔''

وہ دونوں کہنیوں پر سر کر یہ تقریر دل پذیر کر رہا تھا اور اس کا ہر لفظ میرے دماغ میں آگ لگائے جا رہا تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ پھر لیٹ گیا اور بولا۔

''اچھا پیارے۔ اب میں ذرا تھوڑی دیر کے لیے حالت جذب میں جا رہا ہوں۔ صبح تم سے ملاقات ہوگی۔''

''حالت جذب؟ یہ کیا ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ مگر بیگن کا نظر آتا ہوا ہیولا تیزی سے گھل رہا تھا۔

''میں پھر سے روح بننے جا رہا ہوں۔'' اس کی آواز سنائی دی جو لحہ بہ لحہ آہستہ ہو رہی تھی۔ اور پھر..... وہ ایک دم سے میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے رین کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا۔ کپڑے تبدیل کیے اور بنک پر گر کر زمین پر پڑی ہوئی کتاب اور کشن پر نگاہ ڈالی اور سوچا شاید یہ کوئی خواب تھا۔ شاید خواب ہی میں، میں نے ڈرائیونگ بھی کی تھی۔

صبح کو میں ذرا تاخیر سے اٹھا۔ جاگتے ہوئے مجھے وحشت ہوئی تھی میں نے جلدی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ٹرالر خالی تھا۔ مجھے خوشی ہوئی۔ سیٹی بجاتے ہوئے میں نے غسل کیا۔ ناشتا نکالا اور پیٹ بھرنے کے بعد میں نے دوبارہ اپنا سفر شروع کر دیا۔

یہ ایک اچھا سا دن تھا۔ بارش پیچھے رہ گئی تھی اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ چڑیاں آ رہی تھیں، میں نے گاڑی چلاتے ہوئے مونیکا کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب صرف ہفتے بھر کی بات تھی۔ میں

مونیکا کے گھر پہنچنے والا تھا۔ میں نے تصور میں خود کو اپنا ٹرالر اس کے گھر کے سامنے پارک کرتے دیکھا......
اور ہارن بجاتے سنا۔
میں اسی قسم کی سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے ہوا کا کوئی برفیلا سا جھونکا آہستہ سے میری گدی کے ساتھ مس ہوا ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سامنے سے آنے والی گاڑی سے میری ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ کیونکہ اچانک ہی میرے پہلو والی سیٹ پر کوئی کہر یلی شبیہ آ بیٹھی تھی۔
''یار ٹریلر میں تنہا بیٹھے بیٹھے میں بور ہو رہا تھا۔''
معاً میرے کانوں میں اسی منحوس اسپائک ہیگن کی منمناہٹ سنائی دی۔
''ت، تو، تم، تم۔'' غصے سے میرے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکل سکے۔ اسٹیرنگ پر میرا ہاتھ پھیلا اور میری کار بری طرح لہرائی۔ مگر اس موقع پر ہیگن نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اسے قابو میں کر لیا۔ اور بولا۔
''اے حواس میں رہو۔ ہم پہلے ہی تعداد میں کم نہیں تم بھی آ گئے تو تعداد اور بڑھ جائے گی۔''
میں چپ ہو کر غصہ چبانے لگا۔ میں سوچ رہا تھا گویا یہ خواب والی بات غلط تھی۔ یہ سچ مچ میرے اوپر مسلط ہو چکا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس دوزخی سے کس طرح نجات مل سکتی ہے۔
اسپائک ہیگن نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔
''کس سوچ میں چلے گئے پیارے؟'' اس نے کہا۔
''دیکھو میں تمہیں بتاتا ہوں۔ میں خالصتاً منطقی چیز ہوں۔ تم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ پرانی حویلیوں مکانوں اور ویرانوں میں ہمارے قوم ڈیرے ڈالے رکھتی ہے تو پھر......تمہارے اس ٹریلر میں کون سی بات ہے جو میں اس میں نہیں رہ سکتا؟ یہ بھی آسیب زدہ ہو سکتا ہے کہ نہیں ہو سکتا؟''
''تو پھر کشتیاں آسیب زدہ کیوں نہیں ملتیں۔ ٹرک آسیب زدہ کیوں نہیں ہوتے؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔
''ہیں وہ بھی آسیب زدہ ہیں۔'' اسپائک ہیگن نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ ''اب مجھے تمہیں ان کی کہانیاں بھی سنانی پڑیں گی۔ یو کیسی کے علاقے میں جاؤ تو تمہیں وہاں ایک کشتی کے بارے میں سننے کو مل سکتا ہے جو طوفانی راتوں میں انہیں دکھائی دیتی رہتی ہے۔ یہ ایک آسیبی کشتی ہے۔ اسی طرح اٹچیسن کے علاقے میں ایک پرائیویٹ ٹرین ہے۔ اس پر بھی ایک بھوت کا قبضہ ہے۔ یہ بھوت ٹرینوں پر سے چھلانگ لگایا کرتا تھا۔ مرنے کے بعد بھی یہ ایک ٹرین ہی میں رہ رہا ہے۔ اور۔'' وہ بولے جا رہا تھا۔ ''نیویارک سنٹرل کے علاقے میں ایک ٹرک بھی ہے اس طرح کا۔ اس پر ایک نہیں دو تین بھوت قبضہ جمائے ہوئے ہیں ارے میاں تم بے خبر آدمی ہو میں تمہیں کہاں تک......''
''اچھا بس۔'' میں چیخ کر بولا۔
وہ میری جھلاہٹ پر مسکرایا۔ ''یار میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''
میں نے کار کی رفتار بڑھا دی۔ میرا دماغ سنسنا رہا تھا۔ میں کیلی فورنیا پہنچنے سے پہلے پہلے اس منحوس سے پیچھا چھڑا لینا چاہتا تھا۔
''اے......'' معاً میرے پہلو کی کہر یلی شبیہ چیخی۔
''رک جاؤ۔''
ہم اس وقت ایک ایسی سڑک پر تھے جو دور تک خالی تھی۔ اس کے دونوں طرف سائپرس کے درخت لگے ہوئے تھے۔ اور ان کے تلے جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں ہیگن نامی بھوت نے پھر خود ہی ہاتھ بڑھا انجن بند کر دیا۔ پھر اس نے ایمرجنسی بریک بھی کھینچ لی۔ بس ذرا سی تاخیر اگر اور ہوتی تو میری کار سیدھے ایک گڑھے میں گرنے والی تھی۔
''تم نے ابھی مجھے مار ہی ڈالا تھا'' میں نے مشتعل ہو کر اسے دیکھا۔ ''اور یہ تم کیا کر رہے ہو؟''
''چپ رہو۔'' ہیگن نے مجھے ڈانٹا۔ ''مجھے اپنا ایک پرانا ساتھی نظر آیا ہے۔ سولہ سال پہلے ہم دونوں

Pakistanipoint.com

نے مل کر ایک بینک کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ یہ رقم ایک ٹرین میں جا رہی تھی۔ اس کے بعد سے آج میں نے اسے دیکھا ہے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ ہی لے چلنا چاہتا ہوں۔"

"ک ...... کیا مطلب؟" میں حلق پھاڑ کر چیخا۔ "تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ میرا ٹریلر تمہارے باپ کی جاگیر نہیں ہے۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے مگر۔" ہیگن نے برا مانے بغیر اطمینان سے کہا۔ "مگر میں اس ٹریلر کا قابض بھوت ہوں۔ یہاں میں اپنی مرضی چلا سکتا ہوں پیارے۔" پھر وہ کھڑکی سے سر نکال کر زور سے چیخا۔ "سیلری اے سیلری ادھر آ جاؤ۔"

اس کی انگلیوں نے جو کہر سے بنی ہوئی تھیں۔ اشارہ دیا۔

چند لمحوں بعد میں نے محسوس کیا کہ کہر کا ایک ٹکڑا کھڑکی سے اندر گھس رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے میرے پہلو کی سیٹ پر ایک نہیں دو دو بھوت چمٹے ہوئے بیٹھے نظر آئے۔

یہ نیا بھوت، دبلا پتلا تھا اور خاصہ لانبے قد کا تھا۔ الٹے سیدھے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس کی صورت پر پھٹکار برس رہی تھی۔

"اسپائنک ارے یہ تم ہو؟" نئے بھوت نے بھرآئی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔ "کیا حال ہیں؟ کیا کرتے ہیں اور یہ کون ہے؟ اس نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اسے چھوڑو۔" اسپائنک نے کہا۔ "میں اس کے ٹریلر کا آسیب ہوں۔ کچھ معلوم ہمارے پرانے گینگ کا کیا بنا؟"

"سب تتر بتر ہیں۔" سیلری نامی نے خبیث نے مردہ لہجے میں کہا۔ "منیسٹر وتو ادھر کہیں آس ہی پاس ہے۔ پٹی اور بنی ٹولیڈو کے علاقے میں کسی جنگل میں ہیں۔ میں انہی کے پاس جانے کی سوچ رہا تھا۔ مگر رات کے طوفان کی وجہ سے نہیں گیا تھا۔"

"چلو مل ہی جائیں گے سب کسی دن۔" ہیگن کے بھوت نے کہا۔ پھر اپنے ساتھی سے بولا۔ "آ، پیچھے ٹریلر میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" پھر وہ دونوں ملے۔ ہیگن نے کہا۔ "اچھا پیارے۔ اب تم آگے چلو یار کو تمہاری مرضی۔"

وہ دونوں بھوتنے کھڑکی سے باہر چلے گئے۔ میں نے انہیں کینہ توز نظروں سے غائب ہو دیکھا۔ مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا۔

میں نے کار چلا دی اور کوئی گھنٹہ بھر چلتا رہا۔ ٹولیڈو کے علاقے سے گزرا۔ پھر ایک کیمپل پاس رک گیا۔ جو سڑک کے کنارے لگا ہوا تھا۔ میں نے کار پارکنگ میں روکی اور کار کو ایک طرف کھڑا کر دیا۔

جب میں ٹریلر میں واپس ہوا تو میں نے دونوں بھوتوں، ہیگن اور پنک سیلری کو موجود نہ پایا میرے ڈنر کھانے تک وہ دکھائی نہیں دیے میں نے برتن صاف کیے اور لیٹ گیا۔ دعا مانگتے ہوئے کہ ان دونوں بھوتوں سے خدا مجھے کسی طرح نجات دے۔ میں مونیکا کے خواب دیکھتے ہوئے سو گیا۔

جب میں جاگا تو مجھے اپنے چاروں طرف تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اس موقع کے ساتھ کہ مجھے اچھی چیز دیکھنے کو ہرگز نہیں ملے گی۔ میں نے دیکھا کہ ہیگن واپس آ گیا ہے۔

خرر، خرر۔

وہ میرے مقابل والے بنک پر لیٹا ہوا خراٹے بھر رہا تھا۔ میرے اوپر جو بنک تھا اس پر وہ دوسرا خبیث پڑا ہوا تھا۔

اور میرا دل بری طرح دھڑکا ٹریلر کی چیئر بھی بھری ہوئی تھی اس پر ایک اور کریلا ہیولا دراز تھا۔ یہ نیک بخت کسی گول گپے کی طرح تھا۔ گھنی مونچھیں تھیں اور صورت ہی سے یہ بھی بے خانماں اور آوارہ لگتا تھا۔ اس کے بعد تو جیسے میرا دماغ کی الٹ کر رہ گیا۔

ایک اور بھوت ٹریلر کے فرش پر پڑا ہوا تھا اور ایک تیسرے بنک کے اوپر والے بنک پر تھا۔ اس کا کہر جیسا ہاتھ میرے منہ سے بالشت بھر فاصلے پر ہوا تھا۔ یہ سب کے سب منحوس آوارہ گرد قبیلے

تھے۔

پانچ بھوت۔

میرے خدامیں کپکپایا۔

پانچ بدروحیں میرے قیمتی ٹریلر پر قابض ہو چکی یں۔ وہاں ہر طرف سگریٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ یرے لکھنے کی میز کا میز پوش جلا ہوا تھا۔ ایش ٹرے ٹوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں اور اس قدر بو تھی کہ انس لینا مشکل ہو رہا تھا۔

اب میں پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ ہوا کیا تھا۔ یلری اور ہیگن کو اس کے دوسرے ساتھی بھی مل گئے تھے۔ غالباً ٹولیڈو سے۔ پھر یہ انہیں بھی ادھر لے ئے تھے۔ یعنی میرے ٹریلر میں۔ میں غصے سے ھنکنے لگا۔ مگر سب اشتعال فضول تھا۔ میرے بس میں کچھ تھا ہی کب؟ حد تو یہ ہے کہ میں انہیں چھو بھی نہیں تا تھا وہ ٹھوس ہی کب تھے۔

ہاں بس ایک خبر بس میں تھی۔ یہی کہ چپ اپ گردن ڈال دوں اور یہاں سے چلا جاؤں۔ مگر یہ بھی ممکن نہ تھا۔ مجھے مونیکا کے پاس پہنچنا تھا اور شادی کر کے ہنی مون کے لیے نکلنا تھا۔

میں نے کچھ دیر اسی حالت میں رہتے ہوئے وچا پھر فیصلہ کیا اٹھا کپڑے بدلے باہر آیا۔ ٹریلر کو یں نے مقفل کیا اور کیمپ والے کی طرف چل دیا۔ وہ تو معقول صورت کا مگر پتا چلا کہ اندر سے خاصا ت گیر ہے۔ میرا ارادہ تھا ٹریلر اس کے سپرد کر کے س سے کچھ رقم ادھار لے لوں گا مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔

”کیوں مسٹر کیا رات ٹریلر میں کوئی جشن منا رہے تھے؟ آدھی رات تک اندر روشنی رہی تھی۔ گانے بجانے کی آوازیں بھی سنی تھیں میں نے۔ آواز تیز نہ تھی ورنہ میں تمہیں آ کر ضرور ٹوکتا۔“

میں نے اپنے دانت کٹکٹائے۔ پھر مسمسی سی صورت بنائی۔ اور بولا۔ ”ارے نہیں میں اندر اکیلا ہی تھا۔ وہ ریڈیو تھا۔ نیند نہیں آ رہی تھی مجھے۔ یہ بالکل نیا ٹریلر ہے۔ پورے دو ہزار نو سو اٹھانوے ڈالر کا میرے پاس خریداری کے جملہ کاغذات ہیں میں دراصل اسے گروی رکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں ٹریلر میں مجھے نیند نہیں آ رہی ہے کیا خیال ہے تمہارا چاہو تو گروی رکھ کر کچھ رقم دے دو یا پھر خریدنا چاہو تو ضرور خرید سکتے ہو صرف تین دن پرانا ہے یہ میں تمہیں اصل سے دو سو کم میں دے دوں گا۔“

اس نے کچھ بحث کی پھر سودا تیرہ سو پر طے ہو گیا۔ میں تو مجبور تھا۔ میں نے رقم کی رسید کاٹ دی۔ میں نے اس کے ٹریلر سے اپنی کار الگ کی اور وہاں سے تیزی سے بھاگ لیا۔

سڑک کے موڑ تک مجھے کوئی ایسا اشارہ نہیں ملا کہ میری حرکت کا علم ہیگن کو ہو چکا ہے۔

ٹھیک ہے اب یہ سارے صورت حرام جب جاگیں گے تب انہیں پتا چلے گا۔ میں تب تک دور ہو چکا ہوں گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا ان خبیثوں سے نجات مل گئی تھی۔

ہاہا۔

ہاہاہا۔

میں سوچ رہا تھا اور ہنس رہا تھا۔

سہ پہر ہونے تک میں ایلی نوائز پہنچ چکا تھا۔ یہ ایک کھلا علاقہ تھا۔ میں نے ریڈیو چلا دیا۔ فوراً ہی ایک نشریہ سننے کو ملا۔ یہ ایک پولیس نشریہ تھا۔

انڈیانا اور ایلی نوئس کی پولیس متوجہ ہو۔

ٹولیڈو کے ایک پارکنگ کیمپ سے ایک بناڈی لکس موڈیل کا لگژری ٹرالر چرا لیا گیا ہے۔ خیال ہے کہ چور اسے مغربی حصے کی طرف لے گئے ہیں۔

میں نے تھوک نگلا۔ میرے خدا۔ یہ تو شاید میرے ٹرالر کے بارے میں لگتا ہے۔ میں نے فوراً عقبی شیشوں کی طرف دیکھا۔ وہاں دور تک عقب میں روڈ خالی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ مگر میری آدھی سانس اندر ہی رہ گئی۔ موڑ پر کسی ٹرالر کی صورت ابھری تھی۔ عقبی شیشے میں اسے میں صرف دیکھ رہا تھا۔

اور یہ ٹریلر طوفانی رفتار سے ادھر چلا آ رہا تھا۔

Pakistanipoint.com

ٹریلر۔

ہا۔

ہاہاہا۔

اور پھر فوراً ہی وہ میرے نزدیک پہنچ گیا۔ یہ میرا ہی ٹریلر تھا۔ اور بغیر کسی کار کے آپ ہی آپ عقب میں چلا آرہا تھا۔

میرے رنگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں نے عجلت سے ایکسلریٹر پر دباؤ ڈالا اور اپنی کار کو طوفانی رفتار سے بھگایا۔ میں نے اس کی رفتار بڑھانی شروع کی ساٹھ ستر.....اسی.....ٹریلر بدستور میرے پیچھے لپکا چلا آرہا تھا۔

اسی لمحے مجھے کسی طرف سے ایک پولیس بائیک لپکتی دکھائی دی۔

پولیس والے نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آپ سے آپ چلنے والے ٹریلر کو دیکھا میری کار اس سے پچاس گز آگے ہوگی بس پولیس والے نے دوسرے لمحے اپنی موٹر سائیکل بڑھائی اور اس کے پاؤں پر ہاتھ مارا۔ پھر وہ ہم دونوں کے پیچھے لپکا۔

حالانکہ میں اپنی سی کر رہا تھا مگر دوڑتے ہوئے ٹریلر نے بالآخر مجھے پکڑ ہی لیا۔ پھر اس کے اگلے آنکڑے میری کار کے عقبی حصے سے آپ سے آپ جڑ گئے۔ میں نے کھٹاکوں کی آواز سنی اور میری رفتار سست ہوگئی۔

پولیس والا عقب میں لگا ہوا تھا۔ اس نے سائرن کو کھول دیا تھا اور فضا اس سے لرز رہی تھی۔ مجھے اس کی بہرحال فکر نہ تھی۔ وہ ہیگن کا بچہ میری برابر کی سیٹ پر شکل ابھار رہا تھا۔

''ہنہ۔'' وہ پھنکارا۔

''ہنہ۔''

اس نے کہا۔ ''تم نے ہیگن کو جکڑ دیا ہے بیٹھو۔ اب میں تمہیں سبق سکھاؤں گا۔ یہ پولیس والا پکا سور نظر آتا ہے۔ دیکھتا ہوں تم اس سے کس طرح گلو خلاصی حاصل کرتے ہو۔''

''پروانہ کرو۔'' غصے سے میری حس مزاح پھڑک اٹھی تھی۔ میں نے کہا۔ ''وہ مجھے پکڑ لے گا نا اور یہ ٹریلر سرکاری گیرج میں داخل ہوجائے گا۔ بس بیٹے تم دیکھنا اسی میں اور دیکھنا کتنا مزا آتا ہے۔ وہاں۔''

میری بات سن کر ہیگن کا چہرہ ایک دم سے لٹک گیا۔ شاید مجھے سبق سکھانے کی خوشی میں اسے یہ پہلو دکھائی نہیں دیا تھا۔

میں نے مزید نمک پاشی کی۔ ''مجھے پولیس والوں کا کچھ تجربہ ہے۔ تمہاری مٹی نہ پلید کردیں یہ تو میرا نام نہیں۔''

ہیگن نے منہ سکوڑا اور سیٹی بجائی۔ پھر میری کار میں کھسر پھسر ہونے لگی۔ سو اس کے بقیہ چاروں ساتھی سیٹی سن کر کار کے قریب آگئے تھے۔

پولیس والا اب میری کھڑکی کے متوازی پہنچ گیا تھا اور اس کی گاڑی ساتھ ہی دوڑ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' بالآخر ہیگن نے کہا۔ ''میں اور سیلری کار کو لے چلتے ہیں۔ تم تینوں ٹریلر کو لانا اور پھر۔''

ہماری گاڑیوں کی رفتار ایک دم سے بڑھ گئی۔ وہ تو جیسے اڑ رہی تھیں۔ بھوت ٹریلر میں جتے ہوئے اسے اڑا رہے تھے اور دو بھوت میری کار کو کھینچ رہے تھے۔

ہماری رفتار بڑھتے دیکھ کر پولیس والے نے پستول نکال لیا۔ اس نے میری طرف فائر جھونکا گولی بمپر سے ٹکرائی۔

رفتار کی سوئی اب نوے کراس کر رہی تھی۔ میری سانسیں گھٹ رہی تھیں۔ میں سامنے روڈ کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے سامنے مجھے ایک موڑ نظر آرہا تھا۔ اور ادھر سے ایک جیپ نکلی تھی۔ پتا نہیں اب کیا ہونے والا تھا۔

میں تو منجمد سا ہوگیا تھا۔

اور ایک چیخ میرے گلے میں پھنسی ہوئی تھی۔ کیونکہ مجھے دریا بھی دکھائی دے رہا تھا اور اس پر بنی پلیا بھی۔

موڑ آنا فانا ہی سر پہ آ گیا میرے پیر غیر ارادی طور پر بریک پر گئے اور میں نے عقب سے وہیل گھمایا۔ میری کار کا جنگلے سے ٹکرائی ہیگن کے منہ سے زوردار آواز نکلی۔

یہ کوئی نعرہ تھا۔

اے، اواپ۔

اصولاً کار کو جنگلے سے ادھر دریا میں جا گرنا چاہیے تھا مگر وہ گری نہیں۔ بلکہ وہ پلیا پر اڑتے ہوئے دوسری طرف جا ٹکی تھی۔ یہ بڑی زبردست قسم کی زقند تھی۔ بے چارے پولیس والے نے شاید ہی ایسا منظر کبھی دیکھا ہوگا۔ یہ پرواز تھی پرواز۔

اب ہم دریا کے ادھر والی روڈ پر تھے۔ دریا ہمارے عقب میں رہ گیا تھا۔ سامنے شہر پھیلا ہوا تھا۔ ہم جس روڈ پر جا رہے تھے اس کے دونوں طرف درخت لگے ہوئے تھے۔ ایسی جھنڈ میں ایک متروک ریلوے لائن بھی لیٹی ہوئی تھی۔

پھر کار ایک جگہ رک گئی۔

سیلری اور ہیگن نے بمپر کو تھام رکھا تھا۔ کار رکی تو پہلے تو ہیگن وہاں سے ہاتھ جھاڑتا ہوا دانت نکالے میری طرف بڑھا پھر بولا۔ ''اب کہو پیارے۔ کیسی رہی دیکھا تم نے ہمارا کارنامہ؟''

میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا اور سر ہلایا۔ ''واقعی تم لوگوں نے تو کمال ہی کر دیا۔''

''ارے یہ کمال کچھ نہیں۔'' ہیگن نے کہا۔ ''ہم بھوت ہیں بھوت اور وہ بھی چھٹے ہوئے۔ اچھا خیر چھوڑو چلو میرے ساتھیوں سے ملو، اس نے مڑ کر دیکھا جہاں اس کے سب دوست جمع تھے۔ ''یہ میل ہے اور بدل یہ ہے بنی اور یہ اور یہ پیٹی ہے۔''

وہ تینوں بھوتنے جن میں ایک گول مٹول سا تھا اور ایک ٹنگڑا اور لحیم شحیم تیسرا خاصا مرجھلا سا تھا۔ یہ سب ٹریلر کی طرف سے آئے تھے اور اپنے ہاتھ جھاڑ رہے تھے۔

ہیگن نے تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ''ادھر جنگلوں کے اندر سے ایک روڈ نکلتی ہے۔ ہم اس پر سفر کریں گے۔ اب رات ہو رہی ہے۔ یہاں رکنا ٹھیک نہیں مجھے معلوم ہے وہ کم بخت۔''

ڈان بریسر اس طرف کا انچارج ہے۔ اول درجے کا فطین آدمی ہے۔ ہمارا رہنا حرام کر دے گا۔

''کون..... کلون؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''کیا نام لیا؟''

میں نے کار اسٹارٹ کر دی تھی۔

''ریلوے پولیس سے تعلق رکھتا ہے، آفیسر ہے۔ ڈان بریسر نام ہے۔'' ہیگن نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''بہت چالاک آدمی ہے۔ ہم نے آج تک ایسا دشمن نہیں دیکھا۔ جان کو اٹک جاتا ہے سالا۔''

مجھے ہیگن سے جان چھڑانے کی امید بندھی۔

اسی درمیان ٹرنامی بھوتنے نے کہا۔ ''یار ہیگن تم اس سے خوامخواہ ڈرتے ہو۔ میں تو نہیں ڈرتا۔''

یہ ان سب سے تنومند تھا۔ البتہ یہ شخص میرے لیے پریشانی کا باعث ضرور رہا ہے۔'' اس نے ایک جملے کا اضافہ کیا۔

''ہم سب اس سے نالاں ہیں۔'' سیلری نے کہا۔

''مگر میں نے تو سنا ہے وہ اب ریٹائر ہو چکا ہے اور شاید بیمار شیمار بھی ہے۔'' ایک اور بولا۔

''مر رہا ہوگا۔'' سیلری نے کہا۔

''کیا..... مر رہا ہے؟'' ہیگن نے اس طرح اپنے ساتھی کو دیکھا جیسے یہ خبر اس کے لیے دل خوش کن نہ تھی اس کے لہجے میں تشویش در آئی تھی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔

''تم ڈان بریسر کو گم کرو اور اپنا کام کرو۔'' ٹھہر کر وہ دوبارہ بولا۔ ''ویسے یہ پولیس والا کچھ نہیں کہے گا۔ تم مطمئن رہو۔ اگر اس نے کسی کو بتایا کہ اس نے ایک کار اور ایک ٹریلر کو ہوا میں پرواز کر کے دریا پار اترتے دیکھا ہے تو اسی دن اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔ تم بے فکر ہو کر کار چلاؤ۔'' اس کا اشارہ اس پٹرولنگ آفیسر کی طرف تھا جو ہمارے تعاقب میں چلا

تھا۔

ہیگن چالاک بھوت تھا اس کا انداز اغلط نہ تھا۔ جب ہم ذیلی سڑک سے اصل سڑک پر آئے تو ہمیں اپنے تعاقب میں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ میں نے کار کا رخ پھر مغرب کی سمت کر دیا۔ ہیگن اپنے ساتھیوں کے ساتھ ٹریلر میں چلا گیا۔ وہاں اب وہ خرمستیوں میں لگ گئے تھے اور سگریٹیں پھونک رہے تھے۔

جیسے جیسے مونیکا کا گھر قریب ہو رہا تھا میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی پھر وقت مقررہ سے کچھ تاخیر بھی ہونے کا امکان تھا کیونکہ اس ہیگن نامی بھوتنے کو گرینڈ کے ساتھ دیکھنے کا شوق ہوا تھا اور ہم ادھر ادھر ہوتے ہوئے چل رہے تھے۔ میں ہیگن سے چھٹکارے کی کوئی تدبیر سوچ نہیں پا رہا تھا اور یہ ٹریلر بھی میرے ہی سر منڈھا ہوا تھا۔

ویسے ایک بات ضرور تھی۔

کار سے جڑا ہوا ٹریلر اتنا برا ہرگز نہیں ہوتا۔ جتنا کہ وہ ٹریلر جو کار سے منسلک بھی نہ ہو اور اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا ہو۔

میرا مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں ان بھوتوں میں پھنسا رہا تو پھر شادی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ہنی مون پر بھی جانے کی بات مہمل سی تھی۔ مگر میں ان کی وجہ سے مونیکا سے تو دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔

جس وقت میں کیلی فورنیا کی پہاڑیوں میں چل رہا تھا میں نے طے کیا کہ اب کچھ نہ کچھ کر ہی گزروں میں ان بھوتوں کا ویسے میرے ساتھ مجموعی رویہ بہت دوستانہ بلکہ برادرانہ سا تھا۔ ہوشیار تھے اور خوب سمجھ رہے تھے کہ میں خوش نہیں ہوں۔ مگر یہ بھی جانتے تھے کہ میرے پاس بہ ظاہر ان کے خلاف کارروائی کی کوئی قوت نہیں۔

سہ پہر کے وقت ہی میری کار کیلی فورنیا میں داخل ہوگئی ہم اب ہالی وڈ کے علاقے میں تھے۔ میرے چہرے پر وحشت نے برسنا شروع کر دیا تھا۔ شیو بڑھا ہوا تھا میرا۔ میں نے کار ایک کیمپ پر پارک کی وہاں نہایا دھویا۔ کپڑے بدلے اور سوچتا رہا مونیکا سے مل کر اسے کیا بتاؤں گا۔ مقررہ تاریخ گزر چکی تھی۔ مگر مجھے اس سے ملنا تو تھا ہی۔

میں نے کیمپ آفس میں ایک فون دیکھا۔ میں وہاں گیا۔ میں نے وہاں سے ایڈا بریسر کا نمبر نکالا جو مونیکا کی آنٹی تھی اور پھر میں نے فون گھمایا۔

جواب میں مجھے مونیکا ہی کی آواز سنائی دی۔ وہ مردہ سی آواز تھی۔

''اے میل تم؟'' میری آواز سن کر وہ چیخی۔ ''تم ہو کہاں؟ میں انتظار کر کر کے سڑ گئی ہوں۔''

''سوری۔'' میں نے کہا۔ ''مونیکا میں اب کیا بتاؤں یہ معاملہ بھوتوں کا ہے۔

''کیا؟ کیا کہا؟''

''وہی جو تم نے سنا۔ معاملہ بھوتوں کا ہے۔ آ کر تفصیل بتاؤں گا۔''

''بھوتوں کا معاملہ؟'' ادھر سے مونیکا کی پرتجسس آواز ابھری پھر اس نے عجلت سے کہا۔ ''خیر چھوڑو۔ تم فوراً پہنچو میرے انکل بہت بیمار ہیں۔ شاید ہی بچ سکیں۔ تم فوراً آؤ۔

''کون..... انکل؟''

''ارے میرے انکل اور کون، انکل ڈان۔''

''تمہارا مطلب ہے تمہاری آنٹی کے بھائی؟''

''ہاں ہاں وہی۔ وہ یہیں ہمارے ساتھ ہیں۔'' مونیکا نے کہا۔ ''کئی ماہ سے بیمار ہیں۔ ڈاکٹروں نے تقریباً مایوسی ظاہر کر دی ہے۔''

''اچھا..... گویا وہ قریب المرگ ہیں۔ اوہ۔''

میرے ذہن میں اس لمحے ایک کلک سی ہوئی تھی۔ ایک بات یاد آ گئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ میں ناچنا شروع کر دوں۔

''آ رہا ہوں میں، آ رہا ہوں۔'' میں چیخا۔

فون بند کر کے میں نے سیٹی بجائی۔ پلٹ کر میں نے اپنی کار ٹریلر سے جدا کی۔ ہیگن کا بھوت مجھے بھویں سکوڑے اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے میرے دماغ میں گھس جانا چاہتا ہو۔

''ذرا ایک کام سے جا رہا ہوں۔ جلد واپس آجاؤں گا۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

''دیکھو آنا ضرور۔'' اس نے پرشبہ نظروں سے گھورتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''ہم رات میں فلم اسٹاروں کے درشن کا اشارہ رکھتے ہیں۔''

''دس منٹ بعد۔''

مونیکا میرے لیے گھر کا دروازہ کھول رہی تھی۔ وہی سرو قامت مونیکا۔ ہاں وہ محبوبہ دل نواز۔ میں نے بڑھ کر اسے لپٹا لیا۔

اس نے الگ ہوتے ہوئے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''یہ تمہارا چہرہ ستا ہوا سا کیوں ہے؟''

''نہیں تو۔'' میں نے کہا۔ اور پوچھا۔ ''اور تمہارا پانکل کدھر ہیں میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''وہ.....'' مونیکا ہچکچائی..... ''ان کی حالت بگڑ چکی ہے۔ ڈاکٹر اب چپ ہے۔''

''چلو مجھے دکھاؤ۔''

ہم اوپری منزل لیجے میں انکل ڈان کا بستر تھا۔ انکل ڈان بستر پر آنکھیں بند کیے پڑے تھے۔ یقیناً لحیم شحیم رہے ہوں گے۔ چہرہ بھی بہت رعب دار تھا۔ نقوش وقت کے ہاتھوں بدل چکے تھے مگر ان سے ذہانت ہویدا تھی۔

''انکل بریسر۔'' میں نے بستر پر جھک کر انہیں مخاطب کیا۔ انہوں نے میری آواز سن لی اور آنکھیں کھول دیں۔

''کون؟ کون ہو تم؟'' اس عالم میں بھی ان کی آواز میں مضبوطی سی تھی۔

''مس مونیکا کا منگیتر ہوں۔ جارج میلون۔''

پھر میں نے وقت کھوئے بغیر کہا۔ ''انکل آپ اسپانک ہیگن، سیلری پیٹی اور نٹر وغیرہ کو ضرور جانتے ہوں گے۔''

''یہ نام.....'' وہ بولتے ہوئے رکے۔ پھر کہا۔ ''سنے سنے لگتے ہیں مجھے۔ ہاں یاد آیا۔ ان بدبختوں کو میں نے کئی بار جیل کی ہوا کھلائی تھی۔ مگر میرا خیال ہے یہ سب مر چکے ہیں۔''

''جی بالکل ٹھیک کہا آپ نے یہ سب مر چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تاہم ان کی روحیں اسی جگہ منڈلا رہی ہیں۔ انکل کیا آپ ان سے ملنا چاہیں گے۔''

''کیوں نہیں۔'' بیمار نے کسی قدر خوش دلی سے کہا۔ ان کے ہاتھ ہلے پر مسرت انداز میں۔

''میں انہیں آپ سے ملا دوں گا۔'' میں نے جھکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''قبرستان کے گیٹ پر پہلی ہی رات میں۔''

جواب میں پرانا پولیس آفیسر مسکرایا۔ یہ مسکراہٹ کسی چیتے جیسی تھی اور اسی لمحہ ایک ہلکی سی ہچکی انہیں آئی اور ان کی گردن ڈھلک گئی۔

''ارے یہ کیا ہوا۔'' مونیکا چیخی۔ وہ لپکتی ہوئی آئی اور بستر پر جھک گئی۔

''ہاہاہا۔''

میں دل ہی دل میں ہنسا اور سوچا اب مزا آئے گا۔ جب وہ منحوس انکل کو دیکھیں گے۔ میرا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔

جنازہ دوسرے دن اٹھنا تھا۔ مونیکا کو بہر حال انکل کی موت کا کچھ زیادہ صدمہ نہ تھا کیونکہ وہ بس تھوڑے دن ان کے نزدیک رہی تھی۔

ادھر ہیگن اور اس کے دوسرے ساتھی مجھے لیے اپنی خرمستیوں کے لیے ادھر ادھر دوڑا رہے تھے۔

اس رات جب میں مونیکا سے ملا تو مجھے احساس ہوا وہ مجھ سے کچھ کشیدہ سی ہے۔ میں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ میں بہت مسرور سا تھا اور یہ خوشی شاید میرے چہرے سے ہویدا تھی۔

انکل کے دفن کے موقع پر مونیکا نے کہا کہ اس کے سر میں بہت درد ہے۔ میں نے کہا میں شام کو آؤں گا۔ جب میں ٹریلر کی طرف گیا تو وہ بھوت پارٹی وہیں ٹریلر میں گھسی ملی۔ سب سگریٹیں پھونک رہے تھے۔

ہیگن نے مجھے پرشبہ نظروں سے دیکھا اور کہا۔

''کیوں پیارے۔ یہ تم کدھر پھر رہے ہو۔ ہماری تفریح کرکری مت کرو۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔

دیکھو کل ہم ذرا شہر میں گھومنے کا ارادہ رکھتے ہیں تمہارا ہونا ضروری ہے۔''

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے صبر کی تلقین کی اور خوش دلی سے کہا۔ ''بس میں فارغ ہو گیا ہوں اب۔ تم کل کی بات کر رہے ہو میں تو ابھی چلنے کے لیے تیار ہوں۔ لاتا را رائم ٹم۔'' میں گنگنایا۔ ''میں بھی گھومنا چاہتا ہوں۔'' ہیگن نے مجھے حیرت سے دیکھا۔

میں شام ہونے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ جونہی اندھیرا شروع ہوا۔ میں نے انہیں ٹریلر میں بھرا اور کہا۔

''بس اب چلتے ہیں یارو۔'' میں نے کار کو ٹریلر سے جوڑا اور کیمپ سے نکل لیا۔

میں اس قبرستان کی طرف تھا جس میں انکل کو صبح کو دفنایا گیا تھا۔

اسپائک ہیگن کسی وجہ سے چپ چپ تھا۔ مگر اسے کچھ پتا نہ تھا۔ یہ اس منحوس کی چھٹی حس تھی کوئی جو اسے سوچنے پر مجبور کیے ہوئے تھی۔

میں نے قبرستان کے احاطے کی نیچی سی دیوار کے ساتھ ایک جگہ کار روک دی۔ اس کے دوسری طرف انکل ڈان کی قبر تھی۔ اس پر کتبہ بھی لگا دیا گیا تھا ان کے نام کا۔ اسپائک ہیگن نے ٹریلر کی کھڑکی کھول کر باہر جھانکا جہاں اب تاریکی پھیل چکی تھی۔

اس نے بے چینی سے آواز نکالی۔

''اے..... یہ تم نے کار کہاں روک دی ہے۔''

میں نے کہا۔ ایک منٹ ڈیئر ایک ذرا سا کام کر کے ابھی آیا۔'' پھر میں نے کھڑکی کھولی اور کار سے اتر گیا۔ دیوار کے نزدیک پہنچ کر میں نے سرگوشی کی۔

''انکل، انکل ڈان۔''

میں سننے کی کوشش کی لیکن ادھر نزدیک ہی ریلوے لائن تھی کوئی ٹرین آن مری تھی اس کی آواز میں کوئی جواب میں نہ سن سکا۔ پھر جب سناٹا چھایا۔ تو میں نے محسوس کیا جیسے اندھیرے میں کچھ سفیدی سی لہرا رہی ہو۔ انکل ڈان بریسر کا تنومند ہیولا نیچی دیوار سے سر اٹھا رہا تھا۔

''انکل ادھر میری طرف آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ ہیولا دیوار پار کر کے میری طرف بڑھا۔

اس عرصے میں ہیگن مع اپنے ساتھیوں کے میرے پیچھے آ چکا تھا اور ایک طرف دبک کر تشویش کے ساتھ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اور پھر مجھ سے پہلے ہی انہوں نے اندھیرے میں اجالے کی اس چادر کو لہراتے دیکھ لیا اور انہوں نے انہیں پہچاننے میں بھی دیر نہیں کی۔

''ڈان بریسر!'' اسپائک ہیگن گھگھیایا۔

''میرے خدا یہ تو وہی ہے۔'' سیلری کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔

''اور..... یہ اب روح بن چکا ہے۔'' پیٹی ہکلایا۔

''بھاگو۔'' نیٹر نے آواز نکالی۔ وہ عجلت سے گھومے۔

ادھر انکل کا ہیولا بھی تیز ہو گیا تھا۔

انہوں نے میری طرف توجہ کیے بغیر کسی شکاری کتے کی طرح ان بدمعاشوں کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

سب سے آگے ہیگن تھا۔

وہ سب ریلوے لائن کی طرف بھاگ رہے تھے۔ جس پر پھر سے کوئی مال گاڑی سست رفتاری سے آ رہی تھی۔ ڈان بریسر سے بچنے کے لیے سبھی جان توڑ کر دوڑ رہے تھے۔ پھر وہ اس ٹرک کی طرف جھپٹے جو ٹرین میں جڑا ہوا ان کے پاس سے گزر رہا تھا۔

ایک نے پہلے اس کا اوپری کنارا پکڑا اور لٹک گیا۔ پھر سبھی اس میں اچھل اچھل کر لٹک گئے اور اندر گھسنے لگے۔

ڈان بریسر سے ان کا فاصلہ کچھ بھول تھا۔ مگر انکل نے بھی دیر نہیں لگائی۔ گزرتی سال گاڑی کی ایک چھپلی بوگی کی طرف انہوں نے ہاتھ بڑھایا اس کی کگر پکڑی اور اچھل کر اندر پہنچ گئے۔ ٹرین نے رفتار پکڑنی شروع کر دی تھی۔

پانچوں بھوتوں نے یہ منظر دیکھا تو وہ اچھل کر دوسری بوگی کی چھت پر چلے گئے اور انجن کی جانب دوڑنے لگے۔

یہ ان سب کا آخری منظر تھا جو میں نے دیکھا۔ پانچ بھوت آگے آگے تھے اور چھٹا ان کے تعاقب میں بوگیوں کی چھت پر کودتا لپک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انکل کی روح کو کوئی مند پسند کھیل مل گیا ہو۔ بڑے ولولے سے وہ جھپٹ رہے تھے ان پر۔

پھر وہ سب میری زندگی سے نکل گئے۔

میں مغرب میں تھا اور وہ مشرق کی سمت جا رہے تھے۔

میں نے کئی قہقہے لگائے۔

یہاں کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔

اچھی ترکیب سوچی تھی میں نے۔

میں وہاں سے مونیکا کے گھر کی طرف چل دیا۔

اب شادی اور ہنی مون میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی تھی۔

''میلون۔'' میری دستک پر دروازہ کھولتے ہوئے مونیکا نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا بات ہے تمہاری باچھیں کیوں کھلی ہوئی ہیں؟''

''وہ تمہارے انکل.....'' معاً میں چپ ہو گیا۔ کیونکہ مونیکا نے ایک دم گرم ہوتے ہوئے مجھے ٹوکا تھا۔

''بس اب چپ ہو جاؤ۔''

اس نے برہمی سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''ذلالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میرے دکھ میں شریک ہونے کے بجائے تم انکل کی موت پر بہت خوش ہو رہے ہو اور ایک بار پھر تم ذلالت.....'' غصے سے اس کے الفاظ منہ میں پھنس گئے تھے۔

''نہیں نہیں..... مونیکا۔'' میں تب ایک دم سے سنجیدہ ہوتے بولا۔

''دراصل یہ روح والی بات..... اوہ میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔ تمہارے انکل کی موت.....''

''دفع ہو جاؤ۔'' وہ حلق کے بل چیخی۔ ''تم، تم میرے انکل کی موت پر خوش ہو رہے ہو۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

''مونیکا۔'' بالآخر میں بھی چیخا۔ ''تم میری بات تو سنو۔ میں اس وقت قبرستان سے ادھر آ رہا ہوں اور.....''

''اور تمہاری باچھیں اسی لیے کھلی ہوئی تھیں۔'' مونیکا تلخی سے بولی۔ ''دیکھو میں اب تمہاری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ مجھے معلوم نہ تھا تم اندر سے کتنے خبیث ہو اور یہ منگنی میں اسے ابھی ختم کرتی ہوں اور کس قدر بری ہے تمہاری سب ہی کس قدر ڈراؤنی ہے یہ۔ میں تو لمحہ بھر ایسے آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ یوں لگ رہا ہے جیسے کوئی بھوت نہیں رہا ہو۔ لو سنبھالو اپنی یہ انگوٹھی، اس نے اپنی انگلی سے میری دی ہوئی انگوٹھی کھینچ نکالی اور میرے ہاتھ میں ٹھونس دی۔ پھر اس نے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرا دیا۔

دھڑام۔

مجھے معلوم ہے مونیکا کی فطرت۔ جو کہتی ہے کرتی ضرور ہے۔ وضاحت فضول تھی اور پھر اس قدر تلخ کلامی کے بعد تو گفتگو بالکل بے سود تھی۔ بھلا میں اس سے اسپائک ہیگن اور اس کے جتھے کے بارے میں کچھ بتاتا تو وہ کب سمجھتی۔

وہ بھلا کیسے مان سکتی تھی کہ اتنے سارے بھوتوں کے ساتھ کئی ہفتے گزارنے والے کی ہنسی اگر بھوتوں کی ہنسی جیسی نہیں ہو گی تو اور کیسی ہو گی۔ شاید ہنسنے کا یہ انداز میں نے انہیں سے اپنا لیا تھا۔

یہ ایک الگ بات تھی کہ میں نے ان خبیثوں سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ مگر مونیکا کو تو میں ان کا یقین صرف اسی صورت میں دلا سکتا تھا کہ وہ خود کسی طرح اپنے آنکھوں سے انہیں دیکھ لیتی۔

ہاہا۔

ہاہاہا۔

میں بار پھر ہنسا۔

مگر اس بار میری یہ ہنسی، ہنسی جیسی نہیں تھی بلکہ یہ کسی کسی گریہ جیسی تھی۔

ان بھوتوں نے جاتے جاتے بھی میری زندگی کا سارا لطف تلپٹ کر دیا تھا۔

☆☆

مستزاد

نسیم ملک

کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک دن اگلے روز دوبارہ وارد ہوجائے؟ آپ یقینا اسے کم عقلی سمجھیں گے مگر زیر نظر تحریر میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اتوار کے اگلے دن اتوار کا اعلان سب کے لیے باعث تعجب اور خوشگوار تھا جو لوگ اس بات پر یقین نہیں کررہے تھے بالآخر انہیں بھی یقین آگیا مگر اس سے اگلے کئی روز تک اتوار کا دن ٹھہرا رہا۔ یہاں تک کہ ملک کی معیشت اور اعلا عہدیداروں پر بھی اس کا اثر پڑا۔ آخر ملک کے سربراہ کو خود اس معاملے میں دلچسپی لینا پڑی۔

اندھیر نگری چوپٹ راج کی عملی تصویر

یہ بات سب سے پہلے بوڑھے کا پرومبلے نے محسوس کی تھی اور وہ ایک اہم آدمی تھا۔ وہ ایلربی برگ قصبے میں اس لحاظ سے اہم ترین آدمی تھا کہ روزانہ صبح سب سے پہلے وہی بیدار ہوتا تھا اور پھر وہ اپنی چھڑی لے کر قصبے والوں کے گھروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھٹکھٹا کر انہیں بیدار کیا کرتا تھا تاکہ وہ لوگ مل میں محنت مزدوری کرنے بروقت پہنچ سکیں۔

اور اس صبح جب وہ حسب معمول اپنی چھڑی اٹھا کر قصبے والوں کو جگانے نکلا تو اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اپنی جھونپڑی سے باہر قدم رکھتے ہی جب اس نے کھانس کر گلا صاف کیا اور تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں بھرتے ہوئے اس نے موسم کا اندازہ لگانے کے لیے آسمان کی طرف دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا کہ آج بھی اتوار ہے۔

بوڑھے وملبے نے حیران ہوکر سوچا۔ نیا دن تو طلوع ہی نہیں ہوا۔ ایسا لگتا ہے جیسے آج بھی اتوار ہے۔ چند لمحوں کے لیے تو اس کا ذہن ساکت ہوکر رہ گیا کیونکہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ گزشتہ روز بھی اتوار تھا، آج بھی اتوار ہے! کمال ہے۔ یہ بات تو بڑی غیر معمولی اور غلط سی لگتی ہے کہ دو اتوار ساتھ ساتھ آئیں۔ ممکن ہے مجھ ہی کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ آج اتوار ہے تو کل ہفتہ رہا ہوگا۔ یا پھر اگر کل اتوار تھا تو آج پیر ہوگا۔ بھلا اتوار کے فوراً بعد اتوار کیسے آسکتا ہے؟ آخر یہ چکر کیا ہے؟ مگر سوال یہ ہے کہ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ کل بھی اتوار تھا اور آج بھی اتوار ہے؟ اچھا ذرا میں نئے سرے سے اس پر غور کرتا ہوں۔ پہلے تو مجھے یہ دیکھنا ہے کہ ایک عام صبح اور اتوار کی صبح میں فرق کیا ہوتا ہے۔

بوڑھا وملبے خوب غور وخوض کرتا رہا اور بالآخر اسے اتوار کی صبح اور عام دنوں کی صبح میں بس یہی فرق نظر آیا کہ عام دنوں میں وہ قصبے کے افراد کو جگانے جایا کرتا تھا جبکہ اتوار کی صبح وہ ایسا نہیں کیا کرتا تھا۔ اس روز مل کے ملازموں کی چھٹی ہوتی تھی اس لیے وملبے کو انہیں بیدار کرنے کی ڈیوٹی سے بھی چھٹی ہوتی تھی۔ گویا آج چونکہ میں نے لوگوں کو جگایا نہیں ہے

اس لیے آج اتوار ہی ہے۔ اس نے اپنی مخصوص سادہ لوحی سے سوچا اور چونکہ اب بھی میں انہیں جگانے کے لیے نہیں جا رہا اس لیے اس کا مطلب یہی ہوا کہ آج اتوار ہے۔ گویا اس مسئلے پر جس زاویے سے بھی غور کیا جائے، حاصل یہی نکلتا ہے کہ آج اتوار ہے۔

پھر بوڑھے ومبلے کو خیال آیا کہ لوگوں کو بیدار کرنے کے فرض سے چھٹی کر لینا ہی کافی نہیں رہے گا۔ کیا پتا ان میں سے چند لوگ خود بخود ہی بیدار ہو جائیں! اور چونکہ انہیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ایک اتوار کے فوراً بعد آج دوسرا اتوار آ گیا ہے، اس لیے وہ انجانے میں اٹھ کر کام پر چل دیں گے۔ اس طرح انہیں خواہ مخواہ ایک ایسی صبح بھی مل تک جانے کی تکلیف گوارا کرنا پڑے گا جو خدا نے ان پر خاص مہربانی کرتے ہوئے ان کے آرام کی خاطر معجزانہ طور پر ودیعت کی ہے۔

چنانچہ ومبلے نے فیصلہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو اس بیکار کی زحمت سے بچانے کے لیے خود انہیں بتانے جائے گا کہ آج کام کا دن نہیں، اتوار ہے۔ سب سے پہلے جان برتھویٹ کا گھر آتا ہے جو مل میں فائر مین تھا۔ ومبلے نے اپنی چھڑی سے اس کی کھڑکی کا دروازہ بجایا۔

تھوڑی دیر بعد کھڑکی کھلی اور جان برتھویٹ کا سرنمودار ہوا۔ ''میں جاگ گیا ہوں ومبلے! کیا وقت ہوا ہے؟'' اس نے اپنی غنودہ آواز میں کہا۔

ومبلے اس کی آواز سے سمجھ گیا کہ برتھویٹ پوری طرح بیدار نہیں ہے۔ علی الصباح اٹھنے والے آدمی حرکت تو کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ نیند میں ہوتے ہیں۔ انہیں پوری طرح بیدار اور چاق و چوبند ہونے میں کچھ وقت ضرور لگتا ہے مگر بھلا آج کے دن بے چارے برتھویٹ کو پوری طرح بیدار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے کہا۔ ''برتھویٹ! میں تمہیں جگانے نہیں، صرف یہ بتانے آیا تھا کہ کل کے بعد آج ایک اور اتوار آ گیا ہے اس لیے تم دوبارہ بستر پر دراز ہو کر سو سکتے ہو۔''

اس پر نیم بے دار برتھویٹ مزید کچھ کہے بغیر

کھڑکی بند کر کے چپ چاپ اپنی محوِ خواب بیوی کے پہلو میں لیٹ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ دوبارہ گہری نیند سو چکا تھا۔ ومبلے اب حسبِ معمول قصبے کے تمام گھروں کے دروازوں پر دستک دینے چل پڑا مگر خلافِ معمول وہ انہیں جگا کر تیار ہونے کے لیے کہنے کی بجائے یہ کہتا گیا کہ ایک اتوار کے فوراً بعد دوسرا اتوار آ جانے کے سبب وہ مزے سے سو سکتے ہیں۔ ابھی جاگنے کا وقت بھی کہاں ہوا تھا۔ ابھی تو پوری طرح روشنی بھی نہیں ہوئی تھی۔

ظاہر ہے کہ سب ہی بیدار ہونے والے لوگوں نے ومبلے کی اس بات پر یقین نہیں کیا کہ آج بھی اتوار ہے۔ کچھ لوگ تو ومبلے کی زبانی اتوار ہونے کا مژدہ سنتے ہی مزے سے اپنے بستروں میں دبک کر جلد ہی خراٹے لینے لگے مگر کچھ لوگ اٹھ کر اپنے کام پر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ کیونکہ انہیں یاد تھا کہ گزشتہ روز اتوار تھا۔ وہ سب اپنے ٹفن کیریر اور برساتیاں وغیرہ اٹھا کر کام پر روانہ ہو گئے۔ راستے میں انہیں ایک جگہ ومبلے مل گیا۔

''کیوں بھئی ومبلے! یہ تم نے کیا اڑا دی کہ آج پھر اتوار ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''اڑانے کی کیا بات ہوئی! آج تو واقعی اتوار ہے۔''

''لیکن کیسے؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میں سمجھا نہیں سکتا لیکن..... لیکن مجھے یقین ہے کہ کوئی خاص بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے کل کے اتوار کے بعد آج پھر اتوار آ گیا ہے۔''

کچھ لوگوں نے ومبلے کی بات پر یقین کر لیا مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ ماننے پر تیار نہیں تھے۔

''دیکھو ومبلے!'' گولیکر نے کہا۔ ''میں مانتا ہوں کہ آج کچھ اتوار ہی کا سماں ہے لیکن..... لیکن سوال یہ ہے کہ اس پر یقین کیسے کر لیا جائے؟''

بوڑھے ومبلے نے کچھ دیر تک سوچ کر کہا۔ ''ارے ہاں، مجھے اس کا طریقہ بھی سمجھ میں آ گیا ہے۔ تم جانتے ہو نا کہ اتوار کی صبح کو چھوڑ کر روزانہ صبح مل کا سائرن پندرہ منٹ تک بجتا ہے۔ جیسے کل نہیں بجا تھا چنانچہ اگر آج سائرن بج گیا تو ہم سمجھ لیں گے کہ آج اتوار نہیں ہے اور اگر نہ بجا تو گویا آج اتوار ہو گا۔ ٹھیک ہے نا!''

وہ سب اس پر متفق ہو کر ومبلے کے پاس کھڑے ہو کر سائرن بجنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے کیونکہ ان میں سے کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی جبکہ ومبلے ایک عدد گھڑی کا مالک تھا۔ اس وقت چھ بجنے میں بیس منٹ تھے۔ پھر پندرہ منٹ رہ گئے۔ پونے چھ بج گئے۔ عین پونے چھ بجے ہی مل کا سائرن بجا کرتا تھا، پندرہ منٹ تک! تاکہ مل کے سب کارکن ڈیوٹی کا وقت ہو جانے سے مطلع ہو جائیں۔ پھر پونے چھ بجے سے بھی ایک منٹ اوپر ہو گیا مگر سائرن نہیں بجا۔ سائرن بجتا بھی کیسے جبکہ سائرن بجانے کی ذمہ داری جان برتھویٹ کے سپرد تھی جو روزانہ ساڑھے پانچ بجے مل میں پہنچ جایا کرتا تھا اور اسٹیم پریشر بنانے کے بعد وہی سائرن کی کل کھینچا کرتا تھا مگر آج تو وہ ومبلے کی زبانی اتوار ہونے کا مژدہ سن کر اپنی بیوی کے پہلو میں دوبارہ گہری نیند جا سویا تھا۔

منٹ دکھانے والی سوئی جب ایک منٹ اور بڑھ گئی تو ومبلے نے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ آج اتوار ہے! اب تو تم لوگوں کو ثبوت مل گیا ہے کہ میں سچ کہتا تھا؟ اب تم لوگ جا کر تھوڑی دیر اور سو سکتے ہو۔''

چنانچہ وہ سب لوگ بڑی خوش خوش اپنے گھر چلے گئے۔ راستے میں، وہ دل ہی دل میں ومبلے کی تعریف کر رہے تھے کیونکہ ومبلے کو ہی ایک اتوار کے بعد دوسرا اتوار آنے کا احساس ہوا تھا ورنہ وہ سب ''احمق'' تو یہی سمجھتے تھے کہ گزشتہ روز اتوار تھا، اس لیے آج پیر ہے اور پھر وہ سب خوامخواہ ہی مل میں کام کرنے چلے جاتے۔

بوڑھا ومبلے بھی اپنے گھر چلا گیا وہ اپنے لیے ناشتا بنا رہا تھا کہ رولی ہلول اس کے یہاں آئی۔

''ارے ومبلے!'' اس نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تم نے آج پھر اتوار ہونے کا انکشاف کیا ہے!''

''ہاں، کیا ہے؟'' وملبے نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن کیا یہ غیر معمولی سی بات نہیں لگتی کہ ایک اتوار کے فوراً بعد دوسرا اتوار آ جائے؟'' رولی نے کہا۔

''ہاں غیر معمولی لگتا تو ہے۔'' وملبے نے کہا۔ ''لیکن یہ بھی تو سوچو کہ آج کل ہم جس دور میں رہ رہے ہیں وہ بھی تو غیر معمولی ہی ہے۔''

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔'' رولی نے اس کی تائید میں کہا۔

''اور مجھے خوشی ہے کہ تم نے بروقت یہ بات دریافت کر لی ہے ورنہ تھوڑی دیر بعد تو آج میں پیر کا دن سمجھ کر اسکول کی گھنٹی بجا دیتی۔ ارے ہاں...... اب تو مجھے چاہیے کہ جا کر گرجا گھر کی گھنٹی ہی بجا دوں۔ اتوار جو ہوا۔''

''ہاں! واقعی ایسا تو تمہیں ضرور کرنا چاہیے۔''

''تو میں جا رہی ہوں۔ تمہارا شکریہ کہ تمہاری بدولت میں آج ایک غلطی کرنے سے بچ گئی۔''

رولی گرجا گھر چلی گئی اور وملبے دوبارہ ناشتا بنانے میں لگ گیا مگر جلد ہی قصبے کے چند افراد آ گئے اور انہوں نے اسے بتایا کہ دوسرے قصبوں کے جو افراد قصبہ ایلر بی برگ کی مل میں کام کرتے ہیں، وہ سب ہی مل کے گیٹ پر جمع ہو کر گیٹ کھولنے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور ان کا اصرار ہے کہ آج اتوار نہیں پیر ہے۔ وملبے یہ سنتے ہی اپنا ناشتا ادھورا چھوڑ کر صرف ایک توس اٹھا کر اسے کھاتے ہوئے مل کی طرف چل دیا۔ وہاں جا کر اس نے گمراہ لوگوں کو بتایا کہ آج پیر نہیں، اتوار ہے۔

''لیکن اگر ایلر بی برگ میں اتوار ہے تو وکسلے میں کون سا دن ہے آج؟'' کسی نے سوال کیا۔

''ہاں، یہی بات ہے اور رومبک اور ٹیز لے میں کیا دن ہوگا'' کسی اور نے لقمہ دیا۔

''وہاں بھی اتوار ہی ہے۔'' وملبے نے یقینی لہجے میں جواب دیا۔ ''صرف تم لوگ اس کا احساس نہیں کر سکے۔ جب ایک اتوار کے فوراً بعد دوسرا اتوار آ جائے تو عام آدمی کو غلط فہمی ہو ہی جاتی ہے اور وہ اسے پیر سمجھ بیٹھتا ہے۔ تم لوگوں کو بھی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ آج ایلر بی برگ ہی میں نہیں ہر جگہ اتوار ہے اس لیے تم لوگ جا کر چھٹی مناؤ۔''

''مجھے خوشی ہے کہ آرام کا ایک اور دن مل گیا۔'' ٹچ مدرسول بولا۔

''لیکن اگر بیدار ہونے سے پہلے پتا چل جاتا تو اور بھی اچھا ہوتا کیونکہ چھٹی کے روز تو میں ناشتا بستر ہی میں کرتا ہوں۔''

''اب بھی اگر تم جلدی سے چلے جاؤ تو بستر میں گھس سکتے ہو۔'' کاپر وملبے نے اسے مشورہ دیا۔ ''تمہاری بیوی جب تمہیں بستر میں دیکھے گی تو سمجھ جائے گی کہ آج اتوار ہے اور وہ تمہارے لیے ناشتہ وہیں لے آئے گی۔''

وہ لوگ چلنے ہی والے تھے کہ مسٹر بلاگز آ گئے۔ مسٹر بلاگز خاصی تاخیر سے آئے تھے مگر ان کا تاخیر سے آنا اس لیے گوارا تھا کہ وہ ایک اور قصبے میں رہتے تھے اور وہ مل کے مالک تھے۔ ''ارے یہ کیا ہوا؟ تم سب ابھی تک مل میں کیوں نہیں گئے؟ کام کیوں نہیں شروع کیا؟'' مسٹر بلاگز نے کہا۔

چنانچہ انہوں نے مسٹر بلاگز کو ایک کے بعد دوسرے اتوار آنے کی اطلاع دی۔

مسٹر بلاگز نے منہ بنا کر کہا۔ ''کیا بکواس ہے! جب میں گھر سے روانہ ہوا تو پیر کا دن تھا۔ اگر پڑزلے میں پیر ہے تو پھر یہاں اتوار کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا کیسے ہو سکتا ہے۔'' وملبے نے جواب دیا۔

''لیکن آج ہے اتوار ہی! البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ پڑزلے میں بھی اتوار ہی ہو اور آپ کو محسوس نہ ہو۔''

''نہیں! میں کہہ رہا ہوں کہ آج پیر ہے۔'' مسٹر بلاگز چلائے۔

''چلو سب لوگ کام شروع کرو۔ بھلا دو اتوار اکٹھے کیسے آ سکتے ہیں!''

''لیکن آج ایسا ہے۔'' وہ لوگ بولے۔

''نہیں آج اتوار نہیں آج پیر ہے۔ جو آدمی پانچ منٹ کے اندر اندر مل میں جا کر کام شروع نہیں کرے گا وہ اپنے آپ کو ڈسچارج سمجھے۔''

''آج اتوار.....''

''آج اتوار کیسے ہو سکتا ہے، یہ ناممکن ہے۔'' مسٹر بلاگز چیخے اور عین اسی وقت گرجا گھر کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

وہ سب لوگ یک زبان ہو کر بولے۔ ''گرجا گھر کی یہ گھنٹیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ آج اتوار ہے.....اور اتوار کو کام کرنا تو گناہ ہوتا ہے۔ یہ دن عبادت اور تفریح کے لیے ہوتا ہے۔''

چنانچہ وہ سب مڑے اور اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیے۔ مسٹر بلاگز اپنی مل کے گیٹ پر اکیلے کھڑے رہ گئے۔ وہ ان لوگوں کی عقل پر ماتم کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک متاسفانہ انداز میں سر ہلانے کے بعد وہ دروازہ کھول کر اندر چلے گئے اور دفتر میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئے، پھر اسی مسئلے پر غور کرنے لگے۔

اس اثناء میں قصبے کے سب ہی مکین اپنے ہفتہ وار معمول کے مطابق وہ سب کام کرنے میں لگ گئے تھے جو عموماً اتوار کو کیے جاتے ہیں۔ مرد حضرات آرام کرسیوں پر نیم دراز تھے اور عورتیں دوپہر کے کھانے کی خاطر خاص اہتمام کرنے میں مصروف تھیں۔ بچے اپنے بہترین لباس پہن کر اسکول جانے کے بجائے گرجا گھر چلے گئے تھے جہاں ہر اتوار کو اتھل نیو گیٹ انہیں مذہب پر لیکچر دیا کرتی تھی۔ اتھل ان کے ساتھ ہی گرجا گھر چلی گئی تھی۔ قصبے کے اسکول ٹیچر مسٹر سمز نے گرجا گھر کی گھنٹیاں بجتے سن کر سمجھ لیا تھا کہ آج اتوار ہے، اس لیے وہ مدرسی فرائض سرانجام دینے کے لیے اسکول جانے کے بجائے گرجا گھر چلے گئے۔ چرچ آرکسٹرا کے سب ہی ممبر پہنچ چکے تھے۔ اب تک قصبے کے بے شمار افراد وہاں اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے لہٰذا پادری مسٹر اسٹون نے مجبوراً سنڈے سروس سرانجام دی، روز گزشتہ کی طرح! چونکہ وہ اس دوسرے اتوار کی اچانک آمد کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے انہوں نے وہی وعظ دہرا دیا جو ایک روز پہلے بھی کر چکے تھے۔ قصبے کے افراد کو یہ وعظ پہلے روز کی نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ میں آیا ظاہر ہے ایک ہی چیز کو دوسری مرتبہ سننے سے اوق الفاظ بھی کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آنے لگے تھے۔

اس دوران میں مل بند رہی تھی البتہ مسٹر بلاگز بیکار نہیں بیٹھے رہے تھے۔ قصبے کا واحد ٹیلیفون انہی کے دفتر میں تھا۔ انہوں نے ریسیور اٹھا کر آپریٹر سے کہا کہ انہیں گرین وچ آبزرویٹری سے ملا دیا جائے۔ مسٹر بلاگز ہر کام بھرپور طریقے سے کرنے کے قائل تھے۔ جب گرین وچ آبزرویٹری سے رابطہ قائم ہوا تو مسٹر بلاگز نے ان سے پوچھا۔ ''جناب آج کون سا دن ہے؟''

''آج پیر ہے۔''

مسٹر بلاگز نے مطمئن ہو کر ریسیور واپس رکھ دیا۔ اب وہ حلفیہ کہہ سکتے تھے کہ وہ غلطی پر نہیں ہیں۔ آج واقعی پیر کا دن ہے۔ اس سائنسی تصدیق کے ہتھیار سے لیس ہو کر وہ اپنے دفتر سے باہر آئے۔ عین اسی وقت گرجا گھر میں سنڈے سروس ختم ہوئی اور لوگ جوق در جوق باہر آنے لگے۔ مسٹر بلاگز نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''سنو لوگو! خواہ مخواہ خود فریبی میں مبتلا رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آج اتوار نہیں، پیر ہے۔''

لیکن ان لوگوں نے جواب دیا کہ وہ ابھی ابھی سنڈے سروس سے فارغ ہو کر آئے ہیں جو پیر کو ہرگز نہیں ہو سکتی اس لیے بھلا آج پیر کیسے ہو سکتا ہے۔

اس پر مسٹر بلاگز چراغ پا ہو کر زور زور سے بولنے لگے۔ پادری مسٹر اسٹون یہ شور و غل سن کر گرجا گھر کی سیڑھیوں پر آ گئے۔ انہوں نے مسٹر بلاگز کی باتیں سن کر کہا۔ ''جناب! اس متبرک دن کی توہین مت کیجیے۔''

مسٹر اسٹون اپنے مخصوص لباس میں بڑے باوقار نظر آ رہے تھے۔ مسٹر بلاگز نے خود ضبطی سے کام لیتے ہوئے سوچا کہ وہ غصے میں آ کر ان لوگوں کی سادہ لوحی کا طلسم نہیں توڑ سکیں گے۔ انہوں نے پادری سے نرم لہجے میں مخاطب ہو کر کہا کہ اگر آج اتوار ہے تو پھر

یہ بات تسلیم کرنی ہوگی کہ ایک اتوار کے فوراً بعد دوسرے اتوار کا آنا خاصی غیر معمولی بات ہے۔ مسٹر اسٹون نے یہ تسلیم کیا اور مسٹر بلاگز کی یہ تجویز بھی مان لی کہ اس غیر معمولی معاملے پر غور و خوض کرنے کے لیے ایک اجلاس بلایا جانا چاہیے۔

چنانچہ سارے قصبے میں اعلان کر دیا گیا کہ چار بجے سہ پہر قصبے کے اسکول میں ایک اجلاس کا انعقاد ہو رہا ہے جس میں سب افراد کو شرکت عام کی دعوت ہے۔ پادری اسٹون کو اجلاس کی صدارت کرنے کی پیش کش کی گئی۔ مسٹر اسٹون خود بھی آج اتوار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے چنانچہ انہوں نے اجلاس کی صدارت کرنے سے معذرت چاہ لی جس پر قرعہ فال اسکول ماسٹر پالکبسی کے نام نکلا جنہوں نے اجلاس کی صدارت کرنے اور اتوار ہونے نہ ہونے کے بارے میں ہر ایک کو اظہار خیال کا موقع دینے کی حامی بھر لی۔

اجلاس کے وقت سے پہلے ہی اسکول کے ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی اور جونہی مسٹر پالکبسی نے اجلاس کا آغاز کیا مسٹر بلاگز نے اٹھ کر زوردار لہجے میں کہا کہ آج اتوار نہیں پیر ہے۔ ان کے بعد ٹیلر ہکل اٹھا اور اس نے بھی مسٹر بلاگز کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ آج پیر ہی ہو سکتا ہے کیونکہ کل اتوار تھا اور ہمیشہ سے اتوار کے بعد پیر ہی آتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اتوار کے بعد بھی اتوار ہی آیا ہو۔

اس کے بعد کوئی شخص بولنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا حالانکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ ٹیلر ہکل آج پیر ہونے پر اصرار کیوں کر رہا ہے۔ اگر اتوار ہوتا تو ہکل کو اپنی دکان بند کرنا پڑتی۔ اس طرح اس کی آمدنی میں کمی ہو جاتی اس لیے اس نے مسٹر بلاگز کی حمایت کی تھی لیکن مسٹر بلاگز اور اس کی تردید میں بولنے کے لیے کوئی نہیں اٹھا کیونکہ اتنے زیادہ لوگوں کی موجودگی میں اٹھ کر بآواز بلند بولنے سے انہیں گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔

کچھ دیر تک سکوت طاری رہا، پھر مجمع میں سے کسی نے کہا۔ ''وہ سام اسمال کہاں ہے؟''

''میں یہاں ہوں۔'' ہال کے عقب سے آواز آئی اور سب لوگ اکٹھے بول اٹھے۔ ''آؤ سام! ہمیں بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے؟''

سام اسمال اس قصبے میں خاصا مشہور شخص تھا۔ دنیا کے کسی بھی موضوع پر اس کی رائے کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی تھی۔ وہ اندھوں میں گویا کانا راجا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ وہ نہ صرف لندن اور دوسرے شہروں سے ہو آیا تھا بلکہ بحری جہاز پر ساری دنیا کی سیر بھی کر آیا تھا۔ جب سام اسمال اسٹیج کی طرف جا رہا تھا تو سب ہی اسی لیے بے تابی سے اس کی بات سننے کے منتظر تھے۔

''میرے بھائیو! بات کچھ یوں ہے کہ کسی دن کے نام میں آخر رکھا ہی کیا ہے! لیکن اس کے باوجود اگر آپ اس مسئلے کو اتنی اہمیت دینے پر مصر ہیں تو پھر یہ کہوں گا کہ ایک اتوار کے بعد دوسرا اتوار آنا عین ممکن ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے بحری جہاز پر دنیا کا سفر کیا ہے۔ وہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز منگل تھا۔ اگلے روز جب ہم بیدار ہوئے تو جہاز کے کپتان نے اعلان کیا کہ آج جمعرات کا دن ہے اور واقعی وہ جمعرات کا دن تھا۔ منگل اور جمعرات کے درمیان سے بدھ کا دن کہیں غائب ہو گیا تھا۔ آج تک وہ کھویا ہوا دن واپس نہیں آیا۔ میں نے بحری جہاز پر سوار دوسرے مسافروں سے پوچھا کہ یہ کیا چکر ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ طویل سفر کے دوران میں اس طرح ایک دن کا فرق ضرور پڑتا ہے۔ ادھر سے ادھر جاتے ہوئے ایک دن غائب ہو جاتا ہے اور اگر یہی سفر ادھر سے اس سمت میں کیا جائے تو پھر ایک دن فالتو آ جاتا ہے مثلاً اگر ایک روز منگل ہے تو اگلے روز بھی منگل ہی ہوگا چنانچہ بات بالکل واضح سی ہے۔ اگر جہاز پر دنیا کا چکر لگاتے ہوئے دو اکٹھے منگل آ سکتے ہیں تو پھر بھلا ہمارے قصبے میں دو اکٹھے اتوار کیوں نہیں آ سکتے! جبکہ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ دنیا ہر وقت گردش میں رہتی ہے۔ اگر سست رفتار بحری جہاز پر ایک دن فالتو آ سکتا

ہے تو اتنی تیزی سے گھومتی ہوئی دنیا میں ایسا کیوں نہیں ہوسکتا؟ یقیناً یہاں بھی دو اتوار اکٹھے آسکتے ہیں۔''

''ہونہہ! بڑا عالم فاضل آیا ہے۔'' مسٹر بلاگز بڑبڑائے۔

''اوہ!'' سام اسمال کے احساس برتری کو ٹھیس پہنچی تو وہ بولا۔

''مسٹر بلاگز! کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آج جاپان میں ہفتے کا کون سا دن ہوگا؟''

''ہاں! وہاں آج پیر ہے۔'' مسٹر بلاگز نے کہا۔

''معاف کیجیے گا مسٹر بلاگز!'' اسکول ماسٹر یعنی صاحب صدر نے اپنی علمیت کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ''میں آپ کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے اپنی گھڑی کو غور سے دیکھا۔ ''جاپان میں اس وقت منگل کا دن شروع ہو چکا ہے۔''

''دیکھا، میں نہ کہتا تھا!'' سام اسمال فاتحانہ انداز میں چیخا۔

''اس بات پر فضول بحث کرنے کا کیا فائدہ کہ آج اتوار نہیں ہوسکتا؟ اگر گرین وچ میں پیر ہوسکتا ہے جیسا کہ مسٹر بلاگز کہتے ہیں اور اگر جاپان میں منگل ہے جیسا کہ مسٹر پالکی کہتے ہیں تو پھر یہاں اتوار ہونے میں کیا رکاوٹ ہوسکتی ہے! ضروری تو نہیں کہ ہر جگہ ایک ہی دن ہو۔''

''نان سنس!'' مسٹر بلاگز بھی بلند آواز میں چلائے۔ ''اب میں سمجھ گیا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ دراصل تم سب لوگ پرلے درجے کے سست اور کاہل ہو، اس لیے تم ایک اور چھٹی منانے کے لیے آج اتوار ہونے کی ضد کر رہے ہو۔''

''نہیں نہیں مسٹر بلاگز! یہ بات نہیں ہے۔'' سام اسمال نے جواب دیا۔ ''آپ اب ہار کر ایسی باتیں نہ کریں۔''

اس پر لوگوں نے سام اسمال کی حمایت میں پرجوش نعرے بلند کیے۔ ایک شور وغل بپا ہوگیا۔ سام اسمال یہ تحسین وصول کرتا ہوا اسٹیج سے نیچے آ گیا۔

''ہونہہ!'' مسٹر بلاگز اب صحیح معنوں میں برہم ہو کر چیخے۔ ''اگر آج اتوار مان لیا جائے تو پھر کل کیا دن ہوگا؟ پیر ہوگا یا منگل؟ آخر ایک دن کس کھاتے میں ڈالا جائے گا؟''

''یہ میں بتاتا ہوں۔'' کاپر ومیلے نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہم سست اور کاہل نہیں ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ہفتے کے سات دن اتنی مدت باقاعدگی سے آنے کے بعد اب تھک گئے ہیں، اس لیے اب انہوں نے یہ معمول چھوڑ دیا ہے۔ وہ ایک جگہ ساکت ہوگئے ہیں۔ دن بدلنے کا معمول ختم!''

مسٹر بلاگز بڑبڑائے۔ ''کیا لغویات ہیں! اگر دن بدلنا ختم ہے تو اس کا مطلب ہوا کہ کل بھی اتوار ہی رہے گا۔ کیا کہیں؟''

ومیلے نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر تک غور کیا اور پھر پرجوش آواز میں بولا۔ ''یقیناً اب آپ نے کام کی بات کہی ہے۔ بالکل یہی بات ہے کل بھی لازمی طور پر اتوار ہی ہوگا..... اتوار ہی ہونا چاہیے۔''

اس کے بعد اجلاس وہیں ختم ہوگیا اور سب لوگ گھروں کی طرف چل دیے۔ راستے میں کچھ لوگوں نے ومیلے سے پوچھا کہ کیا اگلے روز واقعی اتوار ہوگا۔ ومیلے نے جواب دیا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اتوار ہی ہوگا۔ کل صبح جب میں تم لوگوں کو جگانے آؤں گا تو دیکھ لینا، اتوار ہی ہوگا۔''

''مجھے ایک اور خیال آیا ہے۔'' جان برتھویٹ نے کہا۔ ''اگر کل اتوار ہوا تو تم ہم لوگوں کو جگانے مت آنا۔ خواہ مخواہ ہماری چھٹی کے دن کی صبح سویرے کی میٹھی نیند کیوں خراب ہو۔ پھر اتوار اور عام دنوں میں فرق ہی کیا رہے گا۔ بس جب تم جگانے نہیں آؤ گے تو ہم سمجھ جائیں گے کہ آج بھی اتوار ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مجھے بھی ذرا آرام مل جائے گا۔'' ومیلے نے کہا۔ ''لیکن..... لیکن اس طرح مجھے نقصان ہوجائے گا۔ جب میں تم لوگوں کو جگانے نہیں آؤں گا تو مجھے تنخواہ میں نقصان ہوجائے گا۔''

ان سب نے متفقہ طور پر طے کیا کہ اب چاہے آئندہ ہمیشہ اتوار کا دن ہی کیوں نہ رہے، ومیلے کو اس

کی تنخواہ اسی طرح ادا کی جاتی رہے گی جیسے کہ کام کے دنوں میں ملا کرتی تھی۔ وہیلے نے مفت کی تنخواہ لینے سے انکار کیا لیکن ان کے اصرار پر بالآخر مان گیا۔ پھر وہیلے کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ وہ بولا۔ ”چلو اس قصبے کا معاملہ تو طے ہو گیا مگر دوسرے قصبوں کے مزدوروں کا کیا بنے گا؟ وہ بے چارے تو کل صبح بھی حسب معمول کام کرنے مل میں آ پہنچیں گے اور پھر مل میں آ کر انہیں پتا چلے گا کہ آج بھی اتوار ہے۔ خوامخواہ انہیں اتنا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔“

جان ولی نے کہا۔ ”ہاں یہ بات تو ہے۔ میرے خیال میں ہم ابھی ایک کمیٹی بنا دیتے ہیں۔ اس کمیٹی کا ہر ممبر ایک ایک قصبے میں جا کر انہیں بتا دے گا کہ آج کل دن بدلنا بند ہو گئے ہیں اور فی الحال مستقل طور پر اتوار ہی رہے گا۔“ یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی۔

اگلی صبح قصبے کے لوگ بیدار ہونے کے باوجود اپنے اپنے بستروں میں رہے اور وہیلے کا انتظار کرتے رہے لیکن وہیلے نہیں آیا۔ مل کا سائرن بھی نہیں بجا۔ گویا اس روز بھی اتوار تھا۔ بعض لوگ دوبارہ سو گئے، بعض اونگھتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد گرجا گھر کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اب تو یہ بات یقینی ہو گئی کہ اس روز بھی اتوار ہی ہے۔ اردگرد کے قصبوں میں بھی لوگ کام پر نہیں گئے، اس لیے انہیں بھی معلوم ہو گیا کہ اس روز اتوار ہے۔ ان لوگوں نے دیر تک آرام کیا اور پھر اپنے بہترین لباس پہن کر ادھر ادھر گھومنے چلے گئے۔ گرجا گھر میں سنڈے سروس بھی ہوئی۔ گھر بار کے چھوٹے موٹے کام بھی کیے گئے۔ بچوں کو بھی اسکول سے چھٹی رہی۔ مسلسل محنت سے تھکے ہوئے جسموں کو یہ تیسرا مسلسل اتوار بے حد آرامدہ لگا۔

اگلے روز ہفتے کے دن بدلنے کا نظام رک جانے اور روزانہ مسلسل اتوار ہونے کی خبر سارے یارک شائر میں پھیل گئی جہاں کے شپ یارڈ میں ہزاروں مزدور کام کرتے تھے۔ پھر وہاں سے یہ خبر لنکا شائر، بلیک کنٹری، اسٹیفورڈ شائر سب ہی جگہوں پر پھیل گئی اور وہاں کے کارکنوں، مزدوروں سب ہی نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ سب کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ اخبارات کی طرف سے کام کے دنوں کی گمشدگی کی حقیقت جاننے کے لیے طول و عرض میں نمائندے بھیجے گئے۔ ان میں سے ایک نمائندہ ایلر بی برگ قصبے میں بھی جا پہنچا۔ اسے کاپر وہیلے سے ملایا گیا۔ ظاہر ہے مسلسل اتوار ہونے کی صورت حال کی وضاحت کے لیے وہی اس قصبے کا بہترین ترجمان ہو سکتا تھا۔ جب وہیلے نے اسے ساری بات بتائی تو اخباری نمائندہ ہنسنے لگا۔ پھر اتفاق سے ایان کاوپر ادھر آ نکلا۔ وہ وہاں کا سب سے طاقت ور آدمی تھا۔ لحیم شحیم قد و قامت کی وجہ سے وہ انسان کے بجائے دیو نظر آتا تھا۔ اس نے اخباری نمائندے کو استہزائیہ انداز میں ہنستے دیکھا تو اس سے ایک سکہ ادھار مانگا۔ جب اخباری نمائندے نے اسے سکہ دیا تو کاوپر نے اسے صرف دو انگلیوں کی مدد سے دہرا کر دیا اور اخباری نمائندے کی ہنسی وہیں رک گئی۔ ایان کاوپر نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے اپنے اخبار کو فون کر کے بتا دو کہ آج اتوار ہے اور کل بھی رہے گا، مسلسل اتوار!“

”جی ہاں! ابھی لیں۔“ نوجوان اخباری نمائندے نے کمال فرمانبرداری سے کہا۔

☆☆☆

اتوار کے مستقل طور پر ٹھہر جانے کی خبر زیادہ تر حلقوں میں بے حد مقبول ہوئی۔ وہ تمام افراد جو کام کے دنوں میں صبح تا شام سخت قسم کی محنت مشقت کیا کرتے تھے، اپنے لیے آرام و سکون کا ایک مستقل موقع حاصل کر کے بہت خوش ہوئے۔ کاغذ کے کارخانوں، شوگر ملوں، لکڑی اور شیشے کے ساز و سامان بنانے کی فیکٹریوں، فاؤنڈریوں، کاٹن ٹیکسٹائل ملوں، اسٹیل ملوں، پرنٹنگ پریسوں اور دیگر اس قسم کے سینکڑوں کارخانوں میں کام کرنے والے ہزارہا مزدور اور کارکن انتہائی خوش تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ چند افراد ایسے بھی تھے جو اس معجزاتی وقوعے سے خوش نہیں، پریشان تھے۔ اگرچہ ملک کے بیشتر افراد کو یقین ہو چکا تھا کہ خوب صورت اتوار کا سہانا دن مستقل طور پر قیام پذیر ہے مگر پریشان ہونے

والے چند افراد ہر ایک کو یہ سمجھانے کی عبث کوشش کرتے رہے کہ دراصل ہر نیا دن معمول کے مطابق کام کرنے والا دن ہے۔ اتوار کے بعد پیر آتا ہے، پھر منگل، بدھ، جمعرات، جمعہ اور ہفتہ گزرنے کے بعد ہی اتوار آتا ہے۔ وہ کہتے کہ جو لوگ مستقل طور پر اتوار کے آنے پر مصر ہیں وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں۔

ان چند افراد نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر مستقل طور پر اتوار ہی رہا تو ملک کے کسی کارخانے کسی فیکٹری میں کوئی کام نہیں ہوگا، نہ ہوائی جہاز بنیں گے نہ بحری جہاز! نہ نئے ٹیلیفون سیٹ بنیں گے نہ وائرلیس سیٹ! نہ گولہ بارود اور اسلحہ بنے گا نہ توپیں اور ٹینک! نہ بیڈ منٹن ریکٹ بنیں گے نہ کرکٹ کے بیٹ! معیشت ٹھپ ہو کر رہ جائے گی اور ہر شے کی پیداوار رک جائے گی۔ جب ملک میں ہر کام ہی ٹھپ ہو کر رہ جائے گا تو پھر دولت کیسے کمائی جا سکے گی، مصنوعات برآمد کیسے کی جا سکیں گی۔ پہلے سے جمع شدہ دولت میں اضافہ کیسے ہو سکے گا؟

یہ چند لوگ اس ملک کے سرمایہ دار تھے۔ انہوں نے صورت حال کی سنگینی دیکھ کر وزیراعظم سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ جلد ہی وزیراعظم سے ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا اور سرمایہ داروں کا وفد ان کے پاس پہنچ گیا۔

ان میں سے ایک نے کہا۔ ''جناب! میں مذہب کے بنائے ہوئے قوانین پر سختی سے کاربند رہنا چاہتا ہوں۔ ہمارا مذہب یہی کہتا ہے کہ ہفتے میں ایک دن آرام کرو۔''

''بالکل، بالکل!'' دوسروں نے اس کی تائید میں کہا۔

''اور جناب وزیراعظم صاحب! ذرا آپ دیکھیے کہ یہ صورت حال میرے اسٹاک ہولڈروں پر کسی بری طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ زیادہ تر اسٹاک ہولڈر یتیم بچے ہیں، غریب بیوائیں ہیں۔ اگر میرے کارخانے میں کام شروع نہ ہوا اور آمدنی نہ ہو سکی تو یہ غریب لوگ بالکل ہی مفلوک الحال ہو کر رہ جائیں گے کیونکہ وہ ہمیشہ سے اپنے شیئرز پر حاصل ہونے والے منافع اور بونس پر ہی گزارا کرتے آئے ہیں۔ انہیں کوئی کام کرنا نہیں آتا اس لیے آپ کو ان بے چاروں کی بہتری کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔''

وزیراعظم نے انہیں یقین دلایا کہ حکومت، ملکی صنعت و حرفت اور تجارت کے تحفظ اور بقا کے لیے بہت جلد ضروری اقدامات کرے گی کیونکہ یہی تو ملک کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وفد مطمئن ہو کر واپس چلا گیا اور وزیراعظم نے فوری طور پر غور و خوض شروع کر دیا۔ وزیراعظم بیک وقت بہت سے امور پر غور و خوض کرنے کا عادی تھا۔ معاً اس نے اپنے سیکریٹری کو بلایا اور کہا۔ ''اسمتھ! آج اتوار ہے اور کل بھی اتوار ہوگا۔ میرا سامان پیک کرو۔ ہم چھٹی منانے جائیں گے۔''

''لیکن..... جناب۔'' سیکریٹری نے کہا۔ ''سنگین عالمی بحران پیدا ہو چکا ہے۔ ہمیں اب تک دو بڑے ممالک کی طرف سے یہ صورت حال ختم کرنے کے لیے الٹی میٹم مل چکے ہیں۔ ان کا فوری جواب دینا ہے۔''

''ہاں یہ بحران تو واقعی قابل افسوس ہے لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ہماری عظیم قوم اتوار کی تفریح کو کسی قیمت پر ترک نہیں کر سکتی چنانچہ اگر آج اتوار ہے جو کہ یقینی بات ہے تو پھر میں اس کے خاتمے تک الٹی میٹم کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔''

''لیکن جناب سوال یہ ہے کہ آخر یہ اتوار ختم کب ہوگا؟ اگر کل بھی اتوار رہا، پرسوں بھی رہا.....''

''ہوں..... بہرحال مجھے ذرا غور کرنے دو اور غور کرنے کی بہترین جگہ کوئی تفریحی مقام ہوتا ہے۔'' وزیراعظم نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی وزیراعظم چھٹی منانے کے لیے سوا پانچ بجے کی ٹرین سے کسی تفریحی مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب اخبارات کو یہ معلوم ہوا تو انہوں نے فوری طور پر یہ خبر شائع کر دی اور اس کے ساتھ ہی سارے انگلستان بلکہ ساری دنیا کے لوگ سمجھ گئے کہ اب سرکاری طور پر ہر دن کو اتوار تسلیم کر لیا گیا ہے۔

☆☆☆

ادھر ایلر بی برگ کے لوگ بوڑھے کا پر وہلے پر نازاں تھے۔ آخر سب سے پہلے اسی نے مستقل اتوار ہونے کی خوش خبری سنائی تھی اور محنت مشقت سے اکتائے ہوئے لوگ اب ان زنجیروں سے رہائی پا کر بہت خوش تھے۔ وہ اب اپنا زیادہ تر وقت آرام کرنے میں گزارتے تھے۔ کچھ لوگ باقاعدگی سے گرجا گھر میں عبادت کرنے بھی جاتے تھے۔ شہروں کے لوگ پکنک منانے کے لیے چل دیے۔ آخر اتوار کا دن بے کار بیٹھ کر تو نہیں گزارا جا سکتا۔ تفریح کے سب ہی انداز جاری تھے۔ بس ایک کمی رہ گئی تھی۔ اتوار کو چونکہ شراب خانے بھی بند ہوتے ہیں، اس لیے تفریح میں شراب نوشی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ بدمزگی کا احساس ہو رہا تھا۔ چونکہ روز اتوار ہی ہو رہا تھا اس لیے یہ بدمزگی مسلسل تھی۔

اور اس دوران میں ملک کا وزیراعظم مزے سے اپنے خوب صورت سرسبز باغیچے میں نیم دراز جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی اونگھ بھی لیتا تھا یا اپنے پالتو کتوں سے کھیل لیتا تھا۔

پھر اس کے نام ایک وائرلیس پیغام آیا، خفیہ الفاظ میں! میسجر بوائے نے اس سے ایک کاغذ پر دستخط لیے اور خفیہ وائرلیس پیغام پر مشتمل ایک لفافہ اسے تھما دیا۔

وزیراعظم نے اس کے جانے کے بعد اپنی کوڈ بک نکالی اور پیغام کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے پڑھنے کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے سیکریٹری کو طلب کیا اور اس سے پوچھا۔

''اسمتھ! آج کیا دن ہے؟''

''اتوار ہے جناب!'' سیکریٹری نے جواب دیا۔

''نان سنس!'' وزیراعظم نے کہا۔ ''میں اس بکواس سے اکتا چکا ہوں۔ اگر یہ اتوار اسی طرح طاری رہا تو ہم ایک آئینی بحران کا شکار ہو جائیں گے۔''

''آئینی بحران جناب؟''

''ہاں اسمتھ! اس لیے فوری طور پر اپنا سامان پیک کرو۔ ہم جلد از جلد شہر واپس جا رہے ہیں۔ مجھے فوری طور پر قدم اٹھانا ہے۔ میں وہاں پہنچتے ہی ایک بیان جاری کروں گا کہ ہر میجسٹی کی حکومت سرکاری طور پر اعلان کرتی ہے کہ آج اتوار نہیں جمعہ ہے اور کل ہفتہ ہوگا اور اس کے بعد ہفتے کے سات دن کسی بے قاعدگی کے بغیر ترتیب سے آتے رہیں گے جیسا کہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔''

''لیکن جناب.....! کیا آج واقعی اتوار نہیں ہے؟ کیا کسی معجزاتی اتفاق کے تحت دنوں کا بدلنا رک نہیں گیا ہے؟ اتوار ٹھہر نہیں گیا ہے؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں ہے اسمتھ! میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ بالفرض آج اتوار بھی ہو تو ہم سب جب متفقہ طور پر اسے پیر یا منگل کہنے لگیں تو وہ پیر یا منگل ہی ہو جاتا ہے، اتوار نہیں رہتا۔''

''جی ہاں جناب!''

چنانچہ سیکریٹری نے سامان پیک کیا اور وزیراعظم واپس لندن پہنچ گیا۔ اب وہ اپنے نام آنے والے تمام الٹی میٹم کا جواب دے سکتا تھا کیونکہ اب اتوار نہیں رہا تھا۔ اس نے ہر الٹی میٹم کا جواب پوری شدت کے ساتھ دیا اور ملک کے تمام اخبارات میں یہ خبر نمایاں طور پر شائع ہوئی کہ آج اتوار نہیں، جمعہ ہے اور کل ہفتہ ہوگا کیونکہ سرکاری احکامات یہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ قصبہ ایلر بی برگ میں یہ خبر اگلی صبح تک ہی پہنچ سکی جہاں سے یہ سارا ہنگامہ شروع ہوا تھا۔ وہاں بھی مسٹر بلاگز ہی کو یہ خبر سب سے پہلے ملی کیونکہ پڑھے لکھے تو وہی تھے۔ مسٹر بلاگز نے یہ خبر پڑھتے ہی مل کا سائرن بجانے کا حکم دے دیا۔ سائرن بجنے لگا اور لوگ پندرہ منٹ کے اندر اندر تیزی کے ساتھ مل میں پہنچنے لگے کیونکہ سائرن پندرہ منٹ تک بجتا رہا تھا۔ جو مزدور اس عرصے میں پہنچ نہیں سکے تھے، ان پر مل کا گیٹ بند کر دیا گیا تھا اور ان کی اس روز کی تنخواہ کاٹ لی گئی تھی۔

لیکن ابھی وہ مزدور مل کے احاطے میں ہی داخل ہوئے تھے کہ بوڑھا کاروملیے بھاگتا دوڑتا وہاں پہنچ گیا اور اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ٹھہرو! میری بات سنو۔ ذرا یہ بتاؤ کہ آج کیا دن ہے؟“

”یہ میں بتاتا ہوں تمہیں!“ مسٹر بلاگز نے اپنے دفتر کی کھڑکی سے کہا۔ ”آج ہفتہ ہے، سرکاری حکم یہی ہے اس لیے اب سب مزدوروں کو کام شروع کر دینا چاہیے۔“

”نہیں!“ کاروملیے نے کہا۔ ”کل اتوار تھا اس لیے اگر دنوں کی گردش چل بھی پڑی ہے تو آج پیر ہونا چاہیے، ہفتہ نہیں۔ اگر آج ہفتہ مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دن الٹے چل پڑے ہیں۔ اتوار کے بعد ہفتہ، پھر جمعہ...... بھلا یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟“

چنانچہ وملیے کی بات نے لوگوں کو مزید الجھا کر رکھ دیا۔ کچھ نے کہا آج ہفتہ ہے جبکہ کچھ لوگ کہتے تھے کہ منطقی لحاظ سے آج پیر ہی ہونا چاہیے۔ کچھ لوگ اب بھی مصر تھے کہ آج نہ ہفتہ ہے نہ [illegible] اتوار ہے [illegible] رہے گا۔ اس مسئلے پر ایک مرتبہ [illegible] کی جس میں کوئی کسی کو کسی ایک بات پر قائل نہ کر سکا۔

آخر ایک مرتبہ پھر سام اسمال کو بلانے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ قصبے کا بوجھ بجھکڑ تو وہی تھا۔ اسی نے پچھلی مرتبہ اپنے دلائل سے لوگوں کو قائل کر لیا تھا۔ اب بھی وہی ایسا کر سکتا تھا۔ سام اسمال کوئی نصف گھنٹے بعد آ پہنچا۔ اس نے سب فریقوں کے دعوے غور سے سنے اور پھر بڑے مدبرانہ انداز میں بولا۔ ”اب اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ......“ وہ اپنی بات پوری کیے بغیر اٹھ کر مسٹر بلاگز کے دفتر میں چلا گیا اور ٹیلیفون ریسیور اٹھا کر اس نے کہا۔ ”آپریٹر! مجھے بادشاہ سلامت سے ملا دو۔“

پلک جھپکتے میں کنکشن مل گیا۔ ”کیا ہز میجسٹی بادشاہ سلامت بول رہے ہیں؟“ سام اسمال نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”ارے سام اسمال تم؟“ بادشاہ نے اس کی آواز فوراً پہچان لی۔ ”مجھے کس قدر خوشی ہو رہی ہے تمہاری آواز سن کر! سناؤ کیا حال چال ہے سام؟“

”بالکل ٹھیک ہے یور میجسٹی!“ سام نے جواب دیا۔

”اور وہ تمہاری دبلی پتلی بیوی ڈیلی کیسی ہے سام؟“ بادشاہ نے دریافت کیا۔ بادشاہ اسی علاقے سے تعلق رکھتا تھا اور سام اسمال کسی زمانے میں اس کا دوست رہا تھا۔

”ڈیلی بالکل بخیریت ہے یور میجسٹی!“ سام اسمال نے جواب دیا۔

”اور اگر آپ برا نہ مانیں تو ملکہ معظمہ کے مزاج کیسے ہیں؟ اور شہزادی صاحبہ ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں ہاں سام! بالکل ٹھیک ہیں۔“

”مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے یور میجسٹی!“ سام اسمال نے کہا۔

”ہوں! لیکن سام...... مجھے یقین ہے کہ تم نے صرف حال چال دریافت کرنے کے لیے تو مجھے فون نہیں کیا تھا۔ نہیں اگر [illegible] کام [illegible] کے لیے [illegible] میں کہا۔

”جی ہاں یور میجسٹی! بات یہی ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ مجھے احمق نہیں سمجھیں گے۔ میں بس آپ سے صرف یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے لیے آج ہفتے کا دن کون سا ہے؟“

”ارے سام! تم نے خوب سوال کیا۔“ بادشاہ نے جواب دیا۔

”میں قدرتی کاموں میں دخل دینے کا قائل نہیں ہوں۔ بہر حال مجھے ابھی ابھی سرکاری طور پر اطلاع ملی ہے کہ آج ہفتہ ہے اسی لیے میں آج ہفتہ ہی سمجھ رہا ہوں۔“

”بہت خوب یور میجسٹی!“ سام اسمال نے جواب دیا۔ ”اگر آپ کے لیے آج ہفتہ ہے تو پھر تو بحث کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ آج یقیناً ہفتہ ہے۔ بہت بہت شکریہ یور میجسٹی!“

"کوئی بات نہیں سام!" بادشاہ نے کہا۔ "اور ہاں...... میرا جی چاہتا ہے سام کہ تم سے خوب باتیں کروں۔ تم نے اتنی مدت کے بعد مجھے فون کیا ہے۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جن پر میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔ تم لندن کب آرہے ہو؟"

"معافی چاہتا ہوں یور میجسٹی! اب میں نے سفر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ میرے جسم میں اتنی طاقت نہیں رہی۔"

"اوہ، افسوس! اچھا تو پھر تم چند دن بعد دوبارہ مجھے فون کر لینا سام! کرو گے نا؟"

گفتگو کے دوران میں مزدوروں کا ہجوم دروازے سے کان لگائے متجسس ہو کر کھڑا رہا تھا۔ مسٹر بلاگز اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے سام اسمال کو دیکھتے رہے تھے۔ اس نے ریسیور واپس رکھا تو مسٹر بلاگز جلدی سے بولے۔ "ہوں! تو بادشاہ سلامت نے کیا کہا؟"

"وہ کہتے ہیں کہ آج ہفتہ ہے۔"

"دیکھا! میں نہ کہتا تھا۔" مسٹر بلاگز فاتحانہ انداز میں [illegible]

[illegible]

ہر ایک کا یہی خیال تھا مگر یقین کسی کو بھی نہیں تھا۔ انہوں نے اس مسئلے پر غور و خوض کیا اور پھر جان برتھویٹ نے کہا۔ "واحد مشکل یہ ہے کہ مجھے یہ دن ہفتے جیسا نظر نہیں آتا۔ لگتا نہیں کہ آج ہفتہ ہوگا۔"

"لیکن سرکاری طور پر آج ہفتہ ہے۔" مسٹر بلاگز نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ان کی اس بات پر شور مچ گیا۔

سام اسمال نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کرایا اور کہا۔ "ٹھہرو دوستو! پہلے میری بات سن لو۔ چونکہ میں یہاں مل میں ملازم نہیں ہوں اس لیے کسی کی بے جا طرفداری نہیں کروں گا لیکن مجھے ایک طریقہ سوجھا ہے جس کے ذریعے تم سب آج ہفتہ ہونے کا یقین کر سکتے ہو۔"

"بھلا ہم کیسے یقین کر سکتے ہیں؟" مزدوروں نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہ تو بڑی سادہ سی بات ہے۔" سام نے جواب دیا۔

"تم سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہر ہفتے کے دن پونے بارہ بجے تمہیں ہفتے بھر کی تنخواہ ادا کی جاتی ہے چنانچہ اگر آج ہفتہ ہوا تو مسٹر بلاگز اب سے ٹھیک دس منٹ بعد تم سب کو ہفتے بھر کی تنخواہ ادا کرنے لگیں گے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا اور آج ہفتے کا دن ثابت نہ ہو سکا تو پھر یہ ثابت ہو جائے گا کہ آج اتوار ہے جو غیر معینہ عرصے تک کے لیے برقرار رہے گا۔"

مسٹر بلاگز مظلومیت بھرے انداز میں چلائے۔ "کیا بیہودگی ہے۔" انہوں نے بڑی دلیلیں دیں، بڑا روئے پیٹے مگر مزدور اپنی ہٹ پر قائم رہے کہ اگر آج ہفتہ ہے تو انہیں ہر ہفتے کے دن کی طرح آج بھی ٹھیک پونے بارہ بجے سے تنخواہوں کی ادائیگی شروع ہو جانی چاہیے ورنہ آج اتوار رہے گا اور کل بھی، پرسوں بھی بلکہ مسلسل! آخر جب مسٹر بلاگز کو اس مسلسل اتوار کی نحوست سے نجات پانے اور ترتیب وار سلسلہ [illegible] نافذ کرانے کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ طوعاً و کرہاً ہر مل مزدور کو ہفتے بھر کی تنخواہ ادا کرنے پر تیار ہو گئے۔

انہیں تنخواہیں ملتے ملتے سہ پہر ہو گئی۔ اب کام کرنے کا وقت نہ رہا تھا اس لیے وہ سب مل کر سیڑھیاں اتر کر باہر چلے۔ احاطے میں ہی بوڑھے کا پرومیلے نے انہیں روک لیا اور کہا۔ "دوستو! سوال یہ ہے کہ اگر آج ہفتہ ہے تو کل کون سا دن ہوگا؟"

"کل اتوار ہوگا۔" سب لوگ چلائے۔

"واہ! کتنا مزا آئے گا۔" ومیلے نے کہا۔ "کل پھر ہم سب لمبی تان کر سوئیں گے...... اور ہاں اگر پرسوں میں تم لوگوں کو جگانے نہ آیا تو سمجھ لینا کہ اتوار پھر ٹھہر گیا ہے۔ دونوں کی گردش کسی معجزاتی حادثے کے تحت رک گئی ہے۔"

☆☆

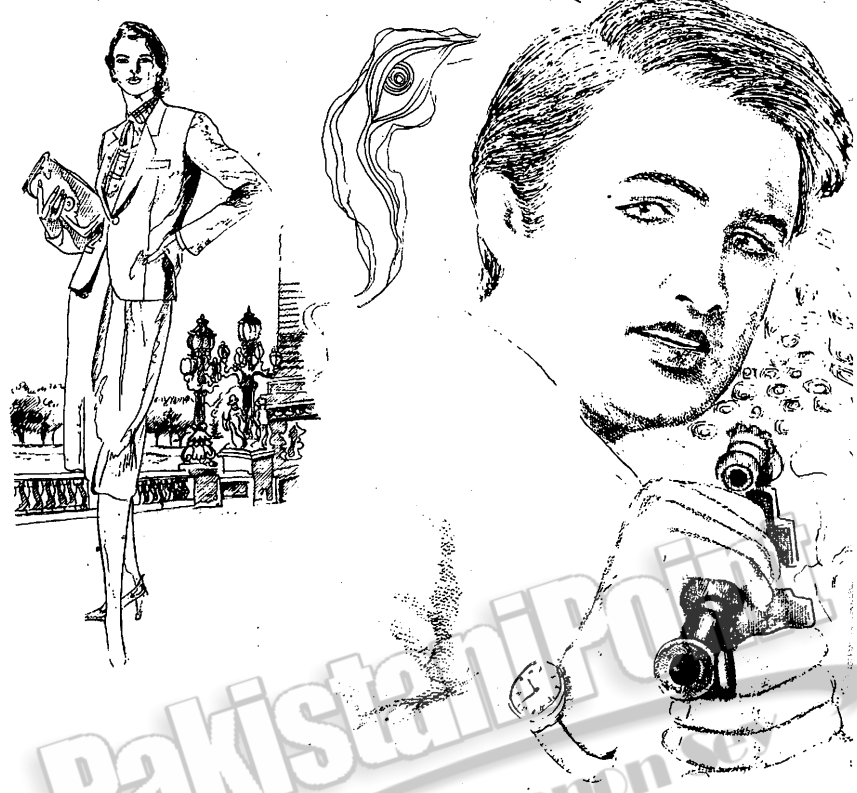

ایک کروڑ سونے کا مطالبہ کوئی معمولی مطالبہ نہ تھا

کیریکٹر بڑا زندہ دل اور رودار تھا۔ اور دنیائے جرائم کا خطرناک ترین محرم تھی۔ جس نے سراغ رساں زاھد کے ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔

آپ کے پسندیدہ قلم کار قانون داں ڈاکٹر لطف محمد

وہ کروڑ پتی تھا لیکن اپنی انا اور خودداری بالائے طاق رکھ کر اسے اس کالونی کا رُخ کرنا پڑا تھا.

رات کے دس بج رہے تھے، آسمان ابر آلود تھا اور ہلکی ہلکی بوندا باندی کے ساتھ ساتھ چمکتی ہوئی بجلیوں کا زور زیادہ تھا۔ اس کی قیمتی امپالا کار تیزی سے سڑکوں پر دوڑ رہی تھی. وہ کار خود ڈرائیو نہیں کیا کرتا تھا لیکن آج اس نے ڈرائیور کو ـــ ساتھ چلنے کے لئے منع کر دیا تھا اور ایک سیل بند لفافہ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"اگر میں دو گھنٹے کے بعد واپس نہ آسکوں تو تم اس کو پولیس اسٹیشن پہنچا دینا۔"

ڈرائیور اس کے وفاداروں میں سے ایک تھا. وہ اس کے مزاج سے بھی بخوبی واقف تھا اس لئے اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا.

موسم کی خرابی نے شاہراہوں کی چہل پہل ختم سی کر دی تھی۔ شاہراہیں اسے اپنے چہرے کی طرح اداس اور ویران محسوس ہو رہی تھیں۔

اس نے اپنی قیمتی خوبصورت کار ڈیفنس کالونی کے پچھلے حصّے میں ایک درخت کے نیچے روک کر اس کا انجن بند کر دیا. کار سے نکل کر اس نے اپنے کوٹ کی جیب ٹٹولی تو اس کا ہاتھ کانپنے لگا. کیونکہ اس نے آج تک ریوالور کا استعمال نہیں کیا تھا جب کہ خود حفاظتی کیلئے اسے ہمیشہ اپنی جیب میں لئے پھرتا تھا.

کالونی کا عقبی حصّہ گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا. کار کے شیشے چڑھا کر اسے مقفل کرنے سے پہلے اس نے ٹارچ بھی نکال لی ۔ اور اس کے بعد وہ اندھیرے میں چل پڑا۔ اسے یہ اندھیرا اپنی روح میں اُترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور دل کی تیز تیز دھڑکنیں کنپٹیوں میں سنائی دے

دی تھیں۔

وہ چوتھے نمبر کے بنگلے پر پہنچکر رُک گیا۔ بنگلے کا یہ عقبی حصہ بھی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔

مجھے وہی کرنا چاہیئے جو فون پر کہا گیا تھا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا اور پھر اس نے ٹارچ کا رُخ بنگلے کی پہلی منزل کی طرف کرکے اُسے تین مرتبہ جلایا اور بجھایا۔ اس کے بعد سے انتظار کرنا تھا۔

تقریباً ایک منٹ کے بعد دروازہ کھلا

"لیس کم ان"

وہ عقبی دروازے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد وہی مردانہ آواز اسے دوبارہ سنائی دی۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے مسٹر مہرہ"

وہ اندھیرے میں اس کے پیچھے چلتا ہوا ایک کمرے میں پہنچا۔ اسی کمرے سے زینہ اوپر کی طرف گیا تھا اور زینے پر مدھم روشنی سی تھی۔ لیکن کمرے میں اندھیرا ہی تھا۔

"آپ اوپر آجایئے۔ زینہ ختم ہونے کے بعد کھلنے ہوئے دروازے والا پہلا کمرہ آپ کا منتظر ہے۔ میں وہاں آپ کی خدمت میں فوراً ہی حاضر ہوا چاہتا ہوں"

مہرہ نے جواباً کچھ نہ کہا۔ وہ زینے کی سیڑھیاں طے کرتا رہا۔ لیکن اس شخص کے متعلق بھی سوچتا رہا کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ وہ اردو تو روانی سے بول رہا تھا لیکن اس کا لب و لہجہ اس امر کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ یقیناً کوئی غیر ملکی ہے۔

زینہ طے کرنے کے بعد مہرہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں ہلکی سی سبز روشنی ہو رہی تھی۔ کمرہ خاصہ کشادہ تھا اس وجہ سے کمرے کی ہر چیز غیر واضح تھی۔

پھر اچانک کمرہ تیز روشنی میں نہا گیا۔

مہرہ تیزی سے پلٹا تو دروازے کے قریب ایک ٹھگنے قد کا دبلا پتلا شخص کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ اور چندھیائی ہوئی آنکھوں میں غضب کی مکاری اور سفاکی جیسے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو۔ اس نے چرمی جیکٹ اور لانگ کلاتھ کی نیلی پینٹ پہن رکھی تھی۔

"کیا تم نے ہی مجھے آنے کے لئے فون کیا تھا۔؟" مہرہ نے اپنی آواز میں سختی پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں مسٹر بھگوان پرکاش مہرہ۔ لیکن آپ یوں کھڑے ہوئے ہیں تو مجھے اپنے پیر درد کرتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں، تشریف رکھیئے"

"کیا نام ہے تمہارا۔ اور وہ کون سا اہم راز ہے جو تم مجھے بتانا چاہتے ہو۔؟" وہ وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ شخص بھی سامنے بیٹھ کر اطمینان سے سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔

"مسٹر مہرہ، بھگوان کا دیا آپ کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ آپ اس ملک کے بیسیوں بڑے سرمایہ داروں میں۔ ملک میں جانے کتنے پلانٹ اور کارخانے آپ کی ملکیت ہیں، میرا اندازہ یہ ہے کہ اس وقت صرف آپ کی تجوری میں ایک کروڑ سے زیادہ کا سونا موجود ہے۔ کیش کی بات میں نہیں کرتا۔ وہ آپ کی دوسری تجوریوں کے علاوہ بنکوں میں بھی محفوظ ہے۔ آپ اس ملک کے اہم آدمیوں میں سے ایک ہیں۔ پارلیمنٹ پر آپ کا اثر ہے۔ کیونکہ آپ کے روپے پیسے سے انتخابات جیت کر پارلیمنٹ میں پہنچنے والوں کی تعداد کم نہیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ آپ نے اس لڑکی سے گذشتہ سال شادی کی جو حسن کے بین الاقوامی مقابلے میں دوسرے نمبر پر اور آپ کے اپنے ملک میں پہلے نمبر پر آئی"

"کیا یہی بتانے کے لئے تم نے مجھے فون کیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر میں تنہا یہاں نہیں آیا تو بازی خطرناک حد تک الٹ جائے گی اور پھر شاید مجھے خودکشی کرنی پڑے"

"مرد کی زبان ایک ہوتی ہے۔ میں نے ایسا ہی کہا تھا"

"اپنے مقصد پر آجاؤ" مہرہ کا لہجہ تلخ تھا۔

"مسٹر مہرہ میں کیسی نرمی اور شرافت سے بات کر رہا ہوں آپ آپ کہتے کہتے میری زبان سوکھ رہی ہے لیکن آپ کا لہجہ غیر شائستہ ہے"

"جب تم میرے متعلق سب کچھ جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں دنیا کے مصروف ترین انسانوں میں سے ایک ہوں۔ دوسرے اپنے برابر کے لوگوں سے ملنا پسند کرتا ہوں۔ تم سے ملنے چلا آیا یہی کیا کم تمہاری عزت افزائی ہے جو تم میرے لہجے اور طرز تخاطب کی شکایت کر رہے ہو"

بات یہ ہے مسٹر مہرہ کہ میں بھی دنیا کے مصروف ترین لوگوں میں سے ایک ہوں۔ ہمیشہ میں بھی اپنے برابر والوں سے ملنا جلنا پسند کرتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ میری سطح پر مجھ سے ملنے والے دنیا کے خطرناک ترین جرائم پیشہ ہوتے ہیں یا اتنے ہی ذہین میرے دشمن"

مہرہ بُری طرح چونک پڑا کیونکہ اس شخص کی مسکراہٹ انتہائی زہریلی تھی اور چندھیائی ہوئی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی سفاکی نے خود اس کے اپنے جسم میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی۔

"تمہارا نام کیا ہے۔؟"

"لوگ اس خاکسار کو ردمی کے نام سے جانتے ہیں"

مہرہ یوں اچھل پڑا جیسے نیچے سے کسی بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔

وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"دنیا بھر کے اہم ترین اور سرمایہ دار لوگوں کے پاس بین الاقوامی خطرناک مجرموں کے ناموں کی ایک لسٹ رہتی ہے یہاں کے سرمایہ داروں کے پاس ہے یا نہیں لیکن دیگر ممالک میں ضرور رہتی ہے اگر آپ کے پاس ایسی کوئی لسٹ ہو تو دیکھ لیجیئے اس میں میرا نام سرفہرست ہوگا"

"میرے پاس ایسی کوئی لسٹ نہیں ہے لیکن برسوں پہلے میں

نے یہ نام سُنا تھا۔“

”مجھ خاکسار کو آپ نے یاد رکھا۔ اس کے لئے شکریہ۔ اب میں اصل مقصد کی طرف آنا چاہتا ہوں۔“

مہرہ کی نگاہیں اسے گھور رہی تھیں۔

”میں گذشتہ دس برسوں سے تبت اور وہاں کی گمشدہ خانقاہوں میں بھٹکتا رہا ہوں۔ سچ پوچھئے تو دُنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ وہاں مجھے ہزاروں سال پُرانے خزانوں کی تلاش میں سرگرداں رہنا پڑا۔ خزانے تو ابھی تک ہاتھ نہیں لگ سکے لیکن وہاں عجیب و غریب حالات کا سامنا ضرور کرنا پڑا۔ خیر۔ تو میری تنظیم سے متعلق لوگ میری واپسی پر اس بات کے منتظر ہوں گے کہ میں ان کے لئے ڈھیروں ہیرے، جواہرات اور منوں سونا لے کر آؤں گا، وہاں میرا کام جاری ہے۔ تاہم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکا ہوں۔ اس لئے وہاں سے میں سیدھا ادھر نکل آیا۔ دنیا دیکھنے کی تمنا بھی دل میں زوروں سے انگڑائی لے رہی تھی۔ جیسے ایک دولہا کے دل میں نئی نویلی دلہن انگڑائی لیتی رہتی ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔“

”جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، رومی مر چکا ہے۔ تم مجھے غیر ضروری باتوں میں الجھانے کی کوشش مت کرو۔“

رومی نے تیکھی اور خطرناک آواز میں کہا۔

”میں جو بھی ہوں، سامنے ہوں، ہاں تو جناب کیا فیصلہ کیا۔؟“

اچانک اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور چہرہ خوفناک ہو کر رہ گیا۔!

”کیسا فیصلہ۔؟“

”ایک کروڑ کا سونا۔“

”ناممکن۔“ وہ اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ریوالور کا رُخ اس کی طرف کر دیا۔

رومی، مہرہ غرایا ”جب چیونٹی کی موت آتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں۔“

”بے شک۔“ اس نے سعادت مندانہ انداز میں گردن ہلائی ... اور جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رُخ کرتا ہے۔“ تبت کے برفیلے میدانوں اور زمین دوز خانقاہوں سے بھاگ کر میں اس خوبصورت شہر میں اسی لئے آیا ہوں لیکن میں نہ چیونٹی ہوں اور نہ گیدڑ۔“ پھر اس نے تنے ہوئے ریوالور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ سانپ بچھو بندر کا کھیل میرے لئے بچوں کا تماشا ہے۔“

”تم مجھے باتوں سے مرعوب نہیں کر سکتے رومی۔“

”میں تمہیں کیسے مرعوب کر سکتا ہوں، یہ خوب جانتا ہوں۔“

”تم اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں سانس لے رہے ہو۔“ مہرہ نے غراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”جسے دنیا کے بڑے بڑے سیکرٹ ایجنٹ ٹھکانے نہیں لگا سکے۔ اسے میں کتے کی موت مارنے جا رہا ہوں۔“ اس نے ٹریگر پر دباؤ ڈالا۔

”ٹھہرو۔“ وہ ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ”ریوالور سے جھٹ پٹ کر کے فیصلہ کر لو۔ میں اپنی جگہ سے نہیں ہلوں گا۔ تم مجھ پر فائر کر دینا اور اس سے بھی میں نہ مر سکوں۔ تب یہ سمجھ کر کہ تم بازی ہار چکے، میری مان لینا۔ ایک بات اور سُن لو مہرہ۔ میں ابھی تک بڑے ادب سے پیش آرہا تھا۔ تم نے ریوالور تان کر مجھے بے ادب بنا دیا۔ اس لئے میں آپ سے تم پر آ گیا ہوں۔ اگر بات آگے بڑھی تو مجھ پر الزام مت لگانا کہ میں بے ہودگی اور ذلالت کی حدوں میں داخل ہو گیا ہوں۔“

مہرہ اس کی مستقل مزاجی دیکھ کر گھبرا گیا اور اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اسے فوراً شوٹ کر دے۔ چنانچہ اس نے ریوالور کی نال خفیف سی اونچی اُٹھا دی۔

وہ۔“ رومی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ بکھر گئی ”تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں نے جیکٹ کے نیچے بلٹ پروف پہن رکھا ہے اس وجہ سے تم میری کھوپڑی کو نشانہ بنانا چاہتے ہو لیکن میں جیکٹ اتار کر تمہیں دکھاتا ہوں کہ ...“

”نہیں ... اپنے ہاتھ مت اُٹھاؤ ... ورنہ اس دنیا سے اُٹھتے وقت تمہارے ہاتھ بھی اُٹھے کے اُٹھے رہ جائیں گے۔“

اور مہرہ نے پہلا فائر کر دیا۔ دوسرا اور تیسرا بھی یکے بعد دیگرے اس نے تین مرتبہ ٹریگر دبایا۔ رومی اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں اور مہرہ کا ریوالور ایک مرتبہ بھی آگ نہیں اُگل سکا۔

مہرہ کی کنپٹیوں سے پسینہ بہنے لگا جب کہ رومی کے دبے دبے قہقہے بلند ہوتے جا رہے تھے۔

”تم ہار گئے مہرہ۔ اب وہ ایک کروڑ کا سونا میرے حوالے کر دو۔“

”کسی قیمت پر نہیں ... اور تم یہ کیسے کہہ رہے ہو کہ میرے پاس اتنا سونا ہے۔؟“

رومی آگے بڑھنے لگا اور مہرہ خوفزدہ ہو کر پیچھے سرکنے لگا۔

جب ایسے نازک موقع پر تمہارا ریوالور تمہیں دھوکہ دے سکتا ہے تو وہ انسان بھی دھوکہ دے سکتے ہیں جن پر تمہیں اپنی ہی طرح اعتماد ہے۔“ وہ بیل باٹم کی جیبوں میں ہاتھ داخل کرتے ہوئے بولا۔

”جب تم اس بنگلے میں داخل ہوئے تھے اس وقت اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر میں نے تمہارا ریوالور نکال لیا تھا ... جب تم نے کمرے میں قدم رکھا تھا۔ اس وقت میں تمہارا ریوالور تمہارے کوٹ کی جیب میں پہنچا چکا تھا ... پانچوں گولیاں میری جیب میں ہیں۔“

”اس کے باوجود بھی تم اپنی بات مجھ سے نہیں منوا سکتے۔ میں جا رہا ہوں آئندہ مجھ سے دُور رہنے کی کوشش کرنا۔ ورنہ میرے آدمیوں میں انتہائی خطرناک لوگ بھی ہیں جو تمہیں کتے بلی کی طرح مار پھینکیں گے ...“

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"میں جانتا ہوں حقیقت تسلیم کر لینا ہی انسان کا بڑا پن ہے تمہیں مجھ سے اتنا خوف زدہ ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ اگر میں نے تمہیں مار ڈالا تو ایک کروڑ روپے کا سونا بھلا کیسے میرے ہاتھ لگے گا؟"

"چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے تمہیں کچھ نہیں مل سکتا۔"

"اچھا۔" وہ مسکرایا اور تیزی سے آگے بڑھا اور اچھل کر اپنے دونوں پیر مہرہ کی جانگھوں پہ دے مارے۔

مہرہ چیختا ہوا الٹ کر ایک صوفے پر گرا۔

"اٹھو۔" رومی کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ "اٹھو ورنہ میں یہیں تمہیں زندہ درگور کر دوں گا۔"

وہ اٹھ بیٹھا۔

"تمہیں پوری آزادی ہے کہ بچاؤ کے لئے مجھ پر حملہ کر دو۔۔۔ میں انصاف پسند ہوں۔"

جواباً مہرہ نے اس کا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ایک زوردار گھونسہ مارا لیکن وہ اسے بچا گیا۔ البتہ وہ گھونسہ اس کے کاندھے پر پڑا۔ الٹے مہرہ کے حلق سے ہی گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی کیونکہ اسے ایسا لگا جیسے سوکھی ہوئی سخت اور چبھتی ہوئی لکڑیوں پر پوری طاقت سے گھونسہ دے مارا ہو۔

وہ بری طرح اپنا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔

کوئی اور تمنا ہو تو وہ بھی نکال لو۔ یہ تمہارے لئے آخری موقع ہے۔"

مہرہ اسے گھورتے ہوئے بولا "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ میرے ساتھ اس قسم کی غنڈہ گردی کی جائے گی تو میں نہیں آتا۔"

"میں غنڈہ گردی خود بھی پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ خود بھی ایک شریف اور امن پسند انسان ہوں۔ آؤ ہم سمجھوتے کے آخری دروازے میں داخل ہو جائیں۔" وہ دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھتے ہوئے بولا۔

"مطلب۔؟"

"مطلب یہ کہ ہم سمجھوتے کے ایک ہی دروازے تک پہنچ گئے۔ چوکیدار ہیں ادھر میرے بستر پر نگاہ ڈالو۔ وہاں تمہیں میری بات کا جواب مل جائیگا۔"

مہرہ نے بستر کی طرف دیکھا۔ پھر وہ چونک پڑا جیسے اس کے سر پر آسمان پھٹ پڑا ہو۔

بستر پر ایک ہیرا ٹاؤ نیکلس پڑا ہوا تھا۔ نیکلس کے ہیرے جگمگا رہے تھے۔

"تمہاری سب سے چہیتی لڑکی انجو مہرہ تمہاری آمد سے ایک گھنٹے قبل اسی بستر پر تھی۔ میں نے اس ہار کا ہک آسانی سے کھول دیا تھا تو یہ بستر پر پڑا رہ گیا۔"

وہ کسی پتھر کے بت کی طرح پتھرایا ہوا سا اس ہار کو دیکھتا رہا۔

"یہ ناممکن ہے۔" وہ دفعتاً چیخ اٹھا "اس ہار کو چرا کر تم نے یہاں ڈال دیا ہے۔"

"اس ہار میں اس کا ایک لمبا گھنگھریالا بال بھی الجھ کر رہ گیا ہے"

"اکثر جرائم پیشہ بلیک میل کا دھندہ کرتے ہیں لیکن اتنا گھٹیا اور گھناؤنا نہیں۔"

اتنا کہہ کر مہرہ نے ریوالور اس کے سر پہ دے مارا، لیکن اس سے پہلے ہی رومی نے اپنے گھٹنے کا زوردار وار کر دیا۔ مہرہ پیٹ پکڑ کر دوہرا ہوتا چلا گیا۔

"دولت کے نشے میں تمہیں اپنی اولاد کی تربیت کا بھی احساس نہیں رہا۔ بلکہ الٹے تم نے اپنی لڑکی کی عمر والی حسینہ سے دوسری شادی کرا ڈالی۔ میں نے یہاں تمہیں اسی لئے بلایا تھا کہ وہ باتیں تمہارے علم میں لے آؤں جن کا علم تمہیں نہیں۔ سنو مسٹر مہرہ۔ تمہاری انجو انتہائی آزاد خیال لڑکی ہے۔ اسے نشے کی لت پڑ گئی ہے۔ وہ اس حد تک بگڑ گئی ہے کہ اس کی بلیو پرنٹس مغربی علاقوں میں دکھائی جا رہی ہیں ثبوت کے لئے میرے پاس ایسی تین فلمیں ہیں۔ مغربی ممالک میں یہ کوئی نہیں جانتا کہ ان بلیو پرنٹس کی او باسفل ہیروئن کس کی لڑکی ہے۔ یہ صرف میں جانتا ہوں۔"

رومی اتنا کہہ کر رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔

مہرہ کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔

"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تمہاری بدنامی نہ ہو اور وہ ایک کروڑ کا سونا مجھے مل جائے۔۔۔ بولو سودا منظور ہے۔"

اگر تمہارا بیان درست ہے تو میں تمہیں ایک لاکھ روپیہ ان تینوں فلموں کے لئے دے سکتا ہوں۔ تم مجھے انہیں معہ نیگیٹو کے لوٹا دو اور ایک لاکھ روپیہ تمہیں ہمیشہ کے لئے اپنی زبان بند رکھنے کے لئے دے سکوں گا۔"

"بستر پر پڑا ہوا یہ ہار دو لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا ہے اب تم جا سکتے ہو۔ کل شام تک فیصلہ کر لو۔ یا تو میں خود تم سے ملاقات کروں گا یا فون پر بات ہو جائے گی۔"

مہرہ نے ہار اٹھا لینا چاہا لیکن رومی نے اسے روک دیا۔

"اسے میرے پاس ہی رہنے دو۔ یہ مان کر چلو کہ یہ تمہاری جیب میں ہی ہے۔ آؤ میں تمہیں نیچے تک چھوڑ آؤں۔"

مہرہ کا وجود کانپ اٹھا تھا۔ اس نے کبھی توقع بھی نہیں کی تھی کہ اس کی لڑکی اتنی گر سکتی ہے۔

مجھے تم سے ہمدردی ہے مسٹر مہرہ۔ لیکن میری اپنی مجبوریاں ہیں اور پھر تم جیسے بڑے آدمیوں کے لئے ایک کروڑ کا سونا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔۔۔ اہمیت رکھتا ہے تو انجو کی بدچلنی کا معاملہ۔ ذرا دیر میں بات آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ پھر تم منہ دکھانے کے لائق نہیں رہو گے۔

وہ اسے کار تک رخصت کرنے آیا۔

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

گاڑی سنبھال کر چلانا۔ میرا مطالبہ معمولی سا مطالبہ ہے۔ اس مطالبے سے خوفزدہ ہو کر اگر تم نے ذہنی توازن بگاڑ لیا تو کہیں بھی ایکسیڈنٹ کر بیٹھو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم جیسا قیمتی انسان کتے کی موت مر جائے اور تمہاری بے پناہ دولت تمہارے کام نہ آسکے۔"

مہرہ نے کار اسٹارٹ کر دی

"مجھے انتہائی افسوس ہے کہ میں تمہاری خاطر مدارت نہیں کر سکا صرف چوبیس گھنٹوں کے لئے یہ بنگلہ کرائے پر لیا تھا۔ میرا اپنا گھر ہوتا تو تمہیں بہترین قسم کی چینی شراب پیش کرتا۔ اور ہاں یاد آیا میرے خلاف قانون کی مدد لینا اپنی موت کو آپ دعوت دینا ہوگا۔ وش یو بیسٹ آف لک، گڈ نائٹ مسٹر مہرہ۔"

مہرہ نے کار بڑھا دی۔

رومی اس وقت تک کار پر نظر جمائے رہا جب تک وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اس کے بعد وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"ابھی تو شروعات ہے مسٹر مہرہ جس کا واسطہ رومی سے پڑ جاتا ہے وہ موت کو ترجیح دینا زیادہ پسند کرتا ہے۔"

کرنل زاہد باہر جا رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ فون ملٹری سیکرٹ سروس کے چیف جنرل کیو سے رابطہ قائم کرنے کے لئے تھا۔ اس کا استعمال صرف اس وقت ہوتا تھا جب زاہد کو جنرل کیو سے بات کرنی ہوتی تھی۔ یا جنرل کیو کو اس سے۔ زاہد نے فون اٹھا لیا۔

"زاہد اسپیکنگ سر۔"

"کہیں جا رہے تھے؟" جنرل کیو کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔

"جی ہاں۔"

"عنقریب ہمارا ایک پوسٹ مین تم تک پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہیں ایک لفافہ دے گا۔ اسے پڑھ لینا۔ ہر بات اور ہر پہلو پر غور کر لینا۔"

"کوئی خاص بات؟"

"ہم لوگ معمولی باتوں میں الجھتے کب ہیں۔ مجھے وزارت داخلہ کے سیکرٹری نے کہا کہ میں فوری طور پر کوئی قدم اٹھاؤں۔ مجھے یہ بھی حکم ملا ہے کہ بات ذرا ابھی نہیں پھیلنا چاہیئے۔ کیس کی نوعیت جان لینے کے بعد میں صرف تمہیں ہی اس کام کے لئے منتخب کر سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم سب کچھ سنبھال لو گے۔"

"کوئی اہم ترین سرکاری کیس ہے؟"

"انتہائی اہم لیکن مالیت کے اعتبار سے۔ یہ میں نہیں جانتا کہ حکومت کا اس سے کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ بظاہر یہ ایک V.I.P کا ذاتی معاملہ ہے وہ V.I.P ملک اور حکومت دونوں کے لئے سودمند ہے۔ اس کی کوششوں سے ہمارے یہاں کئی اہم ترین پروجیکٹس میں غیر ممالک کا اربوں ڈالر کا سرمایہ لگ سکا ہے۔ اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو۔

"جہاں تک ممکن ہو اس کیس کو اپنے آپ تک محدود رکھ... مجبور ہو جاؤ تب ہی کیپٹن جاوید یا سیما وغیرہ کی مدد لینا۔"

ادھر سے رابطہ منقطع ہو گیا اور ادھر کال بیل بج اٹھی۔ ملا... روک کر زاہد خود ہی دروازے پر پہنچا۔ آنے والا پوسٹ مین کے ... میں تھا، اس نے جھک کر ادب سے سلام کیا اور ایک لفافہ د...

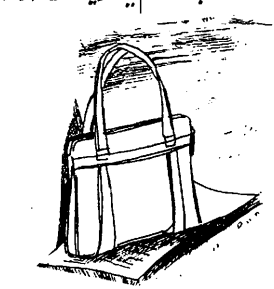

نئی تیکا

عمران ڈائجسٹ کے مقبول ترین سلسلوں میں سے ایک اور زبردست سلسلہ

ایک دل ہلا دینے والے سفر کی حیرت انگیز داستان

ایک لاابالی اور حساس نوجوان کی آپ بیتی،

اس کا سفر جاری تھا کہ ایک رات قیام کے دوران اُسے عجیب و غریب حلیے کا ایک بوڑھا نظر آیا۔ اور پھر۔۔؟

قدم قدم پر رونگٹے کھڑے کر دینے والی ایک عجیب کہانی

ایک حصے میں مکمل

قیمت، روپے، ڈاک خرچ روپے

منگوانے کا پتہ،

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

۳۷، اردو بازار ـــــ کراچی

چلا گیا۔

اسٹڈی میں زاہد نے لفافہ کھول کر پڑھا۔

"بھگوان پرکاش مہرہ کا نام تم نے سُنا ہو گا۔ تمہیں ان سے ملنا ہے کیوں کہ دنیا کا ایک خطرناک ترین مجرم رومی انہیں بلیک میل کرنا چاہتا ہے وہ ایک کروڑ روپے کی مالیت کا سونا ان سے طلب کر رہا ہے کیا یہ اس صدی کی سب سے بڑی اور چونکا دینے والی سازش نہیں ہے۔؟

مسٹر مہرہ کا فون نمبر اور پتہ نیچے لکھ رہا ہوں۔ شناخت کے لئے "سنہری آفت" بتا دینا۔" جنرل کیو

زاہد نے فون نمبر اور پتہ ذہن نشین کرنے کے بعد جنرل کیو کا پیغام لائٹر کی نذر کر دیا۔ اس کی آنکھیں مخصوص انداز میں چمک اٹھیں۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے مہرہ کے نمبر ڈائل کئے۔

"ہیلو۔ میں رینا مہرہ بول رہی ہوں۔" ایک کھنکتی ہوئی خوبصورت آواز سنائی دی۔

"مجھے مسٹر بھگوان داس مہرہ سے بات کرنا ہے۔"

"آپ کا نام۔؟"

"انہیں فون پر بلا دیجئے یا انہیں فون دے دیجئے۔"

"میں نام پوچھ رہی ہوں۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"اگر میں نے نام بتا دیا تو آپ پوچھیں گی کیا کام ہے۔"

"آپ ڈھنگ سے بات کیجئے ورنہ میں رابطہ منقطع کر دوں گی۔"

"میڈم میرا اپنا ایک اصول ہے۔ میں جس سے رابطہ قائم کرنا چاہتا ہوں اگر وہ تیس سیکنڈ تک لائن پر نہ آئے تو میں فون رکھ دیتا ہوں۔"

اور زاہد نے رابطہ منقطع کر دیا کیوں کہ اچانک اسے خیال آ گیا کہ ممکن ہے مہرہ کے فون ٹیپ کئے جا رہے ہوں۔

پھر وہ دیر تک رومی کے متعلق سوچتا رہا۔ اس نے بہت پہلے یہ چونکا دینے والا نام سُن رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رومی کو یہ شبہ بھی ہو سکے کہ مہرہ نے کسی قسم کی مدد حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پیر مارے ہیں۔

کوئی ایک گھنٹہ کے بعد کرنل زاہد ایک ٹیکسی میں بیٹھا ہوا رینا پیلس جا رہا تھا۔ زاہد نے معمولی سی میک اپ کے سہارے اپنی تمام تر شخصیت کو تبدیل کر لیا تھا۔ ایک نظر دیکھے جانے پر وہ ہالی وڈ کا کوئی ہیرو دکھائی دے رہا تھا۔

اسے رینا پیلس پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگ گیا۔ شہر کی گنجان آبادی سے دُور کئی ایکڑ زمین پر دُور دُور تک سرسبز درختوں اور پھولدار پودوں کے درمیان سنگِ مرمر کی وہ خوبصورت سہ منزلہ عمارت بڑی پرکشش دکھائی دے رہی تھی۔

رینا محل کے صدر دروازے پر مسلح گارڈ کا پہرہ تھا۔ ایک گارڈ اس کے ساتھ محل کے دروازے تک گیا۔ وہاں دائیں جانب کے کمرے میں اسے بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک ادھیڑ عمر کا خرانٹ شخص کمرے میں داخل ہو گیا۔ سر کے بال مڑے ہوئے، آنکھیں چوکنا اور طوطے جیسی ناک کے اوپر ٹکا ہوا چشمہ اس کی شخصیت کا اہم حصہ تھا۔

"آپ کا نام۔؟ کیا آپ کو ملاقات کا وقت دیا گیا تھا۔؟ اور اگر دیا گیا تھا تو میری ڈائری میں نوٹ نہیں ہے۔"

"آپ کے تمام سوالوں کا صرف ایک جواب ہے۔ میں خود نہیں آیا ہوں، بلکہ بلوایا گیا ہوں۔ میں دو منٹ تک انتظار کروں گا۔"

زاہد نے ریسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "تیسرے منٹ کی شروعات پر لوٹ جاؤں گا۔" زاہد کا لہجہ سخت اور تیکھا تھا۔

اس نے زاہد کو گھور کر دیکھا اور چونک پڑا۔ پھر وہ تقریباً دوڑ لگانے جیسے انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

واپسی پر وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

"میں ڈیڑھ منٹ میں لوٹ آیا ہوں۔"

زاہد نے اسے سخت نگاہوں سے دیکھا۔ گھڑی دیکھی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ تقریباً تیس قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک طویل و عریض کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ انتہائی خوبصورت ہونے کے علاوہ بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ تھا۔

کمرے کے سامنے ہی ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر کے شخص کو دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ وہی بھگوان پرکاش مہرہ ہو گا۔ اس کے دائیں جانب ایک انتہائی جمیل و حسین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی عمر مشکل سے بیس بائیس سال ہو گی۔ تیسرا ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص بھی تھا، مہرہ کی عمر کا۔ تقریباً پینتالیس سال سے اڑتالیس سال کے درمیان۔ وہ ایک سِکھ تھا۔ زاہد کو دیکھتے ہی اس نے سیاہ شیشوں کا چشمہ لگایا۔

"اگر میں سمجھنے میں غلطی نہیں کر رہا ہوں تو۔" مہرہ نے اٹھ کر اس کا استقبال کرتے ہوئے اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔

"آپ ٹھیک نتیجے پر پہنچے۔"

زاہد وہیں بیٹھ گیا۔ اسی وقت وہی شخص پھر آیا۔

"جناب!" اس نے جھک کر مؤدبانہ انداز میں مہرہ سے کہا۔ "ایک عجیب پراسرار شخص آیا ہے۔ اس نے ڈھیروں کپڑے اپنے جسم پر پہن رکھے ہیں۔ لباس پر مختلف پرندوں کے پر چسپاں ہیں۔ وہ فوراً آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

مہرہ کی آنکھوں میں شدید اُلجھن دکھائی دی جب کہ وہ خوبصورت لڑکی دل کھول کر ہنس پڑی۔ مہرہ نے معنی خیز انداز میں زاہد کی طرف دیکھا۔

"اس کا نام۔" مہرہ نے پوچھا۔

"اللہ میاں کا چھوٹا بھائی کلّا میاں بتاتا ہے۔"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"وہاٹ ۔۔؟" وہ غرّایا۔

"جناب اس میں میری غلطی نہیں۔"

"بلا لیجیے ۔" وہ لڑکی بولی۔

ملازم چلا گیا۔

واپسی میں اس کے ہمراہ کمرے میں داخل ہونے والے شخص کا لباس ویسا ہی تھا۔ چہرے پر گھنی داڑھی مونچھیں تھیں۔ انداز لاابالی اور قلندرانہ ضرور تھا لیکن اس نے آتے ہی مہرہ کو تین فرشی سلام جھاڑے۔

"بیٹھیے ۔"

"شکریہ ۔" وہ مہرہ کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور درمیانی میز پر اپنی دونوں ہتھیلیاں پھیر کر اس کی چکناہٹ کا جائزہ لینے کے بعد ایک ایک کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی بری طرح کھل کھلا کر ہنس رہی تھی۔ مہرہ نے اسے تیکھی نگاہوں سے دیکھا تو اس نے اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"جناب کا تعارف ۔؟" مہرہ اسے چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"اللہ میاں کا چھوٹا بھائی کلّا میاں!"

"کوئی کرشمہ ۔؟"

"فرمایئے ۔؟" اس نے تڑسے کہا۔

"آپ کے بائیں طرف بیٹھے ہوئے صاحب کی ایک آنکھ حادثے میں ضائع ہو چکی ہے۔ اسے دوبارہ اصلی حالت پر لا دیجیے۔"

"یہ کام بڑے بھائی صاحب کا ہے۔ میرا کام صرف بگاڑنا ہے۔ آپ کہیں تو ان کی دوسری آنکھ بھی پھوڑ دوں۔"

وہ سب بری طرح ہنس پڑے۔ چند لمحات کے بعد اس لڑکی نے پوچھا:

"جناب آپ کے یہاں آنے کا مقصد ۔؟"

"سمندر سے موتی نکالنا ۔۔ بے عقلوں کو عقل کی راہ دکھانا یعنی ملنے اس کی مٹی پلید کرنا۔ تم ابھی بچی ہو، ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔" پھر وہ مہرہ سے مخاطب ہوا۔ "حکم اللہ کا، ملک عوام کا اور محل میں حکومت آپ کی ۔ فقیرانہ آیا ہوں اور صدا کر کے لوٹ رہا ہوں ۔۔ اگر اللہ میاں کو یاد نہیں رکھ سکتے تو کلّا میاں کو ضرور یاد رکھنا۔ کلّا میاں کا کام بنانا نہیں بگاڑنا ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے جیب سے دیاسلائی کی ایک ڈبیہ نکالی۔

"ٹھیرو کلّا میاں۔" زاہد نے تیزی سے کہا اور تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن کلّا میاں نے دیاسلائی کی جلتی ہوئی تیلی میز پر گرا دی تھی۔

میز پر ایک شعلہ بھڑکا۔ اس کی روشنی اتنی تیز تھی جیسے ایک ساتھ کئی بجلیاں کوند گئی ہوں۔ وہ سب چیخ کر الٹ پڑے۔ شعلہ بھڑکنے سے پہلے ہی کرنل زاہد کلّا میاں پر چھلانگ لگا بیٹھا تھا۔ دوسرے ہی لمحہ روشنی نے اس کی آنکھیں بے کار کر دی تھیں۔ تاہم اس نے کلّا میاں کا شانہ پکڑ لیا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ گرے تھے۔

چند لمحات کے بعد زاہد کے ہاتھ میں اس کا پردوں والا چغہ رہ گیا تھا۔ وہ گرفت سے نکل بھاگا تھا۔

شعلے کی روشنی مشکل سے چند سیکنڈ رہی تھی۔ اس روشنی کے جھماکے نے ان سب کو پریشان کر دیا تھا۔ ان تینوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہر ایک چیخ رہا تھا۔

"میری آنکھیں۔"

"مجھے کچھ نہیں دکھائی دے رہا ہے۔"

"میں اندھی ہو گئی۔"

زاہد آوازیں سنتا رہا۔ وہ خود بھی اندھا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس درمیان ان کی چیخیں سن کر کئی ملازم دوڑتے ہوئے چلے آئے اور ان تینوں کو اٹھایا۔

"وہ کہاں ہے؟" مہرہ نے پوچھا۔

"کون صاحب۔" طوطے جیسی ناک والے نے جواب دیا۔

"کلّا میاں۔"

"وہ یہاں نہیں ہے۔ ہم لوگ روشنی کے جھماکے پر ادھر دوڑے چلے آئے۔ وہ راستے میں کہیں نہیں ملا۔"

وہ تقریباً پندرہ ملازم تھے۔ فوراً بھاگ کھڑے ہوئے۔

پانچ منٹ کے بعد ان میں سے ایک کو دھندلا دھندلا دکھائی دینے لگا۔ دس منٹ کے بعد ان چاروں کی آنکھیں ٹھیک ٹھیک کام کرنے لگیں۔

"مجھے افسوس ہے کہ وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔" زاہد نے کہا۔

"لیکن اسے بھی ہماری طرح اندھا ہو جانا تھا۔" مہرہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔

زاہد نے لڑکی اور اس ایک حبشی شخص سے کہا "جایئے اور منہ ہاتھ دھو ڈالیے۔ ممکن ہے اس روشنی کے اثرات بھی نقصان دہ ہوں۔"

وہ دونوں باتھ روم کی طرف دوڑ پڑے۔ زاہد مہرہ کے قریب پہنچ کر اس سے سرگوشی کے انداز میں مخاطب ہوا۔

"میرا یہ خیال ہے کہ آپ مجھے پہچان گئے ہیں۔"

"ہاں ۔ لیکن میں تصدیق چاہوں گا۔"

"سنہری آفت۔"

"بالکل ٹھیک جنرل کیھو نے ہی شناختی کوڈ بتایا تھا۔ لیکن یہ سب کیا تھا؟ میں تو دنگ رہ گیا۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ روحی تھا۔ خیر ہم اس موضوع پر بعد میں گفتگو

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

کریں گے۔ پہلے یہ بتایئے کہ وہ دونوں کون ہیں؟" زاہد نے ہاتھ روم کی جانب اشارہ کیا۔

اس لڑکی کا نام ریا ہے، وہ میری بیوی ہے۔ وہ ریا کا باپ ہے جس کی ایک آنکھ کار کے حادثے کی نذر ہوگئی۔ نام سیارام رگھوونشی ہے۔"

"کیا آپ نے ان دونوں سے روبی سے ملاقات اور اس کے مطالبے کا ذکر کیا۔؟"

"نہیں۔"

"کسی اور سے۔؟"

"صرف سیکرٹری وزارت داخلہ سے۔ وہ میرے گہرے دوستوں میں سے ہے۔"

"یہ آپ نے ٹھیک ہی کیا۔ اب میں آپ کی زبانی اس ملاقات کی تفصیل جاننا چاہوں گا۔"

اس درمیان ریا اور رگھوونشی لوٹ آئے۔ وہ دونوں تشویش کن نگاہوں سے زاہد کو دیکھنے لگے۔

"یہ مسٹر سمیر ہیں۔" مہرہ نے ان دونوں سے زاہد کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "میں نے انہیں باہر سے بلایا ہے یہ حال ہی سینجمنٹ انڈ ایڈمنسٹریشن کا کورس مکمل کرکے امریکہ سے لوٹے ہیں۔"

پھر اس نے زاہد سے دونوں کا تعارف کروایا۔

رگھوونشی نے اسے سپاٹ اور ریا نے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"مسٹر سمیر۔" مہرہ زاہد سے مخاطب ہوا "میں یہاں آپ کیلئے ایک کمرہ مخصوص کروائے دیتا ہوں۔ آپ چاہیں تو یہاں رہیں یا آپ چاہیں تو ہوٹل میں۔"

زاہد نے دل ہی دل میں مہرہ کی معاملہ فہمی کی تعریف کی۔

"بہتر تو یہی ہوگا کہ میں یہیں ٹھہروں۔ لیکن ہوٹل سے یہاں شفٹ ہونا فی الحال ملتوی رکھوں گا۔"

پھر وہ لوگ دیر تک کلامیاں اور روشنی کے خطرناک جھماکے کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ ریا کو شکایت تھی کہ اس فراڈی شخص کو ملاقات کا موقع ہی کیوں دیا گیا۔

"اس کا نام اور حلیہ کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کرسکتا تھا۔" جواب زاہد نے دیا۔

"میں نے آپ سے شکایت تو نہیں کی۔" ریا نے برا سا منہ بنایا "شکایت مجھے اپنے شوہر سے ہے۔ ہاں ڈیئر۔" وہ مہرہ سے بولی "یہ حرکت کس کی ہوسکتی ہے۔؟"

"کم سے کم میں تو نہیں جانتا۔" مہرہ کا موڈ آف تھا "بظاہر وہی اپنی حرکت کا ذمہ دار ہے لیکن اس نے ہمیں پریشان اور خوف زدہ کیوں کیا۔؟ یہ سوال پہلے سوال سے زیادہ اہم ہے۔"

اس درمیان زاہد میز کا وہ حصہ بغور دیکھتا رہا جہاں سے شعلہ بلند ہوا تھا اس جگہ ایک سیاہ دھبہ پڑ گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت ایک ملازم نے اطلاع دی کہ تمام محل چھان مارا گیا لیکن اس بہروپیے کا سایہ تک کہیں نہیں دیا۔

مہرہ ملازم کو چند ضروری ہدایتیں دے کر لائبریری روم میں آگیا وہاں اس نے گذشتہ رات کی تفصیل سنائی۔

"آپ کی لڑکی انجو اس کی والدہ اور بھائی بہن اس محل میں رہتے ہیں۔؟"

"ہاں پچھلے حصے میں۔"

"انجو کے متعلق اس نے جو باتیں کہیں ان میں صداقت ممکن ہے یا نہیں۔؟"

مہرہ کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ شرمندگی کے احساس سے اس نے نگاہیں چراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا کہ بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ ملہار انجو کا ہی تھا۔"

"آپ نے ملہار کے متعلق دریافت کیا۔؟"

"ہاں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ کل ایک ہوٹل کی بھیڑ بھاڑ میں کسی نے اڑا لیا۔"

آپ نے انجو کی والدہ یعنی اپنی پہلی بیوی سے کچھ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ انجو غلط راستوں پر تو نہیں چل رہی۔؟"

"انجو کی ممی مجھ سے ناراض رہنے لگی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے مہینوں نہیں ملتے۔ ان سے پوچھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

"لیکن روبی کے بیان کے بعد حقیقت کا جاننا انتہائی ضروری ہے انجو کو بدچلن قرار دے کر وہ بلیک میل کرنا چاہتا ہے۔"

"مسٹر زاہد۔" اس نے کسی تھکے ہارے جواری کی طرح ٹھنڈی سانس لیکر کہا "اس کیس کو تمہیں سنبھالنا ہے۔ بات قطعی نہیں پھیلنا چاہیئے۔"

"اس معاملے میں میرا انجو سے ملنا نہایت ضروری ہے۔ کیا اس سے ملاقات کروا سکتے ہیں۔؟"

"وہ انتہائی بدمزاج لڑکی ہے۔ میں کوشش کروں گا۔"

"اب یہ بتایئے کہ کیا واقعی آپ کے پاس ایک کروڑ روپے کی مالیت کا سونا ہے؟ اگر ہے تو کس شکل میں؟"

"ہاں ہے۔ بسکٹ کی شکل میں۔"

"آپ کے علاوہ اس کا علم کسے ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔؟"

"کسی کو نہیں صرف مجھے ہے۔"

"کسی ملازم کو۔؟"

"میرا پرسنل سیکرٹری اتنا ضرور جانتا ہے کہ سونا میرے پاس آتا رہتا ہے۔ میں نے اسے بتا رکھا ہے کہ سونا میرے پاس سے جاتا رہتا ہے۔ لہٰذا وہ یہ نہیں جانتا کہ میں نے سونے کا اتنا زبردست اسٹاک کر رکھا ہے اندازاً کوئی بھی کہہ سکتا ہے کہ سونا میرے پاس ہے یا ہو گا لیکن اس کی مالیت کا اندازہ لگانا کسی کے بس کی بات نہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ روم کو اس کی صحیح مالیت کا علم کیسے ہوا۔؟"

"آپ کا پرسنل سیکرٹری کون ہے؟ وہی طوطے جیسی ناک والا؟"

"ہاں۔ اس کا نام سنیل بھٹناگر ہے۔ وہ گذشتہ پچیس برس سے میرے ساتھ ہے۔ میں اس کی وفاداری پر ذرہ برابر بھی شک نہیں کر سکتا۔"

"وہ جھکی قسم کا نظر آتا ہے۔"

"ہاں۔ لیکن بے حد اسمارٹ اور انتہائی ذہین شخص ہے۔؟"

"آپ کی پہلی بیوی نے تو انتقاماً کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

"ایسا ممکن نہیں۔ وہ مجھ سے ناراض ضرور ہے لیکن مجھے بیحد چاہتی ہے۔ میں خود بھی اس کی عزت کرتا ہوں۔ سونے کے متعلق اسے یا کسی اور کو قطعی کوئی علم نہیں۔"

"آپ یہاں سونا رکھتے ہیں۔ کیا اس جگہ کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا؟"

"ممکن ہی نہیں۔"

"آپ کے کتنے لڑکے ہیں۔؟"

"دو۔ ایک مدراس اور دوسرے کلکتہ میں کاروبار سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ سونے کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔"

کرنل زاہد نے تقریباً نصف گھنٹہ تک مختلف سوالات کئے لیکن مہرہ اس بات پر مصر تھا کہ سونے کے متعلق کوئی کچھ نہیں جانتا۔ عین اسی وقت کمرے میں ایک الٹرا موڈرن لڑکی نے قدم رکھا۔ رنگ ایکدم سرخ و سفید نقوش تیکھے، قد لمبا، بال ترشے ہوئے، بغیر آستین کی منی شرٹ اور نیلی بیل باٹم پہنے ہوئے۔

"ڈیڈی ــ" وہ کمرے میں قدم رکھتے ہی بولی:

"ہارٹ کی رپورٹ۔"

پھر وہ یوں رک گئی جیسے اچانک اس کی زبان کو بریک لگ گیا ہو "ان صاحب کی تعریف؟" اس نے زاہد کو سر سے پیر تک یوں دیکھا جیسے وہ اس کا تنقیدی جائزہ لے رہی ہو۔

"مجھے سمیر کہتے ہیں" زاہد نے اسے توجہ سے دیکھتے ہوئے بولا "میں ابھی ابھی یہاں آیا ہوں۔ مہرہ صاحب نے مجھے آپ کے لئے پسند کیا ہے، اب دیکھئے آپ مجھے پسند کرتی ہیں یا نہیں۔"

وہ تو بری طرح چونکی لیکن مہرہ کو بھی چونکنا پڑا۔

"ویلرٹ نانسنس" وہ برا سا منہ بنا کر غرائی

"میں شادی کو بے ہودگی سمجھتی ہوں۔"

"اس موضوع پر تبادلۂ خیال کریں گے۔"

زاہد کا جواب تھا۔

"یہ میرا پسندیدہ موضوع نہیں۔ نہ میں آپ کو وقت دے سکتی ہوں نہ بات کر سکتی ہوں۔"

"کوئی بات نہیں جو مجھے پسند ہوں میں ان کی پسند کا خیال رکھ کر پسندیدہ موضوعات پر گفتگو کرنا پسند کرتا ہوں۔ میری یہ خوبی تو آپ کو پسند آ سکتی ہے!"

"آپ کی پرکشش اور چمکتی ہوئی آنکھوں کو چھوڑ کر مجھے آپ میں ایسی کوئی خوبی دکھائی نہیں دی کہ میں آپ سے ملاقات کے لئے سوچ بھی سکوں۔ بہتر ہو گا کہ آپ آئندہ میرے سامنے آنے کی کوشش کریں۔"

"انجو۔" مہرہ کا لہجہ بہت سخت تھا۔ "مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔"

"لیکن میں اپنی آزادی اور پسند پر کسی کو اثر انداز ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرتی۔"

"یہ میرا حکم ہے کہ مسٹر سمیر کے ساتھ دوستوں جیسا برتاؤ کرو۔"

"ڈیڈی" آج کل کے دوست بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ اس لئے میں نے دوستی کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اپنے اصول کی بات ہے میں مجبور ہوں۔"

"اور میں بھی۔"

مہرہ پھر غرایا۔ "ورنہ۔"

"ڈیڈی اس معمولی سے انسان کے لئے آپ مجھے دھمکیاں دے رہے ہیں۔" وہ فوراً ہی مسٹری اور تیور بدل کر بولی۔ "آپ نے میری عمر کی لڑکی کو اپنی بیوی بنا لیا کیا میں نے اعتراض کیا۔؟"

مہرہ کا ہاتھ گھوم گیا۔ لیکن زاہد نے فوراً ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میرا شکریہ ادا کرو انجو۔"

زاہد نے کہا۔

"ہاتھ پکڑا ہوتا تو پانچوں انگلیاں چہرہ بگاڑ دیتیں۔"

"میرے ساتھ یہ سلوک، جانوروں جیسا برتاؤ۔"

وہ چیخ پڑی۔

"نہیں میں یہ نہیں برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ پیر ٹپکتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

"آپ کو برداشت سے کام لینا چاہیے جناب۔"

"برداشت۔" مہرہ نے ہچکچا کر کہا۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"اس لڑکی کی وجہ سے میں کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"میں سنبھال لوں گا۔ آپ میرے مشورے پر عمل کرتے جایئے۔"

زاہد نے جیب سے ایک ٹرانسمیٹر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا "وہ آج آپ سے ملے گا یا گفتگو کرے گا جونہی ہو اس ٹرانسمیٹر پہ مجھے آپ اطلاع کر دیں تاکہ میں بروقت پہنچ سکوں۔ جب تک کے لئے مجھے اجازت دیجئے۔"

ٹرانسمیٹر کا سسٹم سمجھانے کے بعد زاہد بھی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ صدر دروازے سے گذر کر وہ پورچ میں پہنچا وہاں انجوانی اسپورٹ کار اسٹارٹ کر رہی تھی۔ زاہد نے دوسرا دروازہ کھولا اور اس طرح کار میں اس کے برابر والی اگلی نشست پر بیٹھ گیا جیسے اس لڑکی کی حیثیت کسی ڈرائیور جیسی ہو۔

"نیچے اتر جایئے۔" وہ غرائی "یہ میری ذاتی کار ہے۔"

"اب یہاں کی ہر چیز میری ہے۔ کار آگے بڑھاؤ۔" زاہد نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی جانب دیکھے بغیر جواباً کہا۔

"حتیٰ کہ۔"

"میں بھی۔" وہ بات کاٹ کر تیزی سے بول پڑی "میرے گلے مت پڑیئے۔ ورنہ میں بیری کی جھاڑی ہوں۔ اتنے چرکے اور زخم لوں گی کہ پناہ مانگتے پھریں گے۔"

"میں تمہیں ہاتھ پیروں سے لے کر دل و دماغ کی حد تک درست کر دوں گا۔ کان کھول کر سن لو کہ آج کے بعد سے تم میرے علاوہ کسی سے نہیں ملو گی۔ چلو کار آگے بڑھاؤ۔"

اس نے کار آگے بڑھا دی۔

"ابھی تک میں تمہارا ادب کر رہی تھی۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ مجھے اپنی اوقات دکھانی پڑے گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ تم میری مٹھی میں ہو۔ میں تمہیں انگلیوں پر نچا سکتا ہوں اور نچاؤں گا۔ تم بہت زیادہ بگڑ چکی ہو۔"

"کک کیا۔؟" وہ ہکلا اٹھی۔

"تم نے اپنے آپ میں دنیا بھر کا کوڑا کرکٹ سمیٹ کر بھر لیا ہے تم ایک ڈسٹ بن کی طرح ہو۔"

"میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ مجھے گندگی کا ڈھیر کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آ رہی۔ لڑکیوں سے اس طرح گفتگو کیجاتی ہے۔"

"مجھے لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ شرم زندگی میں آئی ہے نہ آئے گی۔ مجھے تم سے شادی کر کے ایک بڑی جائیداد کو ہڑپ کرنا ہے۔"

"یعنی تم ڈیڈی کی دولت ہڑپ کرنا چاہتے ہو۔"

"تمہارے ذریعے ۔۔۔ میں نے بلیو پرنٹس دیکھی ہیں۔"

وہ تقریباً اچھل پڑی۔

"یہ تم کیا بک رہے ہو۔ میں واقعی تمہیں قتل کر دوں گی۔"

"آیا ہی اس مقصد سے ہوں۔ اپنے ٹھکانے پر لے چلو۔"

"کیا بکے جا رہے ہو۔۔۔ ٹھکانا اور میرا۔؟"

"دراصل میں بھی ایک خفیہ اسٹوڈیو چلانا چاہتا ہوں۔ اسے تم سنبھالو گی۔ اس کام کے لئے تمہارا خفیہ ٹھکانا کام میں لایا جا سکتا ہے۔"

اس نے کار روک دی اور دونوں ہاتھوں سے زاہد کا چہرہ نوچ لینا چاہا۔

زاہد نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں۔

"مجھے روحی نے بھیجا ہے۔"

وہ اسے یوں گھورنے لگی جیسے اس کے سر پر بم پھٹ پڑا ہو۔

"کون روحی۔؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"وہ جس کے بستر پر تم اپنا ہار گرا آئی تھیں۔ میں روحی کا خاص دوست ہوں۔ لیکن وہ غدار ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم بازی الٹ سکتے ہیں۔ میں تمہیں اس کے چنگل سے نکال سکتا ہوں۔"

الجھن، پریشانی اور خوف کے ملے جلے اثرات اس کے چہرے پر ابھر آئے تھے۔ وہ دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورتی رہی اور پھر سسک سسک کر رو پڑی۔

"میری عادتیں عجیب ہیں" زاہد کا لہجہ سپاٹ اور غیر جذباتی تھا۔ "روتی ہوئی لڑکیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اگر تم دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دو گی تو مجھے خوشی ہو گی کہ کئی دنوں بعد مجھے رونمائی ٹانک میسر آیا۔"

"آخر تم ہو کیا۔"

"وہی جو میں کہہ چکا ہوں۔ روحی کا معتمد خاص۔ لیکن اب میں اپنا کاروبار الگ جمانا چاہتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میرے خلاف کس قسم کی سازش ہے نہ تو میں روحی کو جانتی ہوں۔ نہ میں نے اس کے بستر کا رُخ کیا نہ ہار گرایا۔ اگر تم اس روحی کے ساتھی ہو تو خود جانتے ہو گے کہ میں اس کے سائے سے بھی ناواقف ہوں۔ تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔"

زاہد اس کی آنکھوں میں یوں دیکھتا رہا جیسے اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر کر اصلیت جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"رومی سے تمہارے متعلق جو باتیں مجھے معلوم ہوئی تھیں وہ میں نے تم سے نہیں چھپائیں لیکن تمہارے معاملے میں اگر غلط بیانی سے کام لیا ہے تو وہ مجھے ڈبل کراس کر رہا ہے۔ ایک طرف وہ تمہارے ذریعہ کوئی بہت بڑا ہنگامہ کھڑا کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف ایک اجنبی کی حیثیت سے مجھے تمہارے قریب رہنے اور تم سے شادی کرنے کے لئے مجبور کر رہا ہے۔"

"اگر میں تمہارا بیان صحیح مان لوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ میرے ڈیڈی تم جیسوں سے اس حد تک نزدیک ہو جائیں کہ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دینے کا فیصلہ کر بیٹھیں۔"

"انہیں میری اصلیت کا علم نہیں میں رومی کی سازش کا ایک حصہ ہوں اور خود کو امریکہ سے لوٹا ہوا اعلیٰ تعلیم یافتہ بتا کر ان کے دل میں گھر کر لیا ہے۔"

"اگر ایسا تھا تو تم نے اپنی اصلیت مجھ سے کیوں نہیں چھپائی۔"

"اصلیت اس لئے نہیں چھپائی کہ رومی نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس کی مٹھی میں ہو۔ اس سے ملی ہوئی ہو۔"

"بڑا خطرناک اور اُلجھا ہوا چکر ہے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا۔"

"خیر۔ اب تم اسی وقت محل لوٹ جاؤ۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ رومی تمہیں اغوا کروا لے..... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں ایک لاش میں تبدیل کر دے۔ میں رات کو تم سے ملاقات کروں گا۔"

"میں کبھی کسی مرد سے رات کو تنہائی میں نہیں ملتی۔"

"لیکن مجھ سے ملنا ضروری ہے۔ ورنہ تم خطرے میں پڑ جاؤ گی۔"

وہ انتہائی خوف زدہ نظر آ رہی تھی جیسے اُسے واقعی اپنے اوپر موت جھپٹتی دکھائی دے رہی ہو۔

زاہد کار سے اُتر گیا۔ اس نے اپنی کار کو موڑا اور واپس محل کی طرف روانہ ہو گئی۔ جب انجو کی کار نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ پیدل ہی چل پڑا اور سوچنے لگا کہ کیا انجو واقعی رومی کو نہیں جانتی؟ کیا رومی اندھیرے میں تیر چلا رہا تھا؟ کیا انجو کا ہار واقعی گلے سے مار دیا گیا تھا لیکن رومی کے نام پر وہ بُری طرح کیوں چونک پڑی تھی تاہم وہ مطمئن تھا کہ اس نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں ایک یہ کہ انجو اگر رومی کا آلۂ کار بنی ہوئی ہے تو وہ ان تمام باتوں کا ذکر اس سے کر دے گی تب رومی خود اس سے ٹکرانے یا اسے نقصان پہنچانے کے لئے یقینی طور پر قدم اُٹھائے گا اور وہ یہی چاہتا تھا دوسرے یہ کہ اگر انجو بد چلن نہیں اور بلیو پرنٹس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو وہ تمام باتیں اپنے ڈیڈی کو بتا کر صاف صاف کہہ دے گی کہ سمیر نامی شخص جرائم پیشہ ہے اور تب یہ بات مہرہ کے ذریعے خود اس تک پہنچ جائے گی۔

راستے میں اس نے ٹیکسی کی اور ڈیفنس کالونی پہنچا ٹھیک اسی بنگلے کے سامنے اس نے ٹیکسی رُکوائی۔ اُتر کر کال بیل کا بٹن دبایا گھنٹی بجتی رہی جب کہ وہ خود یہ دیکھ چکا تھا کہ دروازے پر تالا پڑا ہوا ہے۔

پڑوس کے بنگلے کی کھڑکی سے ایک شخص نے اپنا چہرہ باہر نکال کر کہا۔

"کیپٹن اسد اور احمد خاں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"شکریہ ــــ کیا آپ اتنا بتا سکیں گے کہ وہ کب گئے ہیں اور کہاں گئے ہیں؟"

"انہیں گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ تقریباً ایک ماہ بعد وہ کشمیر سے لوٹیں گے۔"

"یہاں ان کا کوئی مُلازم رہتا ہے یا نہیں؟"

"رہتا ہے۔ رات کے وقت آتا ہے اور صبح چلا جاتا ہے۔"

"شکریہ ــــ"

زاہد واپس ٹیکسی میں آ بیٹھا۔ راستے میں اُتر کر اس نے کیپٹن جاوید کو فون کر کے اس بنگلہ کی نگرانی کے لئے کہا۔

"لیکن جناب یہ اچانک کیا معاملہ آ پڑا؟"

"میں تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔"

فون کرنے کے بعد وہ پھر ٹیکسی کے ذریعے مختلف سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ اس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا؟ لیکن اس نے ایسی کوئی بات محسوس نہیں کی۔

شام ہوتے ہی اس نے کئی نائٹ کلبوں کا رُخ کیا۔ وہاں ملازمین کو لالچ دے کر ان کی جیبیں گرم کر کے انجو کے متعلق معلومات حاصل کیں۔

اسٹار لٹ نائٹ کلب کے ایک ویٹر نے اسے بتایا کہ وہ انجو کو جانتا ہے۔ وہ اکثر یہاں تنہا آتی ہے۔ خوب نشہ کرتی ہے اور لوٹ جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسے یہاں اس کا کوئی بوائے فرینڈ مل جاتا ہے تو پھر وہ یہیں کوئی کمرہ کرائے پر لے کر رات گزار دیتی ہے۔"

"بوائے فرینڈ کوئی ایک ہے یا ایک سے زیادہ؟"

"میں نے کسی کو دوسری مرتبہ اس کے ساتھ نہیں دیکھا۔"

"آج کل بھی آ رہی ہے یا نہیں۔"

"گزشتہ ایک ہفتہ سے یہاں نہیں آئی۔"

"میں تمہیں سو کا ایک نوٹ اور دے سکتا ہوں۔" زاہد نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "اگر تم یہ بتا سکو کہ آخری مرتبہ تم نے اسے کس بوائے فرینڈ کے ساتھ دیکھا تھا۔"

"ٹائیگر اقبال سنگھ کے ساتھ۔"

"یہ وہی ٹائیگر اقبال سنگھ تو نہیں جس نے حال میں کشتی لڑنے سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کیا ہے؟"

"وہی ۔۔۔ وہ یہاں اس کے ساتھ تین مرتبہ دکھائی دی تھی۔"

"لیکن تم نے ابھی کہا تھا کہ انجو ہمیشہ نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ دکھائی دیتی ہے ۔۔۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ ٹائیگر کے ساتھ تین مرتبہ دکھائی دی۔"

"یہ ایک نئی بات تھی اس لئے مجھے یاد رہ گئی۔"

"اس ایک ہفتہ میں ٹائیگر یہاں آیا؟"

"نہیں۔"

وہاں سے زاہد سیدھا اپنی کوٹھی پر آ گیا لیکن راستے میں ٹیکسی کو چھوڑ کر دیر تک وہ پیچیدہ گلیوں میں سے گزرتا رہا تھا تاکہ تعاقب کرنے والوں کو دیکھا جا سکے۔ جب وہ مطمئن ہو گیا تب اپنی کوٹھی پر پہنچا۔

ایک گھنٹہ بعد وہ بغیر کسی میک اپ کے کیپٹن سیما کے ساتھ ٹائیگر اقبال سنگھ کی رہائش گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی رہائش کا پتہ اس نے کئی ایک جگہ فون کرنے کے بعد معلوم کیا تھا۔

"ٹائیگر مینشن" اقبال سنگھ کی بلڈنگ کا نام تھا جو اس نے کشتیاں لڑ لڑ کر جیتی ہوئی دولت سے خریدی تھی۔ یہ ایک چار منزلہ عمارت تھی۔ دوسری منزل پر وہ خود رہتا تھا۔ بقیہ حصوں کے فلیٹ مختلف ایجنسیوں کے آفسوں پر مشتمل تھے۔

کرنل زاہد نے کار عمارت سے دور ایک سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔ اس کے بعد وہ سیما کے ساتھ چل پڑا۔

وہ دونوں عمارت میں داخل ہو گئے۔ چوکیدار نے روکا ٹوکا نہیں شاید اس لئے کہ ابھی کئی آفس کھلے ہوئے تھے۔

دوسری منزل کا آخری فلیٹ ٹائیگر اقبال سنگھ کا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ اس حصے میں نیم تاریکی تھی۔ زاہد نے دروازے کا ہینڈل گھما کر دیکھا وہ بند تھا۔ زاہد نے پلٹ کر دیکھا۔

"کہیں کوئی نہیں۔" سیما آہستہ سے بولی۔

زاہد نے ایک مخصوص تار کی مدد سے قفل کھولا اور ہینڈل گھما دیا۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے۔ کمرے میں مدھم روشنی کا بلب جل رہا تھا۔

فلیٹ تین کمروں پر مشتمل تھا۔ فلیٹ کا ہر کمرہ بڑی نفاست کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کہیں سے کہیں تک یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ کسی پہلوان کا فلیٹ ہو۔ دیواروں پر البتہ تین بڑی بڑی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تصویریں خود اقبال سنگھ کی تھیں۔

زاہد نے دستانے پہننے کے بعد وہاں موجود تمام سامان کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ سیما اس کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ وہ جس سامان یا جگہ کی تلاشی لیتے اسے پہلے جیسی حالت میں درست کر دیتے تاکہ تلاشی کا شبہ نہ ہو سکے۔

ایک گھنٹے کی مسلسل تلاشی کے بعد بھی زاہد کو وہ فلم نہیں مل سکی۔

"آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ وہ فلم کس کی ہے جس کی آپ کو تلاش ہے؟"

"میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ کوئی فلم ہے جس کی وجہ سے بلیک میلنگ کی راہ ہموار کی جا رہی ہے۔" وہ اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "لیکن میں ابھی اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں کہ ایسی کوئی فلم ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ یہاں ہو۔ اس کی بھی کوئی گارنٹی نہیں لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بار بار ابھر رہی ہے کہ وہ فلم یہاں ہو سکتی ہے۔"

"اس کے لئے کوئی جواز بھی ہو گا۔"

"انجو، ٹائیگر اقبال سنگھ کے ساتھ تین مرتبہ دیکھی گئی ہے جبکہ دوسری مرتبہ کبھی کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ نہیں دیکھی گئی۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"میں انجو کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر سوچنے پر مجبور ہوں۔"

زاہد نے پھر تلاشی شروع کر دی۔

"اس شیلف کا تالا ہم توڑ نہیں سکتے۔" سیما نے کہا۔

"ایسی چیزیں شیلف میں نہیں رکھی جاتیں جنہیں چرایا یا اڑایا جا سکے۔"

پھر اس نے سیما سے کہا "اس مسہری سے متعلق کیا خیال ہے"

وہ چونک کر زاہد کو دیکھنے لگی "بہت خوبصورت ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے راجہ مہاراجہ نے اسے انعام میں دی ہو۔ کیوں؟"

"اس کے پائے پیتل کے ہیں۔ ان کا اوپری چوکور حصہ تقریباً نو انچ سے بارہ انچ تک کا ہے۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔"

زاہد کی آنکھیں مخصوص انداز میں چمکنے لگی تھیں۔ وہ مسہری

کے نیچے لیٹ گیا اور سیما سے کہا "ذرا اسے ایک طرف سے اٹھائے رہو۔"

سیما نے ویسا ہی کیا۔ زاہد نے ایک پائے کو گھمایا۔ وہ نہیں گھوما۔ اس نے پھر طاقت صرف کی پایہ گھومنے لگا اور پھر وہ مسہری سے الگ ہوگیا۔ زاہد نے اس پائے کو الٹ دیا۔ پائے کے اندرونی کھوکھلے حصے سے فلم کا ایک بڑا رول فرش پر آگرا۔ وہ پلاسٹک میں پیک تھا۔

سیما زاہد کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

زاہد نے ایک ایک کر کے چاروں پائے چیک کئے۔ اسے فلم کے تین بڑے رول مل گئے۔

پائے اسی طرح فٹ کر دینے کے بعد اس نے کہا۔

"آؤ چلیں۔"

جب وہ عمارت سے باہر نکل کر جا رہے تھے تبھی ایک کار عمارت کے صدر دروازے پر رکی۔

"وہ ٹائیگر اقبال سنگھ تھا۔" سیما نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔"

"بڑی خیر ہوئی ورنہ اس دیوقامت انسان سے نپٹنا سان کام نہیں ہوتا۔"

"میرے لئے اقبال سنگھ اہم نہیں تھا۔ اہم تھیں فلمیں، گو کہ فلموں کو چیک نہیں کیا گیا پھر بھی میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ وہی ہوں گی۔"

وہ کار میں آبیٹھے اور پھر زاہد نے کار کی رفتار تیز کر دی۔

"اگر وہ ویٹر یہ نہ بتاتا کہ انجو ایک ہی مرتبہ ایک بوائے فرینڈ سے ملتی ہے تو میرا ذہن ٹائیگر کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ ٹائیگر کی طرف ذہن منتقل ہونے کے بعد فلم والی بات ذہن میں آئی۔ اگر واقعی یہ وہی فلمیں ہیں تو میں رومی کو چکر کے رکھ دوں گا اور انجو کو بھی۔"

"اگر یہ وہ فلمیں نہ ہوئیں؟"

"تو بھی میں انجو کے ذریعے رومی تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

کوئی ایک گھنٹے کے بعد کرنل زاہد تنہا اپنے کنٹرول روم میں رہا تھا وہاں ایک چھوٹا سا فلم پروجیکٹر اور پردہ بھی تھا۔ اس نے وہ فلمیں دیکھیں حالانکہ وہ نگیٹو تھیں لیکن وہ انجو اور ٹائیگر کو آسانی سے پہچان گیا۔

جب وہ کمرے سے باہر آیا تو سیما اس کی آنکھوں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

"وہ دونوں جانوروں سے گئے بیتے تھے لیکن ہماری محنت اکارت نہیں گئی۔"

* * * *

"یہ کس محنت کی بات ہو رہی ہے؟" جاوید کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔

"تم واپس آگئے۔؟"

"کسی سڑے گلے مردے کی نگرانی میرے بس سے باہر ہے۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "پھر آپ سے شکایت یہ ہے کہ کیس کے متعلق ایک لفظ کہے بغیر بس حکم دے دیا کہ میاں جاوید جاؤ اور ڈیفنس کے بنگلے کی نگرانی کرو۔"

"ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہو رہا ہے۔" سیما کا لہجہ بھی شکایتی تھا۔

"میں دونوں کی شکایتیں دور کر دوں گا ___ لیکن جاوید پہلے رپورٹ ___؟"

"میں اس بنگلے کی نگرانی کرتا رہا ___ وہاں نہ کوئی آیا نہ گیا۔ شام ہوتے ہوتے اس بنگلے سے بدبو آنے لگی۔ پڑوسی جمع ہونے لگے۔ وہاں بھیڑ لگ گئی۔ پولیس طلب کی گئی۔ دروازے کا تالا توڑا گیا۔ ایک کمرے میں ملازم کی لاش ملی۔ بھیڑ کے ساتھ میں بھی اندر گھس گیا تھا ___ اس کمرے کا دروازہ کھولتے ہی بدبو کے مارے دماغ پھٹ پڑا۔ مجھے اب تک ابکائیاں آرہی ہیں۔ خیال ہے کہ اس ملازم کو مرے ہوئے تین دن گزر گئے ہیں۔ یہ بھی بتا چلوں کہ رسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑا ہوا تھا ___ اسی سے اس کا دم گھٹ گیا ___ گردن پھول کر اتنی موٹی ہو گئی ہے کہ رسی کا پھندہ دکھائی نہیں دیتا۔ رسی کے سرے دکھائی دے رہے ہیں۔ کسی نے دھوکے سے اس کا کام تمام کر دیا۔"

"اوہ ___" زاہد نے ایک لمبا سانس لیا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اسی ملازم کو ٹھکانے لگانے کے بعد اس بنگلے کو اپنے کام میں لاتا رہا۔"

"کون ___؟"

زاہد نے اختصار کے ساتھ انہیں سب کچھ بتا دیا۔

"رومی کا نام میں نے بھی سن رکھا ہے ___ دنیا کے چھٹے ہوئے بدمعاشوں میں سے ایک ہے۔"

"کوئی ہنگامہ اٹھائے بغیر ہمیں اس کیس کو نپٹانا ہے۔" زاہد کا لہجہ فکر آمیز تھا۔ "لیکن وہ انتہائی شاطر ہے۔ میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ کلا میاں بن کر وہاں آیا اور ایک خطرناک شعبدہ دکھا کر کیوں بھاگ گیا۔"

"اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ رومی ہوگا۔؟" سیما نے سوال کیا۔

"اگر وہ کوئی شعبدہ باز ہوتا تو بدلے میں کچھ چاہتا۔ اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ سمندر سے موتی نکالنا بے عقلوں کو عقل کی راہ دکھانا۔ جو نہ مانے اس کی مٹی پلید کرنا۔"

"کیریکٹر زندہ دل اور زوردار معلوم ہوتا ہے۔" جاوید مسکرایا۔

"اس نے مہرہ سے آخر میں کہا تھا کہ حکم اللہ کا، ملک عوام کا اور اس محل میں حکومت آپ کی۔ فقیرانہ آیا ہوں اور صدا کر کے لوٹ رہا ہوں۔ اگر اللہ میاں کو یاد نہیں رکھ سکتے تو کلاّمیاں کو ضرور یاد رکھنا۔ کلاّمیاں کا کام بنانا نہیں بگاڑنا ہے۔"

"بڑی زوردار بات کہی اس نے۔ ایسے صاف گو انسان مجھے بہت پسند ہیں۔" جاوید نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ واقعی پہنچا ہوا تھا۔ جس شان سے آیا۔ اسی شان سے لوٹ دو گیارہ ہوگیا۔"

زاہد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا "اس کی اس حرکت کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ وہ مہرہ کو خوف زدہ کر کے وارننگ دے جائے۔"

"ہوسکتا ہے کہ یہ وارننگ آپ کو بھی دی گئی ہو؟" سیما نے ایک دوسرا رُخ پیش کیا۔ "اسے وہاں آپ کی موجودگی کا علم بھی ہوگیا ہو؟"

"ایسا ممکن نہیں" زاہد کا لہجہ پُراعتماد تھا "لیکن اس جیسے شاطر کو میں بھی چکما دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اگر انجو اس کی آلۂ کار ہے تو اسے اطلاع کر دے گی کہ سمیر نامی اس کا ساتھی خود اسے ڈبل کراس کر رہا ہے۔ تب وہ بوکھلا کر میرے سامنے آجائیگا۔"

"اگر انجو اس کی آلۂ کار نہیں ہوئی تب؟"

"ٹائیگر اقبال سنگھ ہوسکتا ہے اور میرا خود مہرہ کا کردار ہے میں اس کے سہارے آگے بڑھوں گا۔ اس حد تک کہ اسے سامنے آنا پڑے۔"

"کوئی ایسا راستہ نہیں کہ ہم خود اس تک پہنچ سکیں۔"

"فی الحال ایسا ممکن نہیں۔ اسے سامنے لانے کا طریقہ یہی ہے کہ ہم اسے بُری طرح بوکھلا دیں۔"

"وہ دیر تک اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کرتے رہے۔ آخر میں کرنل زاہد نے جاوید سے کہا۔

"تم ٹائیگر اقبال سنگھ کی رہائش گاہ کی نگرانی شروع کر دو۔

"لاحول ولا قوۃ۔" جاوید نے بُرا سا مونہہ بنایا۔ "نگرانی اور وہ بھی ایک پہلوان کی۔ اگر انجو کی نگرانی کا حکم ہوا ہوتا تو بوریے بستر کے بغیر وہاں ڈیرہ جما لیتا۔ ان دنوں میں بہت بور ہوں۔ للہ رحم کیجئے۔"

سیما مسکراتی رہی کچھ بولی نہیں۔ جاوید نے پھر کہا۔

"مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے کلاّمیاں کا سایہ مجھ پر پڑ رہا ہو۔ وہاں بنگلے کی نگرانی شروع کی تو سڑتی ہوئی لاش کا معاملہ سامنے آیا۔ ٹائیگر اقبال سنگھ کی نگرانی شروع کروں گا تو ممکن ہے کلاّمیاں اسے بھی بے جان سنگھ بنا دے۔ کام لگا کر نا جو ٹھہرا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ رومی وہاں آئے۔"

"کیسے۔؟"

"وہ آج کسی بھی وقت مہرہ سے رابطہ قائم کرے گا۔ مہرہ مجھے اطلاع دے گا اور تب میں مہرہ سے کہوں گا کہ وہ اس سے کہہ دے کہ تینوں فلمیں مع نگیٹوز کے وہ اس کے حوالے کر دے تو وہ اس کا مطالبہ مان لے گا۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ آپ جو سوچ رہے ہیں۔ وہی ہوتا چلا جائے۔"

جاوید نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "اگر انجو اس کی ہے تو وہ اسے سب کچھ بتا دے گی۔ تب وہ کوئی دوسرا رُخ اختیار کر سکتا ہے۔"

"دونوں صورتوں میں ہوگا وہی جو میں چاہتا ہوں۔ یا وہ خود آئے گا یا نگاہوں میں آئے بغیر نہ رہے گا۔ اس لئے تم ٹائیگر اقبال سنگھ کی فوراً نگرانی شروع کر دو۔"

ٹھیک اسی وقت ٹرانسمیٹر پر سگنل ملنے لگے۔ یہ ٹرانسمیٹر، فاؤنٹین پین نما تھا۔

"ہیلو۔ زاہد اسپیکنگ۔"

"میں مہرہ بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی اس کا فون آیا تھا۔ اس نے میرا فیصلہ جاننا چاہا ہے۔"

"یعنی۔؟"

"وہ پوچھ رہا تھا کہ میں نے کوئی فیصلہ کیا یا نہیں۔ میرا جواب یہ تھا کہ میں اسی الجھن میں مبتلا ہوں۔ اس مرتبہ میں نے اسے دس لاکھ کا لالچ دیا کہ اتنی رقم کے بدلے وہ مجھے فلمیں لوٹا دے لیکن وہ اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔"

"آگے۔؟"

"اس نے کہا ہے کہ وہ آج رات کبھی بھی مجھ سے مل سکتا ہے

اس نے یہ بھی وارننگ دی ہے کہ ندرات بھی خطرے میں ہوں۔ میرے قریب اگر کوئی بھی ہوا تو وہ اپنے مطالبے میں تبدیلی یا اضافہ کر دے گا۔ اس کے علاوہ مجھے ذلیل کئے بغیر نہیں رہے گا اور میرے گھر والوں میں سے ایک دو کو قتل بھی کر دے گا۔ اور سب سے خطرناک وارننگ اس نے یہ دی ہے کہ اگر میں نے اس کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو وہ میرے جدید ترین کامپلیکس "ریان اینڈ ریان" کو بموں سے اڑا دے گا۔ ریان اینڈ ریان، میں نائیلون کا ریشہ اور تار تیار کئے جاتے ہیں، انہیں بیرونی ممالک بھیجا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف بائیس ملکوں سے سمجھوتہ یہ ہے کہ اگر میں بروقت انہیں نائیلون کے تار سپلائی نہیں کر سکا تو آرڈر کی دس گنی رقم بطور جرمانہ ادا کرنا ہوگی۔ ان حالات میں میں تباہ و برباد ہو کر رہ جاؤں گا۔"

"پھر آپ نے کیا کہا"؟

میں نے اس کا مطالبہ مان لیا ہے۔"

یعنی فلموں کے مطالبے سے دستبردار ہو کر؟"

نہیں اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ فلموں کے رول لے کر آئیگا۔"

ٹھیک ہے۔ آپ کو اتنا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہیں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"

لیکن۔"

میں آرہا ہوں۔ اس گفتگو کو یہیں ختم سمجھئے۔"

رابطہ منقطع کر لینے کے بعد زاہد نے جاوید اور سیما کو بتایا کہ مہرہ کیا کہہ رہا تھا۔"

"اس رومی کے بچے نے تو بازی ہی الٹ دی" جاوید نے کہا۔

"ہاں اس کی وارننگ انتہائی سنگین اور خطرناک ہے۔" زاہد کا لہجہ تشویش آمیز تھا۔ اب مہرہ یہی چاہے گا کہ ہم اس کیس سے دور ہو جائیں۔ وہ اپنے کامپلیکس کو داؤ پر لگانے کے لئے تیار نہیں۔"

"پھر۔ ؟"

وہ یقیناً اقبال سنگھ سے ملے گا یا اقبال سنگھ اس سے۔ تم فوراً وہاں پہنچو۔ میں مہرہ سے ملنے جا رہا ہوں۔ اگر وہ میری موجودگی پسند نہیں کرے گا تو بھی میں محل میں ہی رہوں گا۔ مجھے رومی سے ملنے کا اشتیاق ہے۔"

زاہد کا انداز فیصلہ کن تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چمک ابھر آئی تھی جو ایسے خطرناک مرحلوں میں اس کی شخصیت کا لازمی حصہ بن کر رہ جاتی تھی۔

جاوید فوراً ہی وہاں سے روانہ ہو گیا۔

"سیما۔ تم جاوید پر نظر رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کسی مصیبت میں پھنس جائے۔"

❁ ❁ ❁

"ٹائیگر مینشن، چوراہے پر تھی۔ وہاں ایک ہوٹل بھی تھا۔ جاوید اسی ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے بور ہو رہا تھا۔ گذشتہ ڈیڑھ گھنٹے میں اس نے ٹائیگر مینشن کے صدر دروازے کو ایک پل کے لئے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ لیکن اب ہوٹل بند ہو جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسے مجبوراً اٹھنا پڑا۔

کاؤنٹر پر پیمنٹ کرنے کے بعد وہ جیسے ہی باہر نکلا تو سیما اس سے ٹکرا گئی۔

"یہاں چار آدمی چھپ کر عمارت کی نگرانی کر رہے ہیں۔" وہ آہستہ سے بولی "باہر کھڑے ہو کر نگرانی نہیں کی جا سکتی۔ فوراً ان کی نگاہوں میں آ جاؤ گے۔"

"تب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم عمارت میں داخل ہو جائیں۔ ابھی ایک آفس کھلا ہوا ہے وہ بند ہو گیا تو چوکیدار جانے نہیں دے گا۔" اتنا کہہ کر جاوید چل پڑا۔ سیما بھی اس کے ساتھ ہو گئی۔

"چوکیدار یہاں ٹھیک دس بجے آتا ہے۔ ابھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔" سیما نے سڑک کراس کرتے ہوئے کہا "کیا اسے علم ہو گیا ہے کہ ہم لوگ یہاں اس کے منتظر ہیں۔"

"یہ ممکن نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ لوگ ہمیں عمارت کی طرف جاتے دیکھ کر چوکنا ہو جاتے۔ تاہم ابھی پتہ چل جائے گا۔"

وہ عمارت میں داخل ہو گئے اور بے آواز قدموں سے تیزی سے زینہ طے کرنے کے بعد لابی کے ایک تاریک کونے میں دبک گئے۔

"اگر وہ لوگ ہمارے تعاقب میں نہیں آتے تو تمہارا خیال درست نہ ہوگا۔

تقریباً دو منٹ کے انتظار کے بعد بھی جب کوئی نہیں آیا تو جاوید نے پوچھا۔

"اس کا فلیٹ کدھر ہے۔ ؟"

دائیں جانب جہاں روشنی ہو رہی ہے۔"

"آؤ ہم اسی کے فلیٹ میں رہ کر اس کا انتظار کریں۔"

"یہ کیا حماقت ہے۔ مرنا ہے کیا۔"

"آؤ تو۔" جاوید نے سیما کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیزی سے ٹائیگر اقبال سنگھ کے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

سیما، جاوید کی اس حماقت پر تلملا اٹھی لیکن کیا کرتی۔ !

اقبال سنگھ کے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ جاوید نے جھک کر کی ہول سے جھانکا۔ وہاں ایک دیو قامت پہلوان تنہا دکھائی دیا۔ یہ تپائی پر رکھی ہوئی بوتل سے وہ شراب انڈیل رہا تھا۔

"یہ تم کر کیا رہے ہو۔" وہ جاوید کے کان میں بھنبھنائی۔

Wadi Azeem
Pakistanipoint.com

جاوید نے دروازے پر آہستہ سے دستک دے ڈالی۔

"کون ہے؟" ایک بھاری بھرکم اور گرج دار آواز سنائی دی۔

"میں ہوں" جاوید نے اس انداز میں جواب دیا جیسے وہ اقبال سنگھ کے دوستوں میں سے کوئی ایک ہو جس کی ٹائیگر آواز پہچانتا ہو۔

دروازہ کھلا۔ ٹائیگر اقبال سنگھ کی آنکھوں کا تناؤ اور زیادہ ہو گیا اس کی دیوقامت شخصیت دیکھ کر سیما کو ٹھنڈا پسینہ آگیا۔

"کون ہو؟ کیا چاہتے ہو۔؟"

"تم سے ایک خاص بات کرنا ہے۔"

"آجاؤ۔"

وہ دونوں اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو کر اس کے سامنے ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ جاوید کو گھورنے لگا اور ساتھ ہی سیما کو بھی۔

"دنیا کی خطرناک ترین تنظیم مافیا کا نام سنا ہے؟" جاوید نے ذرا آگے جھک کر سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"سنا ہے" وہ چونک پڑا۔ اس تنظیم میں دنیا کے چھٹے ہوئے بدمعاش شامل ہیں لیکن تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟"

"میں اور یہ" جاوید نے سیما کی طرف اشارہ کیا "اسی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔"

ٹائیگر اقبال سنگھ نے فکرمند ہو کر پہلو بدلا۔ اس کی آنکھیں سوالیہ انداز میں جاوید کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔

"میرا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں اس لئے میں تمہیں ایک بہت بڑے خطرے سے خبردار کرنے آیا ہوں۔"

"خطرہ اور مجھے۔؟"

"ہاں، ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تم دنیا کے شاطر ترین بدمعاش رومی کے اشاروں پر ناچ رہے ہو۔ وہ تمہیں اندھیرے میں رکھ کر ایک بہت بڑی رقم پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد تمہیں قتل کرنا چاہتا ہے۔"

وہ چونک کر اچھل پڑا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اس کی آواز حلق میں اٹکنے لگی۔

جاوید سیما کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکرایا تاکہ سیما یہ جان لے کہ اس نے پہلے ہی جھٹکے میں اقبال سنگھ سے یہ اعتراف کرا لیا ہے کہ وہ رومی کو جانتا ہے۔

"پہلوان۔ میں تمہیں مختصراً سمجھاتا ہوں تاکہ تم خود کوئی فیصلہ کر سکو ہماری تنظیم مافیا بہت دنوں سے رومی کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ رومی نے مافیا کے لوگوں کو ایک کے بعد ایک بہت دھچکے دیئے ہیں اس لئے ہماری اس کی دشمنی پرانی ہے لیکن اس مرتبہ ہم اس سے حساب چکتا کر لیں گے۔"

"کر لینا۔ لیکن میرا ان معاملات سے کیا تعلق۔؟"

"وہی بتا رہا ہوں۔ اس نے تمہارے ذریعے بلیک میلنگ کا جال پھیلایا ہے۔ سامنے والی پارٹی اس کے پنجے میں جکڑی ہوئی ہے وہ اسے منہ مانگی رقم دینے کے لئے تیار ہو گئی۔ بدلے میں پارٹی اسی چیز کا مطالبہ کر رہی ہے جو اس کی کمزوری ہے یہ میں نہیں جانتا کہ وہ چیز کیا ہے لیکن وہ چیز شاید تمہارے قبضے ہے اس لئے رومی اب سے دو تین گھنٹے پہلے یہاں آیا تھا۔ اس وقت تم اپنے فلیٹ پر نہیں تھے۔ اس نے کافی دیر تمہارے فلیٹ کی تلاشی لی اور چلا گیا۔ ہمارے آدمی اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ وہ یہاں بہت جلد پہنچنے والا ہے اگر وہ خود نہیں آیا تو اپنے آدمیوں کو تمہارے پاس بھیج کر وہ چیز طلب کرے گا۔ جب وہ چیز اس کے ہاتھ میں پہنچ جائے گی تو وہ تمہیں قتل کرے گا۔ کیونکہ سامنے والی پارٹی یہ چاہتی ہے کہ اس کی کمزوری جاننے والا زندہ نہ رہے۔ رومی نے اس کی بات مان لی ہے۔"

ٹائیگر کو ٹھنڈا پسینہ آگیا ہے۔

"اس نے میری غیر موجودگی میں فلیٹ کی تلاشی لی۔؟"

"ہاں لی۔"

"وہ مجھے ڈبل کراس کرنا چاہتا ہے۔؟"

"ہاں کرنا چاہتا ہے۔"

"میں کیسے یقین کر لوں کہ تم نے جو کچھ کہا وہ درست ہے۔"

"باہر جھانک کر دیکھ لو۔ رومی کے چار آدمی مورچہ بندی کئے ہوئے ہیں۔ چاروں تربیت یافتہ قاتل ہیں۔ اب تم میں عقل ہو تو سوچ لو رومی نے انہیں تمہاری حفاظت کے لئے یہاں بھیجا ہے یا قتل کرنے کے لئے۔"

وہ یوں اچھل پڑا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ آگے بڑھا اور کھڑکی میں پڑے ہوئے پردے کی آڑ سے باہر جھانکا۔ ایک منٹ کے بعد وہ لوٹ آیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ چاروں بار بار ادھر ہی دیکھ رہے تھے لیکن دال میں ضرور کالا ہے۔"

"مطلب ہے۔؟"

"بھلا تم کس لئے میری ہمدردی پر اتر آئے۔ یہ سب بتانے کیوں چلے آئے یہاں۔"

"پہلوان تم نے بڑا معقول سوال پوچھا تمہیں خبردار کرنے کے بدلے ہم تم سے ایک بات معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ ہمارے آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔"

"کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔؟"

"رومی کا پتہ؟ ہمیں اس کا پتہ بتا دو تو ہم اسے وہیں سنبھال لیں گے۔ اور چاہو تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم مل کر اسے چاروں خانے چت کر دیں گے۔ پھر وہ تمہیں قتل کرنے کے قابل بھی نہیں رہ جائے گا۔"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

اُلٹے میں تمہاری آنکھوں کے سامنے اُسے قتل کر دوں گا۔"

ٹائیگر اقبال سنگھ بری طرح پریشان ہو اُٹھا۔ وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ رومی وہ فلمیں لے تو نہیں اُڑا۔ سب سے پہلے وہ انہیں چیک کرنا چاہتا تھا لیکن ان دو کی موجودگی میں ایسا کیا جانا ممکن نہیں تھا۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر وہ خود اس دنیا میں نہیں رہا ــــ تو ان فلموں کی کیا اہمیت؟

"کیا سوچنے لگے۔ اس کا پتہ بتا دو اور اپنے بچاؤ کی تیاری کرو۔" جاوید نے اسے فکرمند پا کر کہا تو وہ اپنے پریشان کن خیالات سے چونک پڑا۔

"حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں۔"

اس درمیان سیما نے جاوید کا ہاتھ دبا دیا تو جاوید فوراً سمجھ گیا۔

"اس کے چار آدمی باہر موجود ہیں۔ انہیں اس کی رہائش گاہ کا علم ہوگا۔ پہلوان اگر ہم انہیں آڑے ہاتھوں لے لو تو پتہ بھی معلوم ہو جائے گا اور وہ پٹ پٹا کر خوف زدہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوں گے۔ پھر شاید تمہیں قتل کرنے کے حکم پر عمل نہ کر سکیں۔ ایک پرانی کہاوت ہے جو پہلے مارے وہ میرا۔"

اس کا چہرہ غم و غصے کی شدت سے تمتما اُٹھا۔ وہ سینہ تان کر اٹھا اور بولا۔

"آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہارے سامنے ہی انہیں سمجھ لیتا ہوں۔"

"چلو پہلوان۔ ہمیں صرف اس سنگار کا پتہ چاہیئے۔"

وہ تینوں نیچے آئے۔ سڑک پر اکا دکا راہ گیر آ جا رہے تھے۔

اقبال سنگھ نے دیکھا کہ ایک شخص بند ہوتے ہوئے ہوٹل کے پاس کھڑا تھا۔ دوسرا کچھ فاصلے پر اور بقیہ دو سڑک کے مشرق اور مغرب کی طرف۔

"پہلوان اگر تم ان کی پٹائی کا ارادہ رکھتے ہو تو ذرا عقل سے کام لینا پڑے گا۔ ہم تینوں عمارت کے پچھلے حصے میں چلتے ہیں۔ وہ یقیناً ادھر آئیں گے۔ تب تمہیں میرے بیان کی تصدیق بھی ہو جائے گی کہ وہ غلط ارادے سے یہاں موجود ہیں۔"

"پہلوانوں کو جب غصہ آتا ہے تو عقل ان سے دُور بھاگ جاتی ہے۔" وہ جواباً بولا۔ "تم نے واقعی عقل کی راہ دکھائی۔"

جاوید اور سیما ٹائیگر کے ساتھ چکر کاٹ کر عمارت کے عقبی حصے میں آ گئے۔ ادھر میدان پڑا ہوا تھا۔ روشنی تھی لیکن بہت کم۔ جاوید کے اشارے پر وہ ایک تاریک گلی میں گھس کر ان کا انتظار کرنے لگے۔

مشکل سے دو منٹ کے بعد انہیں قدموں کی آوازیں سنائی دیں پھر وہ چاروں ٹھیک اسی گلی کے سامنے رک کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔

"ٹائیگر بھاگ گیا۔؟" ان میں سے ایک نے کہا۔

"اس کے ساتھ وہ دو کون تھے؟"

"ہمارے دشمنوں کے علاوہ اور کون ہو سکتے ہیں۔"

یہ الفاظ سن کر جاوید نے اطمینان کا سانس لیا۔ ٹائیگر اقبال سنگھ کو یقین ہو گیا کہ وہ چاروں اس کی فکر میں ہیں لہٰذا وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور دوڑ لگا کر چاروں پر چھلانگ لگا دی۔

وہ انہیں لئے دیئے گرا۔ ایک ساتھ دو کی گردنیں دبوچ کر اس زور سے ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکرائے کہ وہ چیخ پڑے لیکن ان کے سر پھٹ گئے۔ بغیر دو جیسے ہی اُٹھے۔ ٹائیگر اقبال سنگھ نے ان کے پیر پکڑ لئے۔ ان دونوں نے اس پر گھونسے برسانے شروع کر دیئے لیکن کوئی نتیجہ نکلتے نہ دیکھ کر وہ بدحواس ہو گئے۔

"ان دونوں کی طرح مرنا چاہتے ہو۔؟" اقبال سنگھ غرایا۔

"نہیں۔" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"تمہیں کس نے بھیجا تھا نام بتاؤ۔؟"

وہ خاموش رہے۔

"بتاؤ، ورنہ ہاتھ پیر توڑ کے رکھ دوں گا۔"

"ایک آدمی نے۔ نام نہیں جانتے۔"

"وہ کہاں رہتا ہے۔ بتاؤ ورنہ۔"

"وہ ــ وہ ــ"

اور تب ایک ساتھ وہ دونوں چیخ کر اپنا پیٹ دبا بیٹھے۔ ٹھیک اسی وقت جاوید گلی میں سے نکلا اس کی نظر ایک ریوالور والے شخص پر پڑ گئی تھی۔ وہ مشترک اس کے تعاقب میں دوڑا۔ اس درمیان اس شخص نے پلٹ کر دو مرتبہ اس پر فائر کئے۔ لیکن وہ جھک گیا۔ فائر کی آواز نہیں ابھری تھی اور ریوالور نے آگ ہی اگلی۔

وہ کار میں بیٹھ گیا اور کار تیزی سے دوڑ پڑی۔

جاوید کو واپس لوٹ آنا پڑا۔

"وہ ہاتھ سے نکل گیا۔" جاوید نے ٹائیگر کو بتایا۔ "اس نے ریوالور سے فائر کیا تھا۔ تمہاری قسمت اچھی تھی جو تم بچ گئے۔ ورنہ تمہارا کام تمام کر دیا گیا تھا۔"

اتنا کہہ کر جاوید نے جیب سے ٹارچ نکال کر ان دونوں کو دیکھا اتنے کم وقت میں ان کے چہرے نیلے پڑ گئے تھے اور وہ دم توڑ چکے تھے۔

انہیں چیک کرنے پر ایک کے پیٹ میں اور دوسرے کے دل کے ذرا نیچے سوئی جیسا باریک سوراخ تھا اور وہاں خون کا ایک قطرہ موجود تھا۔

* * *

مہر بے حد خوفزدہ اور انتہائی بدحواس تھا۔ کرنل زاہد اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ کمرے میں ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔

"میں آپ سے کہہ چکا ہوں۔" وہ آہستہ سے بولا۔ "ریان اینڈ ریان

کامپلیکس کا بچانا میرے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا میرے جسم میں روح کا موجود رہنا۔ اس کامپلیکس میں میرا سب سے زیادہ سرمایہ لگا ہوا ہے اس لیے اس کا مطالبہ منظور کر لینے کے علاوہ میرے لئے اور کوئی راستہ نہیں۔ اس طرح میری عزت بھی بچ جائے گی اور وہ فلمیں بھی مل جائیں گی۔ میں آپ سے پھر یہی کہوں گا کہ آپ یہاں سے فوراً چلے جائیے۔ نہ میری لڑکی غلط راستے پر چلتی۔ نہ مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا۔"

"لیکن یہاں میری موجودگی سے کیا اثر پڑتا ہے۔"

"میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔"

"میں آپ کی بات مان کر جا سکتا ہوں۔ لیکن میں چاہوں گا آپ یہ بتائیں کہ وہ سونا کہاں اور کس طرح محفوظ رکھا ہے۔؟"

"اگر میں یہ بتانے سے انکار کر دوں تو؟"

"میں پھر بھی اس کیس سے دست بردار نہیں ہو سکوں گا۔"

"سونا اور وہ جگہ دیکھ کر آپ کیا کریں گے۔؟"

"میں چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ سونا تو آپ اسے فلموں کے عوض حوالے کر ہی دیں گے۔ جب وہ سونا لے کر جائے گا تب میں اپنا کام شروع کر دوں گا۔"

"آپ کا یہ قدم بھی میرے لئے خطرناک ہوگا۔ وہ جان جائے گا کہ میں نے آپ کو خبردار کیا ہے۔ تب جوابی کارروائی ہوگی۔"

"میری جوابی کارروائی اتنی شدید اور پراثر ہوگی کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکے گا۔"

"آیئے۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دروازے اور کھڑکیوں کے پردے درست کئے۔ اس کے بعد مہرہ کرنل زاہد کو اپنے ساتھ لئے ہوئے باتھ روم میں داخل ہوا۔ یہ باتھ روم سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ اس کی چھت کے پتھر دکھائی نہیں دے رہے تھے بلکہ چھت آئینہ خانہ بنی ہوئی تھی۔ باتھ روم ایک اچھا خاصہ طویل و عریض کمرے جیسا کشادہ تھا۔ باتھ ٹب کے دائیں بائیں۔ بڑے بڑے آئینے لگے تھے۔ ایک ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ اس پر زمانے بھر کی پرفیومری اور میک اپ کا سامان تھا۔

مہرہ نے ڈریسنگ ٹیبل کے قریب پہنچ کر اس سنگار میز کے بڑے آئینے پر انگلیوں کی پشت سے ہلکی ہلکی ضربیں لگائیں۔ کرنل زاہد انہیں گنتا رہا۔ دس ضربوں کے بعد وہ باتھ ٹب سرک کر دوسری دیوار سے جا ملا۔ اور جہاں باتھ ٹب تھا، فرش کے اس حصے میں چار بریف کیس رکھے ہوئے تھے۔ فرش کا بقیہ حصہ خالی پڑا ہوا تھا۔

مہرہ نے چاروں آف بریف کیس کھول کر دکھائے۔ ان میں سونے کے بسکٹ تھے۔ بریف کیس ان بسکٹوں سے جو دراصل سونا تھا بھرے ہوئے تھے۔

"ان چاروں میں باون کلو سونا تھا۔ موجودہ مارکیٹ ریٹ کے مطابق کی مالیت ایک کروڑ روپیہ ہے۔"

"بند کر دیجئے۔"

مہرہ نے وہی عمل دہرایا۔ باتھ ٹب سرک کر وہیں آ گیا۔

"اس کا علم کسی کو بھی نہیں۔"

"یہاں تک کہ میری دوسری بیوی کو بھی نہیں۔؟"

اگر دمی یہاں آیا اور آپ نے سونا اس کے حوالے کر دیا تو وہ ۵۲ کلو سونا تنہا اٹھا کر تو نہیں جا سکتا۔"

"یقیناً۔"

"یا تو وہ اپنے ساتھ اس کے اٹھانے کے لئے اپنے آدمی لائے گا یا پھر آپ سے کہے گا کہ ان چاروں بریف کیسوں کو اٹھوا کر کار میں رکھوا دیا جائے۔ کار اس کی ہو سکتی ہے یا پھر وہ اس مقصد کے لئے آپ کی کار بھی لے جا سکتا ہے۔"

"دونوں باتیں ممکن ہیں۔"

وہ دونوں کمرے میں لوٹ آئے۔

"میں نے آپ کی بات مان لی۔ بہتر ہوگا کہ اب آپ۔" مہرہ نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں جا رہا ہوں لیکن آپ قطعی خوفزدہ نہ ہوں۔ میں جلد ہی کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کر دوں گا کہ سونا بھی ہاتھ سے نہ جا سکے اور وہ کمبخت بھی۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ مجھے اور میرے کامپلیکس کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔"

کرنل زاہد نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مہرہ نے دروازہ کھولا۔ دروازے کے باہر ایک مسلح باڈی گارڈ موجود تھا۔

"آپ کو صدر دروازے تک رخصت کر آؤ۔ دروازہ اندر سے بند کر دو۔ انے کے بعد واپس لوٹنا۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ وہ انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر اپنے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہاں رینا ایک انگریزی ناول پڑھ رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر مہرہ کو دیکھا۔ تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ڈیئر۔ میں نے سنا ہے کہ سمیر نامی وہ نوجوان یہاں کسی دوسرے مقصد سے بلایا گیا ہے۔؟"

"کیا سنا ہے تم نے؟" وہ اسے دیکھنے لگا۔

"یہی کہ تم اسجو کی شادی اس کے ساتھ کرنا چاہتے ہو۔؟"

مہرہ نے اطمینان کی سانس لی۔

"ہاں۔"

"اور یہ بات تم نے مجھ سے چھپائی۔"

"چھپانے کا سوال نہیں مجھے یہ فیصلہ فوری طور پر کرنا پڑا۔۔۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے۔؟"

"بالکل نہیں مجھے خوشی ہوگی۔ لیکن فوری فیصلہ کیوں۔"

"وہ ضرورت سے زیادہ ہاتھ پیر نکال بیٹھی ہے۔"

"انجو مجھ سے ملی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ سمیرا اسے قطعی پسند نہیں وہ الٹا مجھ پر الزام رکھ رہی تھی کہ میں نے اس کے ڈیڈی کو بھڑکایا ہے۔"

"تم اس نالائق کی باتوں پر نہ جاؤ۔ میں اسے ٹھیک کرادوں گا۔"

"کلّا میاں کا کچھ اتا پتہ چلا؟ آخر اس نے وہ سب کیوں کیا تھا؟"

"نہیں۔ مجھے بور مت کرو ڈارلنگ۔"

"میں دنیا کی حسین ترین لڑکی تمہیں بور لگنے لگی۔۔" اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔

اوہ۔ "میں معافی چاہتا ہوں۔" مہرہ نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ "میں ذرا پریشان ہوں۔"

"اس پریشانی کی وجہ نہیں بتاؤ گے۔؟ کہیں انجو آوارہ تو نہیں ہوگئی ہے۔؟"

مہرہ کو یوں لگا جیسے اس کی بیوی نے اس کے منہ پر طمانچہ دے مارا ہو۔

"میں کل تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔"

برابر کے کمرے سے فون کی آواز سنائی دینے لگی تو مہرہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

"ہیلو۔" اس کی آواز میں گھبراہٹ شامل تھی۔

"میں رومی بول رہا ہوں۔ میں آج رات کسی بھی وقت پہنچ جاؤں گا۔ لیکن کوئی غلطی یا شرارت نہ ہو۔۔۔ ورنہ۔۔"

"نہیں ہوگی۔۔۔ میں اپنے کامپلیکس کو محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"رومی اپنی زبان کا پابند ہے۔ اگر تمہاری طرف سے گڑبڑ نہیں ہوئی تو کہیں گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

نوجوان نسل کے نمائندہ ناول نگار ذوالقرنین کا ناول،

تنہا مسافر

آنسوؤں، سسکیوں اور قہقہوں کی داستان

ایک طوفان

بپھرتا طوفان

ایک ایسا ناول جو دلوں کو گرما دے

بجھتے دیئوں کو روشن کر دے

جو "کمہاکر مسافر تو گیا"

کے عنوان سے کرن میں قسط وار چھپتا رہا

اور بے حد مقبول ہوا۔

ایک خاصا اوٹ پٹانگ ناول

اب کتابی صورت میں چھپ کر تیار ہے۔

آفسٹ پیپر • بڑا سائز • مجلد

قیمت 120/ روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

۳۷، اردو بازار کراچی نمبر ۱

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

ٹائیگر اقبال سنگھ جاوید اور سیما کے ساتھ واپس اپنے فلیٹ پر لوٹ آیا تھا۔

"پہلے مجھے تمہارے بیان پر شک تھا لیکن اب یقین کرنے کے علاوہ کوئی گنجائش نہیں۔ میں تمہارا احسان مند ہوں کہ تم نے مجھے رومی کی غداری سے بروقت آگاہ کر دیا۔"

"پہلوان۔" جاوید نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "اپنا اصول ہے کہ دوستی کرو تو جم کر کرو اور دشمنی پر اترو تو کھل کر۔ مجھے افسوس اس کا ہے کہ وہ شخص بھاگ نکلا۔ اب وہ رومی کو خبر کرے گا اور یہ بھی کہے گا کہ تمہارے ساتھ ایک لڑکی اور شخص تھا — یعنی ہم دونوں۔"

"پھر —؟"

"ہمیں رومی کا پتہ چاہیے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ یہاں آئے گا اس لیے تم ہمیں اسی فلیٹ میں چھپائے رکھو۔ وقت پڑنے پر ہم تمہاری مدد بھی کر سکیں گے۔"

"لیکن۔" سیما نے جاوید کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جب وہ بھاگا ہوا شخص رومی کو سب کچھ بتا دے گا۔ تب یہ بھی تو ممکن ہے کہ رومی یہاں نہ آئے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" اقبال سنگھ نے اس کی تائید کی۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ تینوں چونک پڑے۔ جاوید نے اشارے سے سمجھا دیا کہ وہ آ گیا ہے۔

"کون؟" اقبال سنگھ نے پوچھا۔

"تمہارا باپ —" جواب ملا۔

اقبال سنگھ نے اسے اندرونی کمرے میں پہنچنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اُدھر جاوید اور سیما دوسرے کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ کھلا رہنے دیا۔ اندرونی دروازے پر بھی پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ دروازے کے دونوں پٹوں کی آڑ میں رہ کر پردے سے جھانکنے لگے۔ خود ان دونوں کے دل بھی تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ محض اس لیے کہ بدنام زمانہ رومی کا نام انہوں نے بھی سُن رکھا تھا۔

دروازہ کھلا۔ اقبال سنگھ ایک قدم پیچھے سرک گیا۔ آنے والا دُبلا پتلا ہڈیوں کی مالا رومی ہی تھا۔ اس نے سُرمئی قمیض اور نیلی بیل باٹم پہن رکھی تھی۔ پیروں میں اونچی ہیل کا سیاہ چمکتا ہوا جوتا تھا جس سے اس کا قد کچھ بڑھ گیا تھا۔

اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں بے پناہ سفاکی اور چہرے پر غضب کی مکاری ابھری ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس نے پینٹ کی سامنے والی جیبوں میں داخل کر رکھی تھیں اور وہ اقبال سنگھ کو یوں گھور رہا تھا جیسے کچا ہی چبا جائے گا۔

"وہ دونوں کون تھے؟"

"کس کی بات کر رہے ہو؟" اقبال سنگھ نے پوچھا۔

"ایک مرد اور ایک عورت۔"

"وہ میرے دوست تھے ملنے آئے تھے۔"

"اس کا مطلب ہوا کہ چلے گئے۔"

"ہاں۔"

"تم نے میرے آدمیوں پر حملہ کیوں کیا؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ وہ تمہارے آدمی تھے۔ میں باہر نکلا تو تو وہ چاروں مجھ پر چڑھ دوڑے۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی وہی کرتا جو میں نے کیا۔"

"تم ان سے میرا پتہ معلوم کر رہے تھے؟"

"غلط — تم میرے ساتھ غلط برتاؤ کر رہے ہو ماسٹر" اقبال سنگھ نے غراتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ تمہارے آدمی تھے تو میں بھی تمہارا آدمی تھا تم نے ان چاروں کو کیوں بھیجا۔"

"ابے۔" رومی نے کچکچا کر کہا۔ "میں یہاں آنے والا تھا اس لیے انہیں بھیج دیا تھا کہ وہ یہ اطمینان کر لیں کہ یہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔"

پل بھر کے لیے اقبال سنگھ چکرا کر رہ گیا۔

"اگر ایسا تھا تو ان چاروں نے میرا تعاقب کیوں کیا۔"

"یہ سمجھ کر کہ تو کہیں باہر جا رہا ہے۔ روکنے کے لیے لپکے ہوں گے۔ مجھے وہ تینوں فلمیں چاہئیں ابھی اسی وقت۔"

"ہمارے درمیان ایک سمجھوتہ ہے۔"

"کوئی بکواس نہیں — مجھے فلمیں چاہئیں، ابھی اسی وقت ورنہ —"

اقبال سنگھ اس کی آنکھوں اور چہرے کی سفاکی دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔ وہ پلٹا اور مسہری کے پائے کھول ڈالے انہیں الٹا۔ فلمیں نہیں تھیں۔!

فلمیں غائب ہیں۔ وہ پلٹ کر اٹھ کر کھڑا ہوا "ماسٹر تم مجھے ڈبل کراس نہیں کر سکتے۔ سمجھوتے کے مطابق پچاس لاکھ کا سونا میرا ہے۔ تم وہ سونا خود ڈکار لینا چاہتے ہو۔"

"کیا بک رہا ہے گدھے۔"

"تم آج شام یہاں آئے تھے اور وہ فلمیں چرا لے گئے" رومی کا چہرہ خوفناک ہوتا چلا گیا۔ اقبال سنگھ کے

ہاتھ میں مسہری کا پیتل کا پیالا تھا۔ وہ اس نے رومی کے سر پہ مارا لیکن رومی نے پلک جھپکتے ہی نہ صرف اس کا وہی ہاتھ پکڑ لیا بلکہ اس ہاتھ کو موڑا۔ پہلوان کو پیٹھ پر لیا اور فرش پر دے مارا۔

جاوید اور سیما کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

اقبال سنگھ تیزی سے پلٹ گیا اور اپنے اوپر چھلانگ لگانے والے رومی کو ایک زوردار ٹھوکر دے ماری وہ اچھل کر دروازے کے قریب گرا۔ اقبال سنگھ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر بڑھا تاکہ اسے دبوچ کر اس کی ہڈیاں پسلیاں ایک کر دے۔

رومی نے وہیں سے ایک حیرت انگیز فلائنگ ڈائی ماری۔ اقبال سنگھ نے اسے اپنے سینے پر لیا لیکن رومی کے دونوں پیر پکڑ لئے۔ رومی لمحہ بھر کے لئے اوندھا لٹکا۔ اس کی کھڑی ہتھیلیاں اقبال سنگھ کے گھٹنوں پر پڑیں۔ اقبال سنگھ چیخ پڑا اور رومی کے پیر اس کی گرفت سے چھوٹ گئے۔ فوراً رومی کسی چھلاوے کی طرح اچھل کر اس کے جسم سے چپک گیا۔ اپنے دونوں پیروں سے اقبال سنگھ کا نچلا جسم جکڑ لیا۔ اور دونوں ہاتھ اس کی بغلوں سے لیکر گردن تک پہنچا دیئے۔

اقبال سنگھ پیاسے اونٹ کی طرح بلبلا اٹھا۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کی ہڈیاں پسلیاں اور گردن سب ٹوٹ رہی ہوں۔

"خبردار" جاوید کمرے سے باہر نکل آیا اور ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ رومی نے گردن موڑ کر اطمینان سے اسے دیکھا لیکن وہ اقبال سنگھ کے جسم سے کسی جونک کی طرح چپکا ہوا تھا اور اقبال سنگھ لڑکھڑا رہا تھا۔

"اس کھلونے کو اپنی جیب میں رکھ لو" وہ اسی حالت میں رہ کر غرایا" اور وہ لڑکی کہاں ہے۔"

سیما بھی ریوالور تانے سامنے آگئی۔

"اسے چھوڑ دو، ورنہ میں گولی مار دوں گا" جاوید غرایا۔

تب تک رومی نے اقبال سنگھ کی کوئی ایسی رگ دبائی کہ وہ رومی کو لئے ہوئے اچھل پڑا۔ اس کا اچھلنا تھا کہ رومی اس کے جسم سے اچھل کر سیدھا سیما پر گرا۔ سیما اس پر فائر کر دینا چاہتی تھی لیکن اسے موقع نہیں مل سکا۔

جاوید ادھر بڑھ ہی رہا تھا کہ اس نے سیما کو یوں اچھال دیا جیسے وہ کوئی ہلکی پھلکی گیند ہو۔ سیما تقریباً چھ فٹ اونچی اچھل کر جاوید پر گری بس یہیں پل بھر کے لئے جاوید چوک گیا۔ اس کی نظر اچھلتی ہوئی سیما پر گئی اور رومی خود اس پر۔

اس نے جاوید کی کنپٹی پر اس پھرتی سے ہتھیلی کا وار کیا کہ وہ فوراً ہی اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔

ادھر سیما گرنے کے بعد اٹھ ہی رہی تھی کہ رومی نے اپنی لات چلا دی اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر وار کیا۔ سیما کی آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے اور وہ بھی تکلیف کی شدت سے اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا لباس جھاڑتے ہوئے غرایا۔

"وہ فلمیں کہاں ہیں؟ میں تیری جان بھی لے سکتا تھا۔ لیکن مجھے فلمیں چاہئیں۔"

"وہ نہیں ہیں۔ ان دونوں نے مجھے بتایا تھا کہ وہ فلمیں تم خود میری غیر موجودگی میں یہاں سے چرا لے گئے ہو۔"

"اوہ کون ہیں یہ؟"

"میں نہیں جانتا۔ اتنا معلوم ہے کہ یہ دونوں مافیا کے ممبر ہیں اور تم سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔"

وہ اپنا سر کھجانے لگا۔

"ان کا تعلق مافیا سے ہے؟ لیکن اچانک یہ لوگ یہاں کیسے آ ٹپکے۔ خیر، نیچے وین گاڑی کھڑی ہے۔ ان دونوں کو اٹھاؤ اور اس میں ڈال دو۔ اگر کوئی شرارت کی تو میں تمہاری گردن پیٹ میں اتار دوں گا۔"

اقبال سنگھ اس سے انتہائی خوف زدہ تھا۔ اس نے جاوید اور سیما کو کندھوں پر لاد لیا اور نیچے لے آیا۔ نیچے ایک وین گارڈ کھڑی ہوئی تھی۔ اقبال سنگھ نے انہیں اناج کے تھیلوں کی طرح وین کے ایک حصے میں گرا دیا۔

⁂

کرنل زاہد نے ٹرانسمیٹر پر مہرہ سے گفتگو کرنے کے بعد جاوید کو اقبال سنگھ پر نظر رکھنے اور وقت پڑنے پر ضروری قدم اٹھانے کی ہدایت کے بعد روانہ کر دیا تھا اور اس کے پیچھے سیما کو!

اس کے بعد وہ پھر سمیر کے میک اپ میں مہرہ سے ملنے چلا گیا تھا لیکن وہ محل سے دور رہ کر کار سے اتر گیا تھا۔ ایک جگہ چھپ کر وہ یہ چیک کرنا چاہتا تھا کہ وہاں رومی کے آدمی تو موجود نہیں جو نگرانی کر رہے ہوں۔!

اسے تقریباً تیس منٹ کے بعد ایک شخص کو محل سے نکل کر اور ایک کار میں بیٹھتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ وہ شخص خود اس کے یعنی سمیر کے میک اپ میں تھا۔

اس ڈبل کراس کی اسے قطعی امید نہیں تھی۔ اس نے سوچا

کہ کیا وہ رومی کی نگاہوں میں آگیا ہے؟ کیا اس نے اسے کرنل زاہد کی حیثیت میں پہچان لیا ہے؟ اور اتنے کم وقت میں اس شخص پر سمیر کا میک اپ کس طرح کیا گیا؟

جب وہ کار اس کے سامنے سے گزری تو وہ اپنی کار میں پہنچا اور اپنے ہم شکل کے تعاقب میں نکل پڑا تاکہ اس کے ذریعے وہ رومی تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔

کار وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔ تعاقب کا یہ سلسلہ بھری بری سڑکوں پر تقریباً تین میل تک جاری رہا۔ پھر وہ کار کیفے کاسینو کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ وہ شخص کار سے اترا۔ اس نے پلٹ کر دیکھنا بھی مناسب نہیں سمجھا اور کاسینو کے ہال میں داخل ہو گیا۔

کرنل زاہد نے وہاں تک پہنچنے میں تاخیر نہیں کی۔ مشکل سے ایک منٹ کے بعد وہ بھی داخل ہوا۔ وہاں ریسپشنسٹ گرل نے دروازے پر اس کا استقبال کیا۔ وہ ہر آنے والے کا مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کرتی تھی۔

کرنل زاہد نے جیسے ہی صدر دروازے میں قدم رکھا تھا ویسے ہی وہ اسے دیکھ کر چونک پڑی تھی لیکن زاہد نے اس پر کوئی توجہ نہ دے کر ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ وہ لوگ مشکل سے تیس چالیس تھے اور وہ شخص وہاں نہیں تھا۔!

زاہد نے پلٹ کر اس لڑکی سے پوچھا۔

"ابھی ابھی یہاں ایک شخص داخل ہوا تھا؟"

"میں بھی آپ سے اسی سلسلہ میں پوچھنا چاہتی تھی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"وہ کدھر گیا۔؟"

"باہر۔ ابھی ابھی۔"

"ناممکن۔!" زاہد کی چبھتی ہوئی نگاہیں اس پر جم گئیں۔

"اس اجنبی اور آپ کے ہم شکل کی حرکت ہال میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں نے دیکھی ہے۔ آپ چاہیں تو ان سے پوچھ لیجئے۔"

"اتنے کم وقت میں اس نے کونسی چونکا دینے والی حرکت کی؟ کہ یہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے؟"

"وہ اس شیشے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ دائیں جانب دیوار سے چپک کر کھڑا ہوا۔ فوراً ہی اس نے وگ اتاری ہونٹوں پر سے مونچھیں اتار کر کوٹ کی جیب میں داخل کیں۔ جب آپ یہاں دروازے سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہ دروازے سے باہر جا رہا تھا۔"

"اوہ۔ وہ گنجا تو نہیں تھا۔" زاہد چونک پڑا "میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا۔!"

"جی ہاں وہی۔"

زاہد فوراً پلٹا اور تیزی سے کار کی طرف لپکا۔

وہاں اس کی کار نہیں تھی۔ وہ بڑے اعتماد اور خوبصورتی سے چکمہ دے کر نکل بھاگا تھا۔

زاہد نے کار اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ اس کار کے نمبروں سے اسے کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ چوری کی ہو سکتی تھی یا اس کی نمبر پلیٹ فرضی ہو سکتی تھی۔

اس نے فوراً ہی فیصلہ کیا کہ اسے ٹائیگر اقبال سنگھ کے یہاں پہنچنا چاہیئے۔ اگر اس کے ساتھ اتنے کم وقت میں اتنی زبردست چوٹ ہو سکتی ہے تو جاوید کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔!

کیفے کاسینو سے وہاں تک فاصلہ طویل تھا۔ جب وہ ٹائیگر مینشن کے قریب پہنچا تو اس کی نظر ٹائیگر اقبال سنگھ پر پڑی جو خود بھی وین میں سوار ہو رہا تھا اور ایک دبلا پتلا آدمی ریوالور ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ زاہد نے اپنی کار قریب لاکر تیزی سے بریک لگائی اور رومی کی سمت باہر کود پڑا۔

"ہینڈز اپ" رومی نے ریوالور اس کی طرف کر دیا

کرنل زاہد نے ہاتھ نہیں اٹھائے۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں گھورنے لگا جیسے ایک شیر دوسرے شیر پر جھپٹ پڑنے کی تیاری میں ہو۔

"کیا تکلیف ہے تمہیں۔" زاہد کا لہجہ تیکھا تھا۔

"میں خطرے کے مرض میں مبتلا ہوں۔ اس سے میری تکلیف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کرنل زاہد۔"

"اوہ۔" زاہد نے لمبا سا سانس لیا "تم نے مجھے پہچاننے میں غلطی نہیں کی۔ اگر میں یہ کہوں کہ تم رومی ہی ہو تو غلط نہ ہوگا۔"

"بلاشبہ میں رومی ہوں۔" وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا

"لیکن باتوں کی آڑ میں مجھ پر چھلانگ لگا دینے کا ارادہ رہنے دو کرنل۔ میری رگ رگ میں فتنے بھرے ہوئے ہیں۔"

"اس وین گارڈ میں کسے لئے جا رہے ہو؟"

"ایک کا نام کیپٹن جاوید اور دوسری کیپٹن سیما ہے۔ تمہاری پرسنل سیکرٹری کیسی رہی۔"

"تمہیں میری اور ان کی اصلیت کا پتہ کیسے چلا؟"

"میں جس ملک یا شہر میں قدم رکھتا ہوں۔ وہاں جن سے خطرہ ہوتا ہے۔ ان کی نگرانی بہت پہلے سے شروع کروا دیتا ہوں امید ہے کہ میری بات سمجھ میں آگئی ہوگی۔"

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

"آگئی ۔ بہتر ہوگا کہ تم ریوالور پھینک دو۔ ورنہ میری میری جوابی کارروائی تمہیں مہنگی پڑے گی۔"

"دنیا بھر کی پولیس اور سیکرٹ ایجنٹ جب میرا بال بیکا نہیں کرسکے۔ کرنل تو تم میرا کیا بگاڑ لوگے۔"

"مجرموں کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ان کی قسمت ان کا ساتھ نہیں دیتی۔"

"بالکل درست کہا کرنل ۔ لیکن میں اتنا مکار ہوں کہ قسمت بھی مجھ سے ڈرتی ہے اور ساتھ دینے پر مجبور رہتی ہے ۔ ویسے میں سرکاری آدمیوں کا خون خرابہ پسند نہیں کرتا کیونکہ وہ بیچارے اپنی روزی روٹی کے لئے مجرموں کے پیچھے شکاری کتوں کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ میں انہیں اپنے پیچھے اس وقت تک دوڑاتا رہتا ہوں جب تک کہ وہ تھک کر ہانپنے نہ لگیں اور ان کی زبانیں باہر نہ نکل آئیں۔ تم اپنے دونوں ساتھیوں کی فکر مت کرو۔ میں انہیں تھوڑا بہت سبق سکھا کر چھوڑ دوں گا تاکہ یہ زندہ رہ کر یہ بتا سکیں کہ رومی کس واہیات بلا کا نام ہے ۔ اب تم جا سکتے ہو کرنل۔"

"میں تمہارے الفاظ الٹے تمہارے حلق میں ٹھونس دوں گا۔" اتنا کہہ کر اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا ہی تھا کہ رومی تیزی سے پلٹا اور اس نے فائر کر دیا۔

وین گارڈ میں سے اقبال سنگھ اچھل کر اس پر حملہ کرنے ہی والا تھا۔ وہ حملے کے لئے زاہد کے اشارے کا منتظر تھا۔ لیکن جیسے ہی رومی پلٹا۔ اقبال سنگھ بڑی پھرتی سے بیٹھ گیا۔

اس کا فائر خالی گیا اور تب تک کرنل زاہد نے اس پر چھلانگ لگا دی۔

وہ تیزی سے بیٹھ گیا۔ زاہد وین گارڈ سے ٹکرایا اور تیزی سے پلٹ کر رومی کے ہاتھ پر ٹھوکر دے ماری۔ تب تک وہ زاہد پر فائر کر چکا تھا لیکن زاہد بال بال بچ گیا۔ اور گولی وین گارڈ کی چھت چھوتی ہوئی نکل گئی۔

فائر کی آواز کی وجہ سے آس پاس کی عمارتوں کی کھڑکیاں کھل گئیں، خوف زدہ چہرے باہر جھانکنے لگے۔

رومی نے اپنا ہاتھ جھٹکا۔ ہاتھ پر پڑنے والی چوٹ سخت تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنا دایاں ہاتھ سیدھا کیا اور آگے بڑھنے لگا۔ اچانک وہ یوں اچھلا جیسے اس کے پیروں میں اسپرنگ لگے ہوں۔ اس نے کرنل زاہد کی کنپٹی پر کھڑی ہتھیلی کا وار کرنا چاہا زاہد تیزی سے جھکا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے دونوں بازوؤں میں کس لیا۔

رومی نے جواباً اپنا سر اس کے سر پر دے مارا۔ ان کے سر ٹکرانے سے یوں آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی ناریل پھوٹا ہو!

"گاڑی لے جاؤ پولیس آرہی ہے۔" رومی چیخا۔

زاہد کا سر گھومنے لگا اور اس درمیان رومی کے دونوں ہاتھ اس کا گلا گھونٹنے لگے۔ وہ پوری طرح زاہد کے جسم سے چپک گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں اس کی ٹانگوں میں یوں الجھا کر جکڑ دی تھی جیسے کسی سانپ نے لپٹ کر بری طرح جکڑ لیا ہو۔

وہ اسی حالت میں زاہد کو جکڑے ہوئے نیچے گرا۔ اس درمیان زاہد کی آنکھیں پھر کام کرنے لگی تھیں اور وہ وین گارڈ اسٹارٹ ہونے اور وہاں سے اس کے روانہ ہو جانے کا احساس کر چکا تھا زاہد نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی سوکھی ہوئی کلائیوں پر جما دیئے۔

اچانک زاہد نے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ کروٹ لی۔ نتیجے میں رومی کی پیٹھ کے نیچے ایک بڑا اور نوکیلا پتھر آگیا۔ اب زاہد اس پر تھا۔ وہ زاہد کے نیچے اور اس کے نیچے وہ پتھر۔ زاہد نے ایک بھرپور جھٹکا مارا اور اس کے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن چھڑا کر ایک زوردار گھونسہ اس کے منہ پر دے مارا۔

ٹھیک اسی وقت وہاں ایک گشتی پولیس جیپ آگئی اس سے ایک پولیس انسپکٹر اور دو کانسٹیبل کود کر ادھر لپکے۔

اس مختصر وقفے میں زاہد نے دوسرا گھونسہ بھی اس کے منہ پر جڑ دیا۔ رومی بلبلا اٹھا لیکن اس نے ابھی تک زاہد کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگیں پھنسا رکھی تھیں۔

"بند کرو ۔ ورنہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔" انسپکٹر نے ریوالور کا رخ رومی کی طرف کر دیا۔

رومی نے زاہد والا حربہ استعمال کیا اور ایک جھٹکے کے ساتھ زاہد کو بھی لڑھکاتا ہوا دور تک لے گیا اور پھر جیسے ہی زاہد نے لڑھکتے لڑھکتے اس کا ایک ہاتھ پکڑ لینا چاہا تاکہ وہ گرفت میں آجائے تو ویسے ہی رومی نے ٹانگوں کی پکڑ ڈھیلی کر دی اور ہاتھ بچا کر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"انسپکٹر" رومی نے زاہد کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پیشہ ور قاتل مجھے قتل کر دینا چاہتا تھا۔"

زاہد میک اپ میں تھا۔ انسپکٹر نے اسے پہچانا نہیں تھا لمحہ بھر کے لئے انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھا تو رومی نے اچھل کر انسپکٹر پر حملہ کیا لیکن زاہد نے چیخ کر اسے ہوشیار کر دیا تھا۔ جواباً انسپکٹر نے جھک کر اس پر فائر کیا لیکن وہ خود کو بچا گیا۔ انسپکٹر

نے دوسرا، تیسرا فائر کر دیا لیکن وہ اپنی جگہ سے اچھلتا اور خود کو گولیوں سے صاف بچاتا ہوا پولیس جیپ کی طرف سرکتا رہا۔

"انسپکٹر" زاہد چیخا "میں کرنل زاہد ہوں اور یہ خطرناک مجرم رومی ہے۔ وہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے" زاہد رومی کی طرف دوڑ پڑا۔

اب رومی گھر گیا تھا۔ پیچھے سے دو کانسٹیبل اسے پکڑنے کے لئے پلٹ رہے تھے۔ سامنے سے انسپکٹر ریوالور لیئے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک طرف سے زاہد بڑھ رہا تھا اور ایک طرف جیپ کھڑی تھی اور کھڑکیوں سے جھانکنے والے یہ خوفناک ہنگامہ دیکھ رہے تھے۔

قریب تھا کہ دونوں کانسٹیبل اسے دبوچ لیتے کہ اس نے کھڑے کھڑے الٹی ڈائی ماری اور ان کانسٹیبلوں کے پیچھے پہنچ گیا دوسرے ہی لمحے کانسٹیبلوں کی گردنیں اپنے دونوں ہاتھوں کی کہنیوں کے درمیان جکڑیں اور پلک جھپکتے ہی الٹی ڈائی لگائی تو ان سپاہیوں کے سروں پر سے ہوتا ہوا انسپکٹر کے اوپر آیا۔ دونوں ٹانگیں سپاہیوں کی گردنوں میں ڈال کر انہیں جکڑ لیا اور ایک جھٹکا دیا۔

سپاہیوں کی بھیانک چیخیں ابھریں۔ ان کی گردنیں ٹوٹ چکی تھیں۔ ادھر جھٹکے کے زور میں انسپکٹر زاہد پر جا گرا جب کہ زاہد خود رومی پر چھلانگ لگا ہی رہا تھا۔

رومی کے لئے اتنا وقت بہت تھا۔ وہ اچھل کر جیپ تک پہنچا۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور جیپ اسٹارٹ کر دی۔ زاہد انسپکٹر کو اپنے اوپر سے دھکیل کر لپکا اور چھلانگ لگا کر جیپ کا پچھلا حصہ پکڑ لیا۔

جیپ کی رفتار ایک دم تیز ہو گئی۔ زاہد کچھ دیر تک تو گھسٹتا رہا پھر اس نے آہستہ آہستہ جسم کو اوپر اٹھانا شروع کر دیا تاکہ جیپ میں داخل ہو سکے۔

"کرنل" رومی نے لمحہ بھر کے لیئے پلٹ کر دیکھا اور غرایا "تمہاری موت تمہارے سر پہ کھیل رہی ہے"

"اپنی فکر کرو رومی۔ میں تمہیں بستر تک نہیں چھوڑوں گا"

رومی نے جیپ کی رفتار بڑھانا شروع کر دی۔

"میں نہایت ڈھیٹ واقع ہوا ہوں کرنل" وہ پھر چیخا "اگر قبر میری کھدی تو دفن تمہیں ہونا پڑے گا"

صورت حال انتہائی خطرناک تھی خصوصاً زاہد کی جان پہ بن آئی تھی کیونکہ وہ ابھی تک گھسٹتے ہوئے چل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس درمیان اپنی جیب میں پڑا ہوا ریوالور نکال لے لیکن ایک ہاتھ سے جیپ کو پکڑے رہنا ناممکن تھا پھر بھی اس نے کوشش کر دی۔

"اوہ" رومی غرایا "تم ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہے ہو کرنل" اس کے ساتھ ہی اس نے جیپ کو ٹرن دے کر اس کا بیلنس بگاڑا۔ زاہد مشکل ہی سے خود کو سنبھال سکا

"بہتر ہے کہ خود کو میرے حوالے کر دو" زاہد نے اسے للکارا "میں ریوالور نکال چکا ہوں"

رومی نے پلٹ کر دیکھا۔ زاہد کے دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھا لیکن وہ ریوالور کا رخ اس کی طرف کر نہیں پا رہا تھا۔

رومی نے اچانک جیپ کا رخ سڑک کے نشیبی علاقے کی طرف کر دیا۔ اور اس نے تیزی سے سڑک کی طرف چھلانگ لگا دی۔ زاہد جیپ کے ساتھ نشیب میں گرتا چلا گیا۔!

٭ ٭ ٭

کیپٹن سیما کو جب ہوش آیا تو اس نے بستر پہ پڑے پڑے ہی کروٹیں تبدیل کر کے بڑی احتیاط سے دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک بستر پہ ٹائیگر اقبال سنگھ اور جاوید کے علاوہ کمرے میں کوئی چوتھا موجود نہیں تھا۔

کمرہ بند تھا۔ ایک کھڑکی سے دھوپ آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن اس کا جسم شدت سے درد کر رہا تھا۔ بستر سے اتر کر وہ بے پیروں دروازے تک گئی۔ اسے چیک کیا۔ وہ باہر سے بند تھا۔

واپس آ کر اس نے جاوید کو جھنجوڑا۔ کچھ دیر بعد جاوید کی بھی آنکھ کھل گئی۔ پھر سیما نے اقبال سنگھ کو بھی جگایا۔

"دوپہر کے دو بج رہے ہیں" وہ گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولی

"مجھے سوچنے دو کہ ہمارے ساتھ کون سا واقعہ پیش آیا تھا" جاوید سر جھٹکتے ہوئے بولا۔

"تم دونوں بے ہوش ہو گئے تھے۔ ماسٹر نے تمہیں بے ہوش کیا تھا اور میں نے تمہیں وین کار میں ڈال دیا تھا"

"اوہ" جاوید کا لہجہ تشویش ناک تھا "اب مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ پھر اب انا اور نیا دو پہلوان کن راستوں سے ہو کر ہمیں یہاں لایا گیا ہے اور ہم اتنی لمبی نیند کیسے لیتے رہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا — مجھے بھی اس نے تم دونوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جانے پر مجبور کیا تھا۔ گاڑی چلنے ہی والی تھی کہ ایک شخص نے ماسٹر پر اچانک دھاوا بول دیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتے رہے۔ گاڑی چل پڑی۔ میں یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ وین کے اس پچھلے تاریک حصے میں ایک شخص اور بھی تھا۔ جب میرے سر پر اچانک ایک زوردار حملہ ہوا تو پتہ چلا لیکن میں بھی بے ہوشی کا شکار ہو گیا۔ اور اب ہوش میں آیا ہوں"

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

"یہ پہلوان تم تو رومی کے خاص آدمی تھے۔ جاوید سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ تینوں ایک ہی پلنگ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حالات کی نزاکت اور ان دیکھے خطروں کا احساس انہیں تھا۔ "تم تو یہ جانتے ہوگے کہ یہ کونسی جگہ ہوگی۔ آخر تم اس سے کہیں نہ کہیں تو ملاقات کرتے ہی ہوگے۔"

"یہی تو رونا ہے۔ وہ خود مجھ سے ملتا تھا۔"

جاوید اٹھا اس نے کھڑکی کے قریب پہنچکر دیکھا۔ باہر ایک چھوٹا سا صحن دکھائی دیا۔ اور اس کے بعد پھر ایک کمرہ۔ وہ لوٹ آیا۔

"ایسا لگتا ہے کہ یہ مکان خالی ہے۔ ٹریفک کا شور وغل بھی سنائی نہیں دے رہا۔ اس لئے میں یہ فیصلہ کرسکتا ہوں کہ یہ خالی مکان کسی ویرانے میں ہے۔"

"ویرانے میں ہو یا آبادی میں" سیما نے کہا "ایک تو ہم قیدی ہیں اور دوسرے بھوک کا غلبہ ہے، کچھ کرو۔" پھر اس نے ٹائیگر اقبال سنگھ کو مخاطب کیا۔ "کھڑکی میں لگی ہوئی آہنی سلاخوں سے زور آزمائی کرسکتے ہو۔؟"

"ابھی تک انسانوں سے زور آزمائی کرتا رہا ہوں۔ یہ بھی کرکے دیکھ لیتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر کھڑکی تک پہنچ گیا۔ کھڑکی کی آہنی سلاخیں چھ چھ انچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے دو سلاخوں کو پکڑ کر زور آزمائی شروع کردی۔ سیما قریب رہ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہی جب کہ جاوید اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا سوچ میں گم رہا۔

اقبال سنگھ نے سلاخوں کے درمیانی فاصلے کو چھ انچ کی جگہ نو ۹ انچ میں تبدیل کردیا۔ تو سیما چہک کر بولی۔

"شاباش تم واقعی ٹائیگر ہو۔"

اسی وقت سلاخوں کے باہر سے اچانک ایک زوردار گھونسہ اقبال سنگھ کے چہرے پر پڑا۔ اس غیر متوقع حملے پر اقبال سنگھ کا اچھل پڑنا یقینی تھا

"یہ ٹائیگر کمزور ہے لیکن میرے سامنے نہیں۔"

وہ رومی ہی تھا۔ اس کے ہونٹوں پر شرارت آمیز خطرناک مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔

چند لمحات کے بعد دروازہ کھلا۔ وہ دو آدمیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر ان تینوں کو گھورنے لگا۔

تم نے یہاں سے نکل بھاگنے کا حوصلہ کیسے کیا؟ وہ اقبال سنگھ کی طرف بڑھنے لگا۔ اقبال سنگھ کی رونق فنا ہونے لگی۔ وہ اس سے بہت زیادہ خائف تھا۔

"یہ حوصلہ میں نے دلایا تھا۔" جاوید جوں کا توں بستر پر بیٹھا ہوا رومی کو گھور رہا تھا اسلئے کہ ہم تینوں کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔"

رومی نے ایک زبردست قہقہہ لگایا۔

کیپٹن جاوید تمہارے پیٹ میں تو صرف چوہے دوڑ رہے تھے لیکن میں نے تمہارے باس کرنل زاہد کو زمین سے آسمان کی طرف دوڑ لگوادی ہے۔"

جاوید اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

رومی نے انہیں تفصیل بتائی۔

"اس طرح میں نے کرنل زاہد کا قصہ ختم کردیا۔ اب تم بتاؤ ٹائیگر کہ تمہیں کیسے ختم کروں کیونکہ وہ تینوں نگیٹو فلمیں مجھے وہاں نہیں مل سکے۔"

"دیکھو ماسٹر، فلمیں تم خود چرانے گئے ہو۔ نیت تمہاری خراب ہے، مجھے میرا حصہ نہیں دینا چاہتے تو مت دو لیکن آزاد تو کردو۔"

رومی چیتے کی چال اچھلا۔ اسکی چھلانگ انتہائی حیرت انگیز تھی ٹائیگر کے جبڑے پر اس زور کی ٹھوکر ماری کہ جبڑا کریک ہوگیا۔ وہ چیخ کر گر پڑا۔ اور تڑپنے لگا۔ رومی نے بھی پینترا بدلا۔

"ٹھہرو۔" جاوید جو اب تک گم سم کھڑا ہوا تھا چیخ کر بولا "وہ فلمیں کرنل زاہد نے چرائی ہیں۔"

"میں کیسے یقین کرلوں۔"

"ان کی تعداد تین ہے۔ وہ مسہری کے تین پایوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کا تعلق اقبال سنگھ اور انجومہرہ سے ہے۔ زاہد صاحب جانتے تھے کہ انہیں لینے تم آؤگے۔ اس لئے میں وہاں موجود رہا تھا۔"

"تم لوگوں کو اقبال سنگھ کا پتہ کیسے چلا۔؟ کیا انجو نے بتایا تھا۔"

نہیں ہم لوگ اس سے ملے بھی نہیں۔ کیفے کاسینیو میں معلوم ہوا کہ انجو ٹائیگر اقبال سنگھ کے ساتھ کئی مرتبہ دیکھی گئی تھی۔ جب کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک مرتبہ کے علاوہ دوسری مرتبہ دکھائی دینے کی عادی نہیں تھی۔ زاہد صاحب کے لئے اتنی معلومات کافی تھیں۔"

"اوہ۔" وہ الجھن میں مبتلا ہوکر اپنا سر سہلانے لگا۔ "مجھے ڈر تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے اور وہ ہوگئی۔ لیکن میں تو خود آفتوں کا پلندہ ہوں اس ایک کروڑ کے سونے کی آفت کو بھی بھگت ہی لوں گا۔"

جاوید اور سیما نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا وہ دونوں مل کر ان تینوں پر حملہ کرنے کی سوچ رہے تھے۔ ایک پل کے لئے ان تینوں نے اقبال سنگھ کی طرف دیکھا۔

ادھر جاوید نے رومی پر اور سیما نے قریب کھڑے ہوتے اس کے دونوں ساتھیوں پر چھلانگ لگادی۔

جاوید رومی کو لئے کر گرا اور گرتے ہی اس کے سر کے بال پکڑ کر اس کا سر زور سے فرش پر دے مارا۔

یہ محمود خاور کے خاص نمبر
سرکٹا شیطان میں پڑھیئے
اپنے قریبی بک اسٹال سے خرید لیں
۳۷- اردو بازار کراچی
فون نمبر ۲۱۶۳۶۱
رنگا رنگ کتابیں

Wadi Azeem
Pakistanipoint.com

"مار ڈالو اس دو غلے کو۔" اقبال سنگھ چیخا اور لپک کر وہیں آ پہنچا لیکن جاوید دوسری مرتبہ اس کا سم فرش پر پھینکنے جا ہی رہا تھا کہ رومی نے اپنی دونوں ٹانگیں اٹھا کر پیچھے سے اس کی گردن جکڑ کر زوردار جھٹکا دیا تو جاوید کسی گیند کی طرح اچھل کر دور جا گرا۔

وہ اٹھ رہا تھا کہ اقبال سنگھ نے دونوں ہاتھ ملا کر اس کی پسلیوں پر وار کر دیا۔ لیکن وہ پھلاوے کی طرح اگر اچھل کر نہیں نکل گیا ہوتا تو اس کی پسلیاں یقیناً ٹوٹ گئی ہوتیں۔

ادھر سیما ان دو آدمیوں سے الجھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک کا چہرہ بری طرح نوچ ڈالا تھا اور دوسرے کو جھکائی دے کر دو تین ٹھوکریں رسید کر دی تھیں۔

جاوید اپنی گردن سہلاتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اگر اس نے دانستہ رومی کے بال نہیں چھوڑ دیئے ہوتے اور انہیں پکڑے رکھا تو نتیجے میں اس وقت اس کی گردن ٹوٹ گئی ہوتی۔

"ڈریگن۔" رومی غرّایا "وقت کم ہے اپنا ریوالور نکال لو۔"

سیما نے جس شخص کا چہرہ زخمی کر دیا تھا اس نے ریوالور نکال کر اس کا رُخ سیما کی طرف کر دیا۔

"بند کرو، ورنہ ریوالور سے نکلنے والی زہریلی سوئی پل بھر میں اتنیں موت کا مزہ چکھا دے گی۔"

کمرے میں جاگا ہوا ہنگامہ ایک دم موت کی خاموشی میں تبدیل ہو گیا۔ جاوید، سیما اور اقبال سنگھ دیکھ چکے تھے کہ ان کے ہی دو آدمی ان زہریلی سوئیوں سے فوراً ہلاک ہو گئے تھے۔

"پہلوان کے بچے۔" رومی اقبال سنگھ پر غرّایا "مجھے مار ڈالنے کیلئے کہہ رہا تھا۔ لے تو خود مر۔"

رومی پلک جھپکتے ہی اچھلا اور ایک زوردار لات اس نے اقبال سنگھ کے پیٹ میں دے ماری۔ اقبال سنگھ چیخ کر اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے دبا بیٹھا۔ اس کے گھٹنے مڑتے چلے گئے۔ وہ گر کر تڑپنے لگا۔

"میں نے منع کیا تھا کہ انجو کے ساتھ دوسری مرتبہ مت دکھائی دینا۔ میں خود اسے تیرے کمرے پر بھجوا دوں گا۔ نہ تو انجو کے ساتھ دکھائی دیتا نہ یہ گڑبڑ ہوتی۔"

وہ پلٹا اور جاوید کو گھورتے ہوئے غرّایا۔

"تم دونوں میرے رحم و کرم پر ہو۔ میں تمہیں بھی بڑی خطرناک موت مار سکتا ہوں۔ لیکن مجھے تم دونوں سے ایک کام لینا ہے۔ تمہیں جو حکم ملتا جائے، اس پر عمل کرتے رہنا۔ اگر کوئی سوال پوچھا یا کہیں اپنی زبان کھولی تو کہیں سے بھی کوئی زہریلی سوئی تمہیں پل بھر میں ختم کر دے گی۔ تم دونوں کو میرے ساتھ کہیں چلنا ہوگا۔ اگر کوئی گڑبڑ تمہیں ہوئی تو میں دوغلا ہو کر بھی اپنی بات پر کبھی کبھی قائم رہ جاتا ہوں اس لئے تم دونوں کو کوئی نقصان، پہنچائے بغیر آزاد کر دوں گا۔"

⁂

کرنل زاہد کی آنکھ کھلی اور اسے جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ہسپتال کے بستر پر پڑا پایا۔ ہسپتال کے ایک پرائیویٹ روم میں اسے چار چہرے دکھائی دیئے۔ ایک جنرل کیو، دوسرا پولیس کمشنر، تیسرا ڈاکٹر اور چوتھا چہرہ تھا ایک نرس کا۔

"شکر ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا۔" جنرل کیو کی آواز ان کی اندرونی آواز کو نہیں چھپا سکی۔

"میں بیٹھ سکتا ہوں ڈاکٹر۔؟" زاہد نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ لیکن اپنے دائیں پیر کو زیادہ حرکت نہ دیجئے پنڈلی پر زخم ہے۔"

"اور تو کوئی خاص بات نہیں۔؟"

"نہیں، ہوش آ جانا شرط تھا، اب کوئی خطرہ نہیں۔"

نرس نے سہارا دے کر زاہد کو بٹھا دیا۔

"کیا تمہارا اس سے ٹکراؤ ہوا تھا؟ وہ وہی تھا۔" جنرل کیو نے سوال کیا۔

"ہاں۔ وہ وہی تھا۔ لیکن۔" وہ رک گیا۔

جنرل کیو نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر اس کا اشارہ سمجھ کر نرس کے ہمراہ کمرے سے چلا گیا۔

"کمشنر صاحب سے کچھ بھی چھپانا بے کار ہے کیوں کہ ان کے اسٹاف کا ایک انسپکٹر اور دو کانسٹیبل گردن ٹوٹنے سے فوری طور پر مر گئے۔"

"اوہ، مجھے ان کی موت کا افسوس ہے۔ میں نے اس جیسا پھرتیلا اور خطرناک مجرم شاید ہی دیکھا ہو۔"

پھر کرنل زاہد نے انہیں گذرے ہوئے واقعات اور رومی سے مڈبھیڑ کی تمام تفصیل بتاتے ہوئے آخر میں کہا۔

"اس نے اچانک جیپ کو نشیب میں گرا دیا تھا، اور اس سے پہلے وہ سڑک پر کود گیا تھا۔ لیکن جیپ کے ساتھ گرتے وقت مجھے زندہ رہ جانے کی قطعی امید نہیں تھی۔ جیسے ہی جیپ نشیب میں گری۔ میں نے اندھیرے میں ہی خود کو اچھال کر جیپ کے ساتھ گرنے سے بچانے کے لئے آخری کوشش کی تھی۔ کچھ دور تک گرتے چلے جانے کے بعد ایک درخت کی شاخ میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ لیکن وہ ٹوٹ گئی اور میں نیچے گرا۔ درخت کے تنے کو پکڑنے کی کوشش میں میرا سر ایک پتھر سے بری طرح ٹکرایا اور اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"ہمیں اطلاع فوراً ہی مل گئی تھی۔ کیونکہ جیپ تیس فٹ نیچے گر کر آگ کی لپٹوں میں گھر گئی تھی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور نے بروقت فون کر دیا تھا۔ ادھر اقبال مینشن کے چوراہے پر ہوئے خونی ٹکراؤ کو اپنے مکانوں سے دیکھنے والوں

میں سے بھی کسی ایک نے پولیس کو فون کر دیئے تھے۔ بہر حال اس نشیب میں تم مل گئے تو یہاں تمہیں داخل کر دیا گیا اور اس کے بعد پولیس نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کی تلاش میں بھٹک رہی ہے، لیکن اس کا ابھی تک کہیں کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے۔"

"وہ اپنے ہمراہ کیپٹن جاوید اور کیپٹن سیما کو بھی لے گیا ہے۔ اس کا مقصد انہیں یرغمالی بنا کر رکھنا ہوگا۔" زاہد کا لہجہ فکرمندانہ تھا۔

"اب۔؟" کمشنر پولیس نے سوال کیا۔ "ہم سب کے سامنے ایک ہی سوال ہے کہ اسے کہاں اور کیسے گرفتار کیا جائے۔"

"صرف ایک ہی راستہ ہے۔" زاہد کا جواب تھا۔ "میں بھگوان پرکاش مہرہ سے ملوں اور یہ معلوم کروں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوگا تو یہ طے سمجھئے کہ اس کا ہاتھ لگنا مشکل ہے۔"

"وہ بھگوان پرکاش سے کیا چاہتا تھا۔؟" پولیس کمشنر نے چونک کر پوچھا تو زاہد سمجھ گیا کہ جنرل کیونے اس سے انجو مہرہ کی فلموں اور ایک کروڑ روپے کے سونے کی بات چھپا رکھی ہے۔

"وہ بھگوان پرکاش مہرہ سے۔" ریان انڈسٹریز میں پارٹنرشپ چاہتا ہے تاکہ بیرون ملک بھیجے جانے والے مال کا کاروبار اس کے اپنے ہاتھ میں رہے اور اس مقصد کے تحت وہ انہیں خوفزدہ کر رہا ہے اس کا کہنا ہے کہ اگر انہوں نے اس کا مطالبہ منظور نہ کیا تو وہ "ریان انڈسٹریز" کے پورے کامپلیکس کو بموں سے اڑا دے گا۔"

جنرل کیونے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔ زاہد نے اپنی ذہانت سے بات کو سنبھال لیا تھا کیونکہ فلم اور سونے کی بات کو صیغہ راز میں رکھا جانا تھا ورنہ مہرہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دوغلا انتہائی خطرناک ہے۔" کمشنر پولیس نے کہا۔

"ہاں۔۔" زاہد بولا "میں یہ چاہوں گا کہ اس کامپلیکس کی حفاظت کا فوری اور خفیہ طور پر انتظام کر دیا جائے۔ اس دوران میں بھگوان پرکاش مہرہ سے ملنا چاہوں گا۔"

"لیکن ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر یہ ممکن نہیں کرنل۔۔" جنرل کیونے نرم لہجے میں کہا۔

"آپ ڈاکٹر سے دریافت کر لیں۔"

ڈاکٹر کو کمرے میں بلا لیا گیا۔

"میں ابھی چھ گھنٹے تک آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ابھی ابھی آپ کو ہوش آیا ہے۔ یہ بے ہوشی کا دورہ اگر چھ گھنٹوں کے درمیان نہیں پڑتا اور آپ کے سر میں درد نہیں ہوتا تو جانے کی اجازت ہوگی۔"

"اوہ۔" زاہد نے پریشانی محسوس کی۔

"دوسرے یہ کہ آپ کے دائیں پیر کے ٹخنے اور گھٹنے پر سخت چوٹوں سے گہرے زخم بھی آ گئے ہیں۔ اس لئے آپ زخموں کے بھرنے تک چل پھر نہیں سکتے۔"

زاہد کی آنکھوں میں فکر آمیز پریشانی ابھر آئی۔ دماغی تناؤ بڑھ گیا۔

"کرنل زاہد اب یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آپ مسٹر مہرہ سے ملاقات کر سکیں، لیکن فون پر بات کی جا سکتی ہے۔ آپ کہیں تو میں بات کروں۔۔۔؟" کمشنر پولیس نے پیشکش کی۔

"نہیں جناب شکریہ۔۔ رومی نے وارننگ دے رکھی ہے اگر یہ بات کسی کے علم میں لائی گئی تو وہ کامپلیکس کو تباہ کر دے گا۔ اس لئے فون کرنا یا کسی کا مہرہ سے ملنا تابوت میں آخری کیل ٹھونک دینے کے مترادف ہوگا۔"

وہ سب الجھن میں پڑ گئے۔

"یہ کیس انتہائی نازک مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔" جنرل کیونے سگار سلگاتے ہوئے زاہد کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ "ڈاکٹر تمہیں چلنے پھرنے کے لئے منع کر رہے ہیں۔ تمہارا ایک پیر وقتی طور پر بے کار ہو گیا ہے۔ ہائی اتھارٹیز یہ نہیں چاہتیں کہ بات پھیل جائے۔ کسی دوسرے ایجنٹ کو مسٹر مہرہ سے ملنے اور حالات کی نوعیت کا پتہ لگانے نہیں بھیجا جا سکتا۔ مہرہ خود اسے پسند نہیں کرے گا۔"

"مہرہ کو تو اب یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میں ان سے دوبارہ ملوں۔ وہ انتہائی خوف زدہ ہے۔ اگر ان کے منع کرنے کے بعد بھی ان سے ملاقات کی گئی اور کامپلیکس کو کوئی نقصان پہنچا تو اس کی تمام تر ذمہ داری ہم پر آ جائے گی۔"

"اگر ایسا ہے مسٹر زاہد تو آپ نے پہلے یہ کیوں نہیں کہا کہ میں بھگوان پرکاش مہرہ سے ملنا چاہوں گا۔"

"ہاں بظاہر یہ متضاد باتیں ہیں بات صرف اتنی ہے میں اپنی اصل شکل یا میک اپ سے مختلف صورت میں وہاں پہنچنا چاہتا تھا تاکہ خود مہرہ میری شناخت نہ کر سکے۔ یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں مجھے مہرہ کے علاوہ جاوید اور سیما کی بھی فکر ہے۔ میں ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے تو نہیں بیٹھ سکتا۔"

زاہد نے پھر کہنا شروع کیا۔

"وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے مجھے جہنم رسید کر دیا۔ جاوید اور سیما اس کے قبضے میں ہیں۔ پولیس آفیسر اور دو نوجوانوں کو وہ آسانی سے ختم کر چکا۔ ان حالات میں اس کے خطرناک حوصلوں کا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔ وہ وہی سب کچھ کر ڈالے گا جس کی وارننگ دے چکا ہے یا جو وہ چاہتا ہے۔"

"ایک بات اور کرنل۔۔ اقبال مینشن کے پیچھے دو لاشیں ملی ہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق ان کے جسموں سے دو زہریلی سوئیاں برآمد ہوئی ہیں۔ سوئیاں اتنی زہریلی تھیں کہ جسم میں چبھتے ہی ایک منٹ کے اندر اندر ان کی موت واقع ہو جانے کے امکانات ہیں۔"

اس کا مطلب ہوا کہ وہاں جاوید وغیرہ کا ٹکراؤ ان لوگوں سے

Waqar Azeem
Pakistanipoint.com

ہوا۔ شاید وہ دونوں رومی کے متعلق زبان کھول دیتے اس لئے انہیں ختم کروا دیا گیا۔ کیا ان کی شناخت ہو گئی۔؟"

"نہیں۔"

"کوشش کیجئے۔ شاید ہم ان کی شناخت کے بعد یہ معلوم کر سکیں کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ دیکھے جاتے تھے، کہاں دیکھے جاتے رہے؟ وہ جگہ کونسی ہے۔؟"

"خیال بُرا نہیں۔" پولیس کمشنر اٹھ گئے۔

جب وہ چلے گئے تو زاہد نے جنرل کیو سے آہستہ سے کہا۔

"سر آپ میک اپ باکس مجھے بھجوا دیجئے۔ چھ گھنٹوں کے بعد میں سمیر کے ہی میک اپ میں مہرہ کے یہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن تم سخت زخمی ہو اس کے علاوہ ابھی تم نے کہا تھا کہ سمیر کے علاوہ کسی اور میک اپ میں جانے کے لئے سوچ رہے تھے۔"

"عمارت کے باہر تک کسی تیسرے میک اپ میں اور عمارت کے اندر سمیر کے میک اپ میں تاکہ باہر اگر نگرانی ہو رہی ہو تو کوئی پہچان نہ سکے میرا وہاں پہنچنا انتہائی ضروری ہے۔ میرا ٹرانسمیٹر بھی کہیں گر گیا ہے۔ ایک ٹرانسمیٹر بھی چاہیئے۔"

⁂

سمیر نے جب رینا محل میں قدم رکھا تو سہ پہر کا وقت تھا۔ گرمی شدید تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"مسٹر سیکرٹری۔" اس نے اپنے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس لٹکا رکھا تھا۔ "مجھے کمرے میں پہنچا دیجئے۔"

"رات آپ نے کہاں گذاری۔" سیکرٹری نے اسے اوپر سے نیچے تک بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"ہوٹل میں۔"

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اسے لئے ہوئے محل کے اس حصے میں آ گیا جہاں اسے ٹھہرایا جانا تھا۔ یہ کمرہ کل ہی مخصوص کر دیا گیا تھا۔

"مسٹر مہرہ سے اس وقت ملاقات ہو سکے گی۔؟" جاتے ہوئے سیکرٹری نے اس سے سوال کیا اور ایک سگریٹ سلگا لی۔

"جی نہیں، وہ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔ شام تک سو کر اٹھیں گے۔" اتنا کہہ کر پرسنل سیکرٹری باہر چلا گیا۔

وہ کمرے میں ایک آرام کرسی میں دھنس گیا۔ اور سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتا رہا۔

سگریٹ ختم کرنے کے بعد اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کوری ڈور میں جھانکا۔ کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ اس نے واپس اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور بھگوان پرکاش مہرہ کا برابر والا کمرہ کراس کر کے اس کے برابر والے کمرے کے سامنے رک گیا اور کمرے کی کال بیل کا پش آہستہ سے دبایا۔

کمرے کے اندر جل ترنگ بج اٹھنے جیسی ہلکی سی آواز سنائی دی ـــ وہ بے چینی سے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

دروازہ کھلا تو اس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ مہرہ کی نوخیز بیوی رینا نیٹ کا ہلکا پھلکا اور باریک سلیپنگ گاؤن پہنے ہوئے دروازے پر کھڑی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر بری طرح چونک پڑی۔

⁂

"میں تمہیں بھی جل دے کر کام میں لے آنا چاہتا ہوں" وہ پھر بولا "لیکن میں پہلے اپنی بات پوری کر لوں۔" رینا اس کی صورت دیکھ دیکھ کر ادھ مری ہوئی جا رہی تھی۔

"مہرہ کی جگہ میں نے تم سے ملنا اس لئے پسند کیا کہ میرا وعدہ یہ تھا کہ ایک کروڑ کے سونے کے عوض وہ فلمیں لوٹا دوں گا لیکن نیگیٹیوز نہ ہونے کی وجہ سے میں بھلا کس منہ سے تمہارے شوہر سے ملتا۔ اس لئے میں نے پروگرام تبدیل کر کے تم سے ملنا پسند کیا۔ اب تم ان تینوں پرنٹس کو رکھ لو۔ میرے جانے کے بعد مہرہ کو ملاقات کی تفصیل بتا کر یہ فلمیں دے دینا کہ ان کی دوسری پرنٹس کہیں نہیں ہے۔ اس کی بدنامی نہیں ہو گی۔ کیا سمجھیں؟"

"کہہ دوں گی" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"میری اس حرکت سے فائدہ یہ ہو گا کہ تمہارا شوہر مہرہ تم سے اور بھی دب جائے گا کہ تم اس کی لڑکی کی بدچلنی سے واقف ہو ٹھیک ہے ناں؟ بولتی رہو۔ مجھے گونگی، بہری لڑکیاں پسند نہیں۔"

"ہاں ـــ میں فائدے میں رہوں گی۔ انجو ویسے بھی مجھ سے جلتی ہے اور مہرہ صاحب کو میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے ـــ"

"اب تم باپ بیٹی دونوں کو انگلیوں پر نچا سکتی ہو ـــ؟"

"بالکل نچا سکتی ہوں۔" وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولی۔

"خیر ـــ انہیں بعد میں نچانا۔ تھوڑی دیر کے لئے تم میرے اشاروں پر ناچنا شروع کر دو۔"

وہ پھر خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم جیسی خوبصورت گڑیا کو بے لباس دیکھنا چاہتا ہوں ذرا جلدی کرو۔"

"نن ـــ نہیں۔"

رومی نے بندروں کی طرح دانت نکالے۔ اس کے چہرے پر وحشت اور آنکھوں میں سفاکی ابھر آئی

"میں تمہیں دیکھ کر اپنے ذوقِ جمیل کی تسکین لینا

Waqar Azeem Pakistanipoint.com

چاہتا ہوں۔ اگر تم تیار نہیں تو مجھے تمہاری موت کا افسوس ہوگا۔ ٹھہرو میں تمہیں نمونہ دکھاتا ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کر میز پر رکھے ہوئے سوٹ کیس میں ہاتھ ڈالا اور جالی کا بالشت بھر کا ڈبہ نکالا۔ وہ اسے لیے ہوئے رینا کے قریب آگیا۔ رینا نے دیکھا اس جالی دار ڈبے میں ایک سفید چوہا تھا۔

"یہ تمہاری طرح ایک دم سفید اور خوبصورت ہے۔ لیکن تم میری بات نہ مان کر اس چوہے جیسی موت مرنا پسند کرو گی۔"

اس نے جیب سے ریوالور نکالا اور چوہے دان سے چوہے کو آزاد کر دیا۔ جیسے ہی وہ اچھل کر باہر نکلا۔ روحی نے اس کا نشانہ لے کر ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ کوئی آواز نہیں ہوئی لیکن چوہا ایک فٹ اونچا اچھل کر واپس گرا اور چند لمحات تک تڑپنے کے بعد مر گیا۔

"اس ریوالور میں زہریلی سوئیاں ہیں۔ گولیوں کی جگہ سوئیاں جان لیتی ہیں۔ بولو کیا کہتی ہو۔" اس نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر دیا۔

"تم مجھے صرف دیکھو گے۔ چھوؤ گے تو نہیں۔"

وہ اٹھا اور کھلے ہوئے سوٹ کیس کے کھڑے ہوئے ڈھکن کو درست کرتے ہوئے بولا۔

"میں تبت میں برسوں بھٹکتا رہا ہوں۔ ان علاقوں میں جہاں نہ آدم نہ آدم زاد۔ وہاں مجھے عورت کی یاد بہت آتی رہی۔ واپسی پر ایک عورت کو محبت سے سینے سے لگا لیا تھا۔ میں کچھ خیال نہیں رہا۔ جب وہ چیخی تو معلوم ہوا کہ اس کی پسلیاں ٹوٹ کر اندر گھس گئی تھیں۔ اگر میں نے تمہیں چھوا تو پھر وہی غلطی ہو سکتی ہے۔ میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتا ہوں اس لیے تمہارے پاس بیٹھے جاتا ہوں۔"

"وعدہ کرتے ہو۔"

"مجھ جیسے دو غلوں کا وعدہ بھی کوئی وعدہ ہوتا ہے۔ ہاں بات کا دھنی ہوں کہہ دیا کہ گڑبڑ نہیں کروں گا تو نہیں کروں گا"

اس نے گاؤن اتار دیا۔ وہ ایک دم بے لباس تھی۔

روحی اسے سے دیکھتا رہا۔

وہ تھر تھر کانپنے لگی۔

"ڈرو نہیں ــ میں بہت اچھا انسان ہوں۔ ادھر سامنے سوٹ کیس کے کھڑے ہوئے ڈھکن کی طرف دیکھو۔"

خوف زدہ رینا نے ادھر دیکھا۔

"وہاں تمہیں ڈھکن میں ایک چھوٹا چوکور کالی کالی سی چیز دکھائی دے رہی ہے؟"

"ہاں" رینا کی سانسیں سینے میں سما نہیں پا رہی تھیں۔

"وہ ایک نہایت طاقتور اسپائی کیمرہ ہے۔ اس وقت اپنا کام کر رہا ہے۔"

"کک ــ کیا ــ"

"میں نے کوئی ایسی حرکت تو کی نہیں کہ تمہارا دم نکلنے لگا میں نے اس لیے تمہاری تصویریں لی ہیں۔ وہ سٹ پٹا جائیگا۔"

"نہیں یہ بات میں اسے نہیں بتا سکتی۔ تم کیمرہ بند کر کے فلم مجھے دے دو۔"

"بکو مت۔ چاہو تو اس بات کا ذکر مت کرنا۔ میں آج رات کو یہ شہر اور یہ ملک چھوڑ کر نکل جانا چاہتا ہوں لیکن مجھے خطرہ لاحق ہے کیوں کہ میں ایک کروڑ کا سونا ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ اس لیے یہ فلم لے رہا ہوں تاکہ تم اپنے شوہر کو مجبور کر سکو کہ وہ میری بات مان لے۔"

"کون سی بات؟"

"وہ تمہیں اپنے ہمراہ لیکر رات نو بجے ہوائی اڈے پر پہنچے وہاں میرا آدمی تم دونوں کو ہوائی ٹکٹ دے گا۔ یہ بتا دے گا کہ تمہیں کس فلائٹ سے روانہ ہونا ہے۔ میں بھی رہوں گا۔ میرے ساتھ کیپٹن جاوید اور سیما بھی ہوگی۔ میں یہاں سے محفوظ رہ کر نکل جانا چاہتا ہوں ــ"

"لیکن ہم دونوں کو کیوں لے جانا چاہتے ہو۔؟"

"تمہارا شوہر اس ملک کا وی آئی پی مانا جاتا ہے۔ ہوائی اڈے کا اسٹاف، کسٹم آفیسر، سیکورٹی آفیسر، پائلٹ اور ایر ہوسٹس بھلا کون ایسا ہے جو اس کے سامنے جھک کر سلام نہ کرتا ہو۔ یہی حال غیر ملکی ایرپورٹ کا ہے جہاں وہ جاتا ہے اس کا نہایت گرمجوشی سے استقبال کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان سب کو خوش رکھتا ہے۔ خوش رکھنے کے اس کے پاس بڑے زوردار طریقے ہیں۔ اس لیے میں اسے اور تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے اسٹاف کی حیثیت سے اس کے ساتھ سفر کروں گا۔ جاوید اور سیما بھی۔ ہم پانچوں کے پاس سونا ہوگا۔ باون ساڑھے باون کلو سونا ــ پانچ بریف کیسوں میں ــ سمجھیں ــ مہرہ کی وجہ سے کوئی ہمیں چیک نہیں کر سکے گا۔"

"اوہ ــ تم واقعی دنیا کے خطرناک ترین انسان ہو۔"

"اچھا اب تم اپنا سلیپنگ گاؤن پہن لو۔"

رینا اتنی خوف زدہ تھی کہ اس درمیان وہ اپنی بے لباسی کو فراموش کر بیٹھی تھی۔

"اور سنو ــ اگر وہ تمہارا شوہر اور تم دونوں ٹھیک وقت

پر نہیں پہنچے تو تمہاری فلم کی نمائش کی جائے گی۔ ریان اینڈ ریان کامپلیکس بموں سے اُڑا دیا جائے گا۔"

"میں اسے تیار کر لوں گی۔ فلم کو درمیان میں مت لاؤ۔"

"تمہاری بات سر آنکھوں پر ۔ تم سے اگلی ملاقات ہونے تک میں تمہاری اس فلم سے دل بہلاتا رہوں گا۔ آؤ میرے ساتھ ۔"

وہ اسے لیے ہوئے مہرہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ رینا کا دل اس زور سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ سینہ چیر کر باہر نکل آئے گا۔

وہ مہرہ کے قریب سے ہو کر گزرا۔ اس کے سکون و اطمینان میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔

"اچھا پھر سہی ۔ سچ بات تو یہ ہے کہ خوف زدہ لڑکیاں مزیدار نہیں لگتیں ۔"

اس نے دس مرتبہ آئینے پر انگلیوں کی پشت سے ہلکی ہلکی دھمک پیدا کی۔ رینا حیرت زدہ ہو کر دیکھتی رہی ۔ ٹب سرکتا چلا گیا اور پھر خلا پیدا ہو گیا ۔ وہاں چار بریف کیس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں کھول کر دیکھا۔

"باون کلو سونا بہت ہوتا ہے۔ اُسے اُٹھا لینا معمولی کام نہیں تھا۔ ایک بریف کیس تم اٹھا لو ۔ دو میں ۔ لیکن خبردار اگر بریف کیس ہاتھ سے چھوٹا تو تمہارا رشتہ دنیا سے ٹوٹنے میں دیر نہیں لگے گی۔"

باتھ ٹب اسی حالت میں لا کر وہ باہر نکل آیا۔

جب رینا اپنے کمرے میں آ گئی تب اس کی جان میں جان آئی۔

"اپنے دو ملازموں کو بلواؤ۔ ان سے کہو کہ صاحب کو نیچے کھڑی کار تک چھوڑ آئیں۔ یہ تمام باتیں کسی اور کو معلوم نہ ہوں اگر ذرا بھی گڑبڑ ہوئی تو دولت اور عزت کے ساتھ جان بھی جاتی رہے گی۔"

رینا کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"تم اپنے اور اپنے شوہر کے دو دو جوڑے بھی دے دو بریف کیس میں نیچے اوپر رکھنے ہوں گے ۔ ہاں باہر کہیں جانے کا ذکر بھی مت کرنا۔ اپنے ملازموں سے بھی نہیں۔ یہاں سے اپنی کار میں جانا۔ خود ہی اسے کہیں کھڑی کر کے ٹیکسی پکڑ لینا۔"

* * *

رات دس بجے کرنل زاہد سمیر کے میک اپ میں رینا محل پہنچا۔ ٹیکسی سے اترنے سے پہلے اس نے ناک میں پھنسے ہوئے دونوں اسپرنگ نکال لیے جن کی وجہ سے اس کا چہرہ کافی بدشکل ہو گیا تھا۔ اس نے احتیاطاً ایسا کیا تھا کہ اگر محل کے آس پاس کہیں نگرانی ہو رہی ہو تو وہ پھیلی ہوئی ناک کی وجہ سے پہچان میں نہ آسکے۔

گارڈز نے اسے حیرت سے دیکھا اور فون اٹھا کر سیکرٹری کو اطلاع دی۔ سیکرٹری ملاقاتی کمرے میں آدھمکا۔ اس نے اپنا چشمہ اوپر نیچے کر کے کئی مرتبہ اسے گھورا۔

"مسٹر مہرہ سے کہو کہ میں ان سے ضروری ملنا چاہتا ہوں"

"وہ یہاں سے آٹھ بجے میڈم کے ساتھ چلے گئے شاید کسی پارٹی یا کلب میں ۔ لیکن مسٹر تم ذرا کھڑے ہونا۔"

"کیوں ؟" زاہد نے اسے گھور کر دیکھا۔

"پلیز ایک منٹ ۔"

زاہد کھڑا ہو گیا۔ اسے کھڑے رہنے اور چلنے میں انتہائی تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اسے ٹھنڈا پسینہ آنے لگا تھا اور زخمی پیر بری طرح کانپ رہا تھا۔

"مسٹر یہ آپ کا قد بار بار کیوں گھٹ بڑھ جاتا ہے۔"

"قد کبھی گھٹتا بڑھتا نہیں ۔"

"دوپہر دو بجے میں کیوں گھٹ گیا تھا۔"

"کیا دوپہر کو میں آیا تھا۔"

"خوب رہی ۔" وہ جھنجھلا کر بولا "لیکن کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے ۔"

"کیسی گڑبڑ، مجھے بتاؤ۔"

اس نے سمیر کی آمد اور واپسی کی بات بتا دی۔

"وہ سوٹ کیس لے کر آیا تھا اور سوٹ کیس لیکر ہی لوٹ گیا تھا۔"

"جی ہاں ۔"

"سوٹ کیس خود اُٹھا کر لایا تھا۔ ذرا یاد کر کے بتاؤ۔"

"اُٹھا کر خود لایا تھا لیکن واپسی پر وہ خود دو بریف کیس اُٹھائے ہوئے تھا اور اس کا ایک سوٹ کیس ملازم ۔ ملازم کا کہنا ہے کہ سوٹ کیس بہت وزنی تھا۔"

"اوہ واقعی گڑبڑ ہے ۔" وہ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "سنو میں سمیر نہیں بلکہ کرنل زاہد ہوں۔" اس نے اپنا کارڈ دکھایا تو سیکرٹری کو پسینہ آگیا۔

"سر آپ ۔ ؟"

"تمہارے مہرہ صاحب خطرے میں ہیں۔ انہیں بچانا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ تعاون کر سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں صاحب ۔"

Waqar Azeem
pakistanipoint.com

"انجو کو بُلا لاؤ۔ اس سے کہنا کہ سمیر صاحب ابھی اور اسی وقت بلا رہے ہیں کسی اور کو خبر نہ ہو۔"

وہ اُلٹے قدموں سے باہر نکل گیا۔

دس منٹ بعد انجو اس کے سامنے آئی۔

"مسٹر سیکرٹری تم باہر میرا انتظار کرو۔"

جب وہ چلا گیا تو زاہد نے انجو سے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا۔ وہ خود بھی پریشان تھی لیکن اب زیادہ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ جب وہ دروازہ بند کر کے لوٹی تو زاہد نے اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ تمہاری نیگیٹو فلمیں۔"

وہ تقریباً اُچھل پڑی اور اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"میں تمہیں ذلت اور بدنامی سے بچانا چاہتا ہوں" زاہد کا لہجہ سخت اور پُروقار تھا "میں کوئی سمیر و میر نہیں۔ یہ میرا کارڈ ہے۔"

وہ کارڈ دیکھ کر اُچھل پڑی۔

"میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب دو گی تو تمہیں بچالوں گا ورنہ زندگی بھر جیل میں سڑتی رہو گی کیونکہ تمہارے ذریعے اُسے اطلاعات پہنچتی رہی ہیں۔ تم آلۂ کار بنی رہی ہو۔"

"میرے پاس وقت کم ہے پوچھیے۔"

"اقبال سنگھ کے ساتھ تمہاری یہ فلمیں کیوں لی گئیں اور یہ کہ کیا تم واقعی رومی کے بستر پر اپنا ہار بھول آئی تھیں یا دے آئی تھیں۔ میں نے تمام حقیقت معلوم کر لی ہے۔ صرف تمہارے مونہہ سے سُننا چاہتا ہوں۔"

وہ دیر تک اسے حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔

"ہاں میں بہت بگڑ چکی ہوں۔ مجھے ہر رات نشے اور دوستی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایک رات اس نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ وہ مجھے بلیک میل کرنے لگا۔ اقبال سنگھ کے پاس بھیجا اور وہاں میری فلمیں لیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا [illegible] اور۔۔۔؟"

"وہ میرے پاپا سے دولت اینٹھنا چاہتا تھا۔ بدلے میں مجھے اپنے ہمراہ غیر ممالک لے جانا چاہتا تھا۔ اقبال سنگھ کو بھی۔ کیونکہ میں اقبال سنگھ کو پسند کر بیٹھی تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اقبال سنگھ سے میری شادی کروا دے گا۔"

"لیکن رومی دولت لے کر بھاگ گیا۔ آج ہی۔"

"نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ چیخ پڑی۔۔۔ "وہ میرے ساتھ غدّاری نہیں کر سکتا۔۔۔ میں اس کے اور اقبال سنگھ کے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ آج رات کسی فلائٹ سے لندن لے جانے والے ہیں۔"

"آج رات کسی فلائٹ سے لندن جانے والے ہیں۔"

زاہد کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس نے اندھیرے میں جو تیر پھینکا تھا وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ وہ لندن روانہ نہ ہوئے ہوں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی اقبال سنگھ کے ساتھ ہو جائے۔ اگر اقبال سنگھ بھی رومی کے ساتھ بھاگ نکلا ہو تو؟"

"وہ بھی مجھے چاہتا ہے۔ وہ میرے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔"

"میری اطلاع کے مطابق وہ بھی بھاگ گیا ہے۔ اگر تمہیں رومی کا ٹھکانہ معلوم ہو تو وہاں اسے تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔"

"آؤ پھر جلدی۔۔۔"

وہ اسے ساتھ لے کر ٹیکسی میں آ بیٹھا اور ٹیکسی چل پڑی راستے میں زاہد نے پوچھا۔

"اسے سونے کے متعلق تم نے بتایا تھا کہ کتنی مالیت کا سونا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ میں نے اور بھی بہت کچھ بتا رکھا ہے۔ آپ کے یہاں قدم رکھنے کے بعد سے میں اس کا فون آنے پر دوسری باتیں بھی بتا دیتی تھی۔۔۔"

⁂ ⁂ ⁂

نصف گھنٹے کے بعد جنرل کیو، پولیس کمشنر اور زاہد ایئرپورٹ کی عمارت میں تھے۔ اس سے قبل زاہد نے ایک پولیس اسٹیشن پر گاڑی رکوا دی اور پولیس کمشنر سے فون پر بات کر کے پولیس فورس انجو کے ساتھ روانہ کر دی تھی۔ خود اس کے پاس نہ تو اتنا وقت تھا اور نہ اس کی جسمانی حالت بھاگ دوڑ کی اجازت دے رہی تھی۔

پندرہ منٹ کے بعد وہاں کی رپورٹ اسے وائرلیس پر مل گئی تھی کہ وہ شہر کے قریب ہی ایک ویران علاقے کی عمارت تھی۔ عمارت شکستہ ہونے کی وجہ سے عرصے سے خالی پڑی ہوئی تھی۔ وہاں اقبال سنگھ بے ہوشی کی حالت میں سسکتا ہوا ملا۔ جاوید اور سیما نہیں ملے۔

اس اطلاع کے بعد زاہد نے ٹرانسمیٹر پر جنرل کیو سے رابطہ قائم کیا۔ کچھ دیر کے بعد پولیس کمشنر اور جنرل کیو وہاں آ گئے زاہد نے ایئرپورٹ چلنے کے لیے کہا۔ راستے میں وہ انہیں تفصیل بتاتا رہا۔

"وہ لوگ ایک کمرے میں تھے۔"

"میرا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ کسی فلائٹ سے روانہ ہو گیا" زاہد ان سے کہہ رہا تھا۔

Nadar Azeem Pakistanipoint.com

"مجھے افسوس ہے کہ جو باتیں مجھے خود معلوم کرنا تھیں۔ وہ آپ کے ذریعے معلوم کرنے پر مجبور ہوں۔"

"مسٹر زاہد۔ ایسا مت سوچو۔" جنرل کیو نے کہا "اس حالت میں بھی تم جو کچھ کر رہے ہو۔ وہ بہت بڑی بات ہے۔ کیا واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہو۔؟"

"مسٹر مہرہ اپنی بیوی کے ساتھ آٹھ بجے گھر سے روانہ ہوئے۔ اس لئے آپ یہ معلوم کروائیے کہ آٹھ بجے کے بعد سے اب تک کہاں کہاں کے لئے ہوائی جہاز روانہ ہو چکے ہیں۔"

جنرل کیو باہر گئے اور دس منٹ کے بعد وہ پانچ آفیسر وں کے ساتھ لوٹ آئے۔

"کل تین بوئنگ طیارے روانہ ہوئے ہیں۔ ایک ساڑھے ٹھ بجے، ایک نو بجے اور ایک ساڑھے دس بجے۔"

"ان فلائٹ سے جانے والوں میں رومی کو تو تلاش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ نام اور چہرہ بدل کر جا سکتا ہے۔ لیکن مسٹر مہرہ نہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا مسٹر مہرہ کو ان پر کاش مہرہ کیا کسی فلائٹ سے گئے ہیں؟"

"جی ہاں۔" سیکورٹی آفیسر نے کہا۔ "میں نے ان سے ملاقات کی تھی۔ ان کی بیوی کے علاوہ ان کے تین ملازم بھی ساتھ تھے۔"

"وہ ... زاہد کا لہجہ فکر آمیز تھا ... ان تین ملازموں میں کوئی لڑکی بھی تھی؟"

"ہاں تھی۔ وہ سب فلائٹ نمبر اے ڈی ۶۸۳ لندن کے لئے روانہ ہوئے ہیں۔"

"براہ کرم آپ لندن فلائٹ کے مسافروں کا ریکارڈ دیکھ کر تصدیق کریں کہ اس میں مسٹر مہرہ تھے یا نہیں۔"

کچھ ہی دیر میں تصدیق ہو گئی۔

"بہت برا ہوا۔ وہ کامیاب ہو کر نکل بھاگا اور ان لوگوں کو بھی لے اڑا۔" جنرل کیو کا چہرہ اتر گیا "یہ ہمارے لئے بڑی شرمناک شکست ہے۔"

"میں اس شکست کو کامیابی میں تبدیل کر سکتا ہوں جناب" تھکن او تکلیف کے باوجود زاہد کی آنکھیں اپنے مخصوص انداز میں چمک رہی تھیں۔

"نہیں مسٹر زاہد" پولیس کمشنر نے کہا "ناممکن کو ممکن نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کی طبیعت خراب ہے اور سر میں بھی چوٹ ہے۔"

اس کے باوجود میرا ذہن ٹھیک ٹھیک کام کر رہا ہے۔ میں اس ناممکن کو ممکن کر کے دکھا سکتا ہوں۔"

"کیسے؟" وہ چونک پڑے۔

"ڈپٹی کنٹرولر کو آرڈر دلوائیے کہ وہ پائلٹ سے رابطہ قائم کرائیں اور پائلٹ سے کہیں کہ جہاز میں ایک ٹائم بم اب سے ٹھیک ڈیڑھ گھنٹہ بعد پھٹ جائے گا۔ اس لئے وہ جہاز کو واپس لے آئے۔"

وہ سب چونک پڑے، اور زاہد کا چہرہ یوں تکنے لگے جیسے وہ زاہد نہ ہو بلکہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہو۔

"ذہانت اسے کہتے ہیں کمشنر صاحب"، جنرل کیو مسکرائے "میں ہائر اتھارٹیز سے ابھی بات کرتا ہوں۔"

وہ باہر چلے گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد لوٹے۔

"پائلٹ سے رابطہ قائم کر لیا گیا ہے، اسے حکم دے دیا گیا۔ اگر ہم کامیاب ہو جاتے ہیں تو یہ اس صدی کا ایک زبردست کارنامہ ہو گا۔"

"ہوائی جہاز جیسے ہی رن وے کو چھوئے ویسے ہی ائرفورس کے جوانوں کو اپنی بہترین کارکردگی کا ثبوت دینا ہو گا۔ اگر مہرہ اس میں ہیں تو جاوید اور سیما کے علاوہ وہ مکار زمانہ بھی یقیناً اس میں ہو گا اور ..." زاہد نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

جنرل کیو اس پر جھک گئے۔

"تم کیا کہنا چاہتے تھے۔؟" انہوں نے دھیرے سے پوچھا۔

"ایک کروڑ کا سونا بھی ان سب کے پاس ہو گا۔ رومی نے سونا لے جانے کے لئے یہ لاجواب راستہ اختیار کیا ہو گا۔ ورنہ وہ ان سب کو ساتھ کیوں لے جاتا۔"

ٹھیک ایک گھنٹہ بعد ... وہ سب اپنے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہوتی ہوئی محسوس کرتے رہے۔ جس رن وے پر جہاز کو اترنا تھا وہاں زبردست تیاریاں کی جا چکی تھیں۔

جیسے ہی جہاز وہاں پہنچا اسے گھیر لیا گیا۔ مسافر گھبرائے ہوئے تھے۔ ہر مسافر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ جیسے وہ موت سے بھاگ رہا ہو کیونکہ پائلٹ نے اعلان کر دیا تھا کہ ایک ایسے مجرم کو گرفتار کر لیا گیا ہے جس کے بیان کے مطابق اس نے جہاز میں ٹائم بم رکھ دیا تھا۔

پھر مہرہ اور اس کی بیوی کے اترتے ہی ایک شخص نے سیڑھیوں پر سے ہی اگلے شخص پر چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگانے والا جاوید تھا۔

"اسے پکڑو، یہ رومی ہے۔" جاوید چلایا۔

وہیں ائرفورس کے جوانوں نے اسے دبوچ لیا۔ ... ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔

زاہد میک اپ میں نہیں تھا۔ جاوید اور سیما نے اسے دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑے۔

"شکر ہے کہ آپ زندہ ہیں۔" سیما کی آواز کانپ رہی تھی۔

"میں تمہاری ذہانت اور مکاری کی داد دیتا ہوں کلا میاں۔" زاہد نے رومی سے کہا جو خود بھی میک اپ میں تھا۔ "لیکن اس کی توقع تو تمہیں بھی نہیں ہو گی۔"

... چوٹ ہو گئی۔ وہ ... لیکن بازی الٹنے میں میرا بھی جواب نہیں کرنل دنیا کی جیلیں ابھی اتنی بند نہیں کہ رومی کی چھلانگ کو روک سکیں۔ یار زندہ تو صحبت باقی۔

Waqar Azeem Pakistanipoint.com